
سلیم گیلانی

عرضِ ناشر

جناب سلیم گیلانی کی تالیف "بلالؓ" پہلی بار 1994ء میں طبع ہوئی تو مجھے اس کے قاری ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کا پیرایہ بیاں اس قدر موثر اور دلنشین تھا کہ میں نے اسے بار بار پڑھا۔

جناب سلیم گیلانی ریڈیو پاکستان کے سابقہ ڈائریکٹر جنرل ہیں اور دنیائے نشریات میں ایک مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں' ابلاغ کے رمز آشنا۔ انہوں نے حضرت بلالؓ کے حوالے سے خیر الاعصار کی بافت اس طرح کی ہے کہ اُن کی یہ تالیف اردو میں سیرت کے ابلاغ میں ایک نئے باب کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

اِس تالیف کی طباعتِ ثانی کے بعد طباعتِ سوم کی سعادت مجھے حاصل ہو رہی ہے، لیکن یہ محض نقش دوم کی طباعت سوم نہیں ہے، اس میں جناب سلیم گیلانی نے بڑے قابلِ قدر اضافے بھی کیے ہیں۔ جو یقیناً آپ پسند فرمائیں گے۔

گل فراز

فہرست

پیش لفظ (طبع اوّل)

"یہ کیا خرید لائے ہو ابوبکر؟"

ابو قُحافہ نے بلالؓ کو دیکھا تو اُن کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کالی سیاہ رنگت، بے تُکا لمبا قد، سارا بدن داغ داغ، زخموں سے چُور، پور پور سے خون رس رہا ہے، نڈھال، نیم جان، زبان بھی توتلی، غلام ہی لینا تھا تو کوئی ڈھنگ کا خریدا ہوتا"۔

اُس وقت ہو تیم کے یہ محترم بزرگ بینائی سے محروم نہیں ہوئے تھے۔ فتحِ مکہ کے وقت جب وہ ایمان لائے تو بالکل نابینا تھے۔ ایمان چیز ہی ایسی ہے۔ اللہ جل سجدہٗ توفیق دے تو بند آنکھوں سے بھی سب کچھ دکھائی دے جائے، نہ دے تو کھُلی آنکھوں سے بھی نظر نہ آئے۔ اپنے والد کی گفتگو سُن کر ابوبکرؓ نے جواب دیا:

"میں نے تو محض چند ٹھیکریاں دی ہیں اِن کے عوض۔ ساری دُنیا کے خزانے مل کر بھی بلالؓ کے ایمان کی قیمت نہیں چکا سکتے"۔

اسی موقع پر آنحضرتؐ نے بلالؓ کی بَرأت کی خبر سنی تو ابوبکرؓ سے فرمایا کہ اس ثواب میں مجھے بھی شریک کر لو۔ ابوبکرؓ نے عرض کی:

"یارسول اللہؐ، میں قیمت ادا کر چکا ہوں"۔

حضرت بلالؓ کی شخصیت اِسلام کے اوّلین دَور سے اب تک مسلمانوں ہی کے لئے نہیں، غیر مسلموں کے لئے بھی کئی وجوہ کی بنا پر پُرکشش رہی ہے۔ دین کی راہ میں اُن کی

عدیم المثال قربانیاں ‘ سابقون الاوّلون میں شمار کا شرف ‘ اسلام کے اوّلین مؤذن کی حیثیت سے اُن کا منفرد مقام، مکّے کے ایک ادنیٰ غلام سے ایک جلیل المرتبت صحابی کے درجے تک پہنچنے میں اُن کی زندگی کا دلچسپ، پُر آشوب اور قابلِ رشک سفر، رسالتمآبؐ اور اُن کے اہلِ بیت سے اُن کا رشتۂ خلوص ووفا، خادمِ نبیؐ کی حیثیت سے اللہ کے رسول کا ہمہ وقت قُرب، پہاڑوں کی سی عظمت اور استقامت رکھنے والے اسلام کے اس بطلِ جلیل کا ذرّۂ خاک جیسا انکسار، دلوں پر نقشِ جاوداں کی طرح ثبت ہیں۔

دریں صورت زیرِ نظر کتاب ‘ سیّدنا بلالؓ کے ساتھ تاریخ کی روشنی میں ایک تصوّراتی انٹرویو ہے جو دمشق میں اُن کی وفات سے چند ماہ قبل ۲۰ ہجری میں کیا گیا۔

آیئے حضرتِ بلالؓ سے ملتے ہیں!

سلیم گیلانی

پیش لفظ (طبع دوم وسوم)

میں ’’بلالؓ‘‘ کے قارئین کا ممنون ہوں جن کی آراء نے میری اس کاوش کو قبولِ عام بخشا اور اسے طباعتِ دوم کے بعد سوم کی منزل تک پہنچایا۔ اُن کی بے ساختہ پذیرائی کو میں اپنی کسی صلاحیت پر نہیں بلکہ محبت اور عقیدت کے اُس سیلِ بیکراں پر محمول کرتا ہوں جو حضرت بلالؓ جیسے یگانۂ روزگار، جلیل القدر صحابی کے لیے ہر مسلمان کے دل میں موجزن ہے۔

زیرِ نظر ایڈیشن میں چند نئے باب شامل کیے گئے ہیں اور اُن کے علاوہ کئی اضافے ہیں جنہیں حضرت بلالؓ پر مزید تحقیق کے بعد شامل کرنا ضروری تھا۔

حرفِ تشکر عزیزم خالد شیرازی کے لئے جنہوں نے اس ایڈیشن کے مسودے کے پروف دیکھے اور چند اہم حوالے فراہم کیے۔

سلیم گیلانی

میں بلالؓ ہوں

میں بلال ہوں! حبشہ کے سیاہ فام غلام رُباح کا سیہ فام بیٹا۔ غلام ابنِ غلام! غلامی میں آنکھ کھولی، غلامی میں پلا بڑھا، غلاموں کی مخصوص سوچ کے ساتھ جوان ہوا، غلاموں کی طرح بار بار بیچا اور خرید ا گیا اور شاید یہی داغ سینے پر لئے، کسی کوڑے کی ضرب پر جان دے کر، اپنے طوقِ غلامی سمیت کسی گوشئہ ارض میں گمنام دفن ہو جاتا، اگر مکےّ کا تاجر اُمیہ ایک دن مجھے قتل کرنے کا فیصلہ نہ کرتا۔

آج میں دمشق میں اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہا ہوں۔ اُمیہ مجھے ماضی کے اُفق پر بہت دُور ایک دھندلے سے دھبےّ کی طرح دکھائی دے رہا ہے۔ ایک وقت تھا کہ یہ دھبہّ کراں تا کراں میری ساری زندگی پر محیط تھا۔ روشنی کی کوئی کرن نہیں تھی جو اُس کی ظلمت کو چیر کر مجھ تک پہنچ سکتی۔ یہ دھبہّ پھیلتا، سمٹتا، گرجتا، برستا مگر اس کا حصار کبھی نہ ٹوٹتا۔ پھیلتا تو دنیا اندھیر ہو جاتی، سمٹتا تو دیو قامت چٹانوں کی طرح اپنی پوری طاقت سے

مجھے کچل کر رکھ دیتا، گرجتا تو کالے بادلوں کی طرح اچانک یوں پھٹ پڑتا کہ جائے پناہ نہ ملتی اور برستا تو اُس کے ہر کوڑے پر کائنات دم توڑنے لگتی۔

غلاموں کی زندگی میں اُتار چڑھاؤ نہیں ہوتے۔ حادثات کی بھرمار نہیں ہوتی۔ زندگی ایک ڈگر پر چلی جاتی ہے۔ صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے اور وقت کا دھارا یونہی بہتا چلا جاتا ہے لیکن غلام کی زندگی میں اگر کوئی سانحہ آجائے تو وہ حتمی ہوتا ہے۔ پھر کسی اور سانحے کی گنجائش نہیں رہتی۔ غلام گرا تو پھر اٹھتا نہیں۔ ٹوٹا تو ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔ غلام کی حیثیت ہی کیا ہے؟ محض ایک کھال جو کوڑوں کے لئے وقف رہتی ہے اور یہ کوڑے کسی بھی وقت، کسی بھی بات پر، کسی بھی جگہ برس سکتے ہیں۔

اُمیہ ایک خود پسند، خود سر انسان تھا۔ من مانیاں کرنے کا حق، اُس کے خیال میں اُسے اپنے حسب نسب اور اپنی دولت و ثروت سے ملا تھا۔ اُس کے لئے میرے بارے میں صرف اتنا جاننا کافی تھا کہ میں بلال ہوں، اُس کا زر خرید غلام اور بس۔ میرے لئے بھی بس اتنا ہی جاننا کافی تھا کہ وہ میرا آقا ہے۔ آقا کس بات سے خوش ہوتا ہے، کس بات پر خفا ہوتا ہے، یہ جاننا صرف آقا کا حق تھا۔ غلام کے لئے کچھ بھی جاننا لازم نہیں ہوتا۔ اُسے کچھ بتانا، سمجھانا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ غلام کو کوئی سوال کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اُس کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے طور پر صورتِ حال کا جائزہ لیتا رہے اور قرائن سے جو نتیجہ چاہے، اخذ کرتا رہے۔ وہ صحیح ہو تو اُس کی قسمت، غلط ہو تو اُس کا مقدّر!

غلام کے لئے اُس کے آقا جیسی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ جب وہ آواز گونجتی ہے تو اُس سے مفر ممکن نہیں ہوتا۔ غلام کا یہ فرض ہے کہ یا تو وہ نظروں کے سامنے ہو یا آواز پر فوراً حاضر ہو جائے۔ تیسری صورت ممکن نہیں کیونکہ اُس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے اور وہ یہ کہ غلام بھاگ گیا ہے اور اس جرم کی ایک ہی سزا ہے۔ موت!

جو لوگ اس دنیا میں نہیں رہے اُن کو بُرا کہنا مجھے اچھا نہیں لگتا، البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ اُمیہ نے مجھے مکّے کے بازار سے خرید کر کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا۔ اُسے اپنی رقم کی ایک ایک پائی وصول ہو گئی تھی۔ میں نے اُسے کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

اُمیہ کی بہت سی باتیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ میں انہیں بھولا نہیں ہوں لیکن بُھلا دینا چاہتا ہوں۔ میں بلال، اُمیہ کا زر خرید غلام، آپ کو اُن دنوں کی باتیں سنانا چاہتا ہوں جو شروع سے آخر تک حیرت واستعجاب کے دن تھے اور حیرت بھی ایسی کہ آج تک اُس کے نشے سے سرشار ہوں۔ بائیس سال تک اِس غلام نے اُس فضا میں سانس لیا جس میں اللہ کے آخری نبی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سانسوں کی مہک تھی۔ جو انہوں نے کہا، میں نے سنا۔ جو انہوں نے کیا، میں نے دیکھا۔

کعبے کے شب و روز

موسم گرما کی ایک صبح تھی۔ اُمیہ حسبِ معمول اپنے تاجر ساتھیوں کے ساتھ وقت گزارنے کے لئے گھر سے نکلا۔ تاجروں کی یہ محفل خانۂ کعبہ کے سائے میں لگتی تھی۔ مجھے یہ صحبتیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ تاجروں کے ساتھ اُن کے غلام بھی ہوتے تھے جو کچھ فاصلے پر بیٹھے اپنے اپنے آقاؤں کے اشاروں کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ ایسے موقعوں پر غلام آپس میں ہلکی ہلکی سرگوشیاں بھی کر لیتے تھے۔ اِدھر اُدھر کی جھوٹی سچی خبریں مل جاتی تھیں اور وقت اچھا گزر جاتا تھا۔ سب سے زیادہ لطف اُن محفلوں کا یہ تھا کہ ہم غلام لوگ بھی سائے میں بیٹھتے تھے۔ مکّے میں سایہ ایک نعمت سے کم نہیں اور پھر ہم غلاموں کو تو یوں لگتا تھا جیسے سخت حبس میں سانس لینے کے لئے ٹھنڈی، تازہ ہوا کا جھونکا میسّر آ گیا ہو۔

مکّے میں کچھ نہیں اُگتا۔ نہ پودے، نہ پھول، نہ گھاس، نہ درخت۔ دن بھر سورج کی تمازت سے ارد گرد کی پہاڑیاں تانبے کی طرح تپ اٹھتی ہیں اور رات گئے تک اُن کی تپش

مکّے کی فضا میں آگ برساتی رہتی ہے لیکن نہ جانے اِس شہر کی فضا میں کون سا ایسا جادو تھا۔ کون سی مقناطیسی کشش تھی کہ یہاں کے باسی جب کہیں باہر جاتے، اُن کا کہیں جی نہ لگتا۔ وہ مکّے کے لئے اُداس ہو جاتے اور کاروبار سے فارغ ہوتے ہی مکّے کی راہ لیتے۔ یہاں تک کہ مکّے کے نام پر اُونٹوں کے بھی کان کھڑے ہو جاتے اور وہ بھی اپنی رفتار تیز کر دیتے۔ میں تو محض ایک غلام تھا اور مکّے میں ذلت اور رسوائی کے سوا میں نے دیکھا کیا تھا! جب سے پیدا ہوا تھا لوگوں کے ہاتھوں صعوبتیں اٹھا رہا تھا۔ کوئی بوجھ اٹھواتا تھا، کوئی دائروں میں دوڑ لگواتا تھا، یہ دیکھنے کے لئے کہ اس میں کتنا دم خم ہے یا کتنے میں ٹھیک رہے گا اِس کا سودا، مگر مجھ غلام کو بھی اپنی یہ جائے عقوبت اچھی لگنے لگی تھی۔

آج میرے سامنے پیالے میں دمشق کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی رکھا ہے لیکن کوئی میرے دل سے پوچھے، اس پانی کا زمزم کے تیکھے، نمکیات ملے پانی سے کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ خانۂ کعبہ کے صحن میں زمین سے اُبلتا ہوا زمزم کا پانی مجھ جیسے غلام چلّوؤں سے پیا کرتے تھے۔

ایسا کیوں تھا؟ کیا سحر تھا مکّے کی فضا میں؟ ایک غیر ذی زرع وادی میں سُورج کی حدّت سے تپتا ہوا یہ شہر! نہ کوئی درخت، نہ سبزہ، نہ پرندے، نہ تتلیاں۔ فطرت کی چھوٹی سے چھوٹی توجّہ سے بھی محروم یہ نگری! کیا بات تھی اس میں کہ سب کے دلوں میں گھر کر رکھا تھا! ذہنوں پر کچھ اس طرح قبضہ کر رکھا تھا اس شہر نے کہ ہر دل کی دھڑکن بنا ہوا تھا۔ اس کا صرف ایک جواب تھا۔ نہایت واضح اور مختصر۔ خانۂ کعبہ کی سیاہ مکعب نما عمارت جو ایک آسمانی نگینے کی طرح اس ریگ زار کا زیور بنی ہوئی تھی، اس کے سائے میں سو کھجوروں کے سایوں کا سرور تھا۔ یوں کہیے کہ یہ کُرۂ ارض کا سب سے خوشگوار نخلستان تھا۔ جاہلیت کے دور میں بھی یہ امن کا گہوارہ تھا۔ کسی کو یہاں تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ کوئی اپنے دشمن پر بھی ہاتھ نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ کوئی جھگڑا، کوئی فساد، کوئی تنازعہ، کوئی جنگ خانۂ کعبہ کی حدود میں نہیں لائی جا سکتی تھی۔

خانۂ کعبہ، اللہ کا یہ گھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ صرف ایک اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کے لئے لیکن پھر انسانی ذہنوں میں کچھ ایسا خلفشار پیدا ہوا کہ یہ عظیم عبادت گاہ لکڑی اور پتھروں سے بنائے ہوئے بتوں کا گودام بن گئی۔ ان بتوں کو عرب اپنے خداؤں کا درجہ دیتے تھے، یعنی پہلے تو اُس قادرِ مطلق کا تصوّر گم ہوا، پھر اُس کی جگہ بتوں نے لے لی اور پھر ایک نہیں سینکڑوں خداؤں کا تصوّر اُبھرا، اور پھر وحدانیتِ الٰہی کی یہ قدیم علامت تین سو ساٹھ بتوں کا مسکن بن گئی جو بیچے جاتے تھے، خریدے جاتے تھے اور ہر خرید و فروخت پر منافع کمایا جاتا تھا۔ کوئی دِن کے خُدا تھے، کوئی رات کے۔ کوئی معذوروں کے خدا تھے، کوئی صحت مندوں کے۔ خوش نصیبی کے خدا الگ، سفر کے الگ اور سب کے سب دُنیوی منفعت کے لئے۔ لہٰذا بہبود اور اُخروی بہتری کا کوئی عنصر ان کی عبادت میں شامل نہیں تھا۔ خانۂ کعبہ میں آنے جانے والے قافلوں کے پاس صرف نفع کمانے کا تصوّر تھا جو بازاروں اور منڈیوں میں نظر آتا ہے۔

ہر سال ایک خاص مہینے میں عرب کے قبائل میلوں کی مسافت طے کر کے اپنے اپنے خداؤں کے حضور حاضری کے لئے آتے تھے۔ ایک میلہ سا لگ جاتا تھا۔ شام کے تاجر، یمن کے سمندری تجارت کرنے والے تاجر، فارس کے تاجر اور دور دراز مقامات سے آئے ہوئے غلاموں کی خرید و فروخت کرنے والے تاجر، سبھی یہاں جمع ہوتے تھے۔ اس میلے میں سونا، چاندی، کپڑے، خوشبوئیں بھی فروخت ہوتی تھیں، غلام بھی اور خدا بھی!

"اُسے دیکھو، وہ کہتا ہے کہ وہ خدا سے باتیں کرتا ہے" ابوجہل کی آواز نے ہم غلاموں کو چونکا دیا۔ اُس کا غلام آواز سنتے ہی ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا مگر ابوجہل کا فقرہ جلد ہی قہقہوں میں ڈوب گیا اور اُس کا غلام دوبارہ بیٹھ گیا۔

"پیغمبر صاحب، آپ ہمیں پانی پر چل کر کیوں نہیں دکھاتے"۔

اب کے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ اُمیہ کی آواز تھی۔ میرے بدنصیب آقا کی جو آج جہنم

میں اپنی اس ہرزہ سرائی کا جواب سُن رہا ہے۔

پھر میں نے انہیں دیکھا۔ محمدؐ بن عبداللہ کو، ہمیشہ کی طرح تنہا، نظریں پہاڑوں کی سمت، جہاں لوگ کہتے تھے ایک فرشتے نے اُن سے بات کی تھی۔ وہ ابو جہل کے طنز سے بے نیاز، کعبے کے گرد چلتے چلتے، نظروں سے او جھل ہو گئے۔ اِدھر تاجروں کی محفل میں ہر چہرے پر ہنسی تھی۔ ہر شخص اس مذاق میں شریک تھا۔ صرف ابوسفیان تھا جس کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔ ہم غلاموں کے لئے مقدم تو ہمارے آقا تھے لیکن اپنے آقا کے بعد اگر مکے میں ہم کسی کو قابلِ اعتنا سمجھتے تھے تو وہ ابوسفیان کی شخصیت تھی۔ اُس کی اور ہماری کہانی ایک دوسرے سے ایسے ہی منسلک ہے جیسے شکار اور شکاری کی۔

اچانک وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ محفل میں سنجیدگی لوٹ آئی۔ وہ کہنے لگا:

"ایک خدا کو ماننے والا خدا کا منکر ہے"۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی ابوسفیان نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا کیونکہ سب سے زیادہ تکلیف کفار کو اسی بات کی تھی کہ وہ ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دیتا ہے۔ کفار نے اپنی ضعیف الاعتقادی میں موقع محل کے لحاظ سے کئی خدا بنا رکھے تھے۔ وحدہٗ لاشریک کا تصوّر اُن کے دائرہِ فکر سے باہر تھا۔ ابوسفیان فکر مند تھا۔

"اگر ہم نے اس فتنے کو ختم نہ کیا تو خدا ہم سے ناراض ہو جائیں گے اور اپنی رحمتیں کسی اور شہر پر نچھاور کرنے لگیں گے"۔

ابو جہل جواب تک خاموش تھا، یکایک بول اٹھا:

"ابُو لہب! تم اُس کے چچا ہو۔ یہ تم قریبی رشتہ داروں کی ذمہ داری ہے کہ اُسے راہِ راست پر لاؤ"۔

ابو لہب گھبرا گیا۔ اُس نے اب تک دانستہ طور پر اپنے آپ کو اس ساری گفتگو سے الگ رکھا تھا۔ وہ اس میں شریک نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ابو جہل نے خواہ مخواہ اُسے بیچ میں گھسیٹ لیا۔

"راہِ راست پر لاؤں، کس کو؟ محمدؐ کو؟ وہ کوئی بچہ ہے؟ چالیس سال کا ہے! اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سراسر بدنامی کا باعث ہے۔ میرے لئے، اپنے خاندان کے لئے اپنے نسبِ عالی کے لئے۔ کل اُس نے ایک غلام کو اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا ہے، پاگل پن ہے، پاگل پن! جو کوئی اُس سے کچھ مانگتا ہے، اٹھا کر اُس کے حوالے کر دیتا ہے۔ سراسر دیوانگی ہے۔ جہان بھر کے چوروں اُچکوں، مقروضوں کو کھانے کھلاتا ہے۔ جب دیکھو اُس کے دروازے پر دس بارہ جمع رہتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ہو جو اُس کے گھر سے کوئی بھیڑ، یا بکری یا کچھ اور نہ لے کر جائے، ہم کر کیا سکتے ہیں۔ ابن ہشام میرا بھتیجا پاگل ہو گیا ہے، بالکل پاگل!"

ابو لہب باتیں بھی کرتا جاتا تھا اور لوگوں کے چہرے بھی دیکھتا جاتا تھا۔ اس اُمید پر کہ شاید اُن میں سے کوئی بول پڑے اور اس معمّے کو سلجھانے میں مدد دے جو وہ خود سلجھا نہیں پا رہا تھا اور جو شاید سلجھایا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ پیغمبری کا دعویٰ، کیسی انہونی بات تھی! گھبراہٹ میں اُس نے ابوسفیان کا بازو تھام لیا۔

"ابوسفیان! تم ہی بتاؤ، ایک جوان شخص، مضبوط، توانا، خوبصورت، سر کا ایک بال سفید نہیں، ایک رئیس عورت کا خاوند، خود عالی نسب، وہ مکے میں جو چاہے کر سکتا ہے مگر کرتا کیا ہے۔ اپنے گھر کا آرام دہ بستر چھوڑ کر پہاڑوں کے غاروں میں بیٹھا سردی سے ٹھٹھرتا رہتا ہے، محض اس وہم پر کہ ایک فرشتہ اُس سے بات کرتا ہے۔ یہ فرشتہ اُس کی جان کا روگ بن گیا ہے!"

ابو لہب تھک ہار کے بیٹھ گیا۔ اُس کے دوست بھی کچھ پریشان، کچھ شرمندہ سے لگ رہے تھے۔ خاندان میں پاگل پن کا واقعہ ہر ایک کے لئے تشویش ناک ہوتا ہے، کیونکہ ایسے معاملے میں کوئی کچھ نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی مشورہ دے سکتا ہے، صرف دُعا کی جا سکتی ہے۔

ابو لہب بیٹھا بیٹھا پھر بولنے لگا:

"ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا۔ سب اُس کے دوست تھے، اُس کی عزت کرتے تھے۔ اُس وقت کسی کو اُس پر ہنسنے کی جرات نہیں تھی۔ وہ تمھارے درمیان فیصلے کراتا تھا، تمھارے قضیئے چکاتا تھا۔ لوگ اس کے پاس جاتے تھے اور اُسے عادل و منصف سمجھ کر اپنے اپنے معاملوں میں رہبری حاصل کرتے تھے۔ صرف ایک سال پہلے!"

ابولہب نے اپنے غلام کو اشارہ کیا۔ اُسے جو کہنا تھا وہ کہہ چکا تھا۔ میں نے ابولہب کو کئی بار دیکھا تھا، کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا تھا کہ جنت اُس سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر ہے۔ بس ایک قدم اٹھائے گا اور جنت میں داخل ہو جائے گا لیکن آخری وقت میں اُس نے ہمیشہ غلط فیصلہ کیا۔

ابوجہل کچھ سوچ رہا تھا، لگتا تھا کوئی اہم فیصلہ کر رہا ہے۔

"مجھے یہ فکر نہیں ہے کہ وہ ہمارے خداؤں کے بارے میں کیا الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔ ہمارے خدا اُس سے خود نمٹ لیں گے لیکن وہ انسانوں کو جو پٹی پڑھا رہا ہے، وہ بے حد خطرناک ہے مگر اس کا فیصلہ جلد ہو جائے گا۔ سب سے پہلے ہم اُن غلاموں اور لاوارثوں سے نمٹیں گے جو اُس کے گرد جمع رہتے ہیں"۔

ایک اور ہم زبان

جس وقت وہ عمّار کو لے کر آئے۔ میں غلاموں کے مخصوص انداز میں دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ انہوں نے اُسے دھکا دے کر زمین پر گرا دیا۔ زمین پر گرتے ہی عمّار نے سر اٹھا کر انہیں دیکھنا شروع کر دیا۔ میں نے دل میں کہا اب خیر نہیں! غلام کا کیا کام کہ سر اٹھائے۔ اُس کی تو عافیت ہی سر جھکائے رکھنے میں ہے لیکن عمّار مجھ جیسا غلام نہیں تھا، اُسے غلام بنایا گیا تھا۔ وہ بھی مجھ جیسا ہوتا تو اسے اس رمز سے آشنائی ہوتی۔ وہ تو یوں لگتا تھا جیسے اپنا حق طلب کر رہا ہو، بالکل آزاد لوگوں کی طرح جو اپنے حق کی خاطر مقابلے پر اُتر آتے ہیں۔

"محمدؐ تمہیں کیا سکھاتا ہے"؟ ابوسفیان نے پوچھا

"وہ سکھاتے ہیں کہ اللہ کی نظر میں سب انسان برابر ہیں، بالکل ایسے جیسے کنگھے کے دندانے"۔

میں دیوار سے پشت لگائے ہوئے، عمّار کے یہ الفاظ سُن کر سر سے پاؤں تک لرز گیا۔

میرے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی مگر اُدھر اُمیہ کا چہرہ تپ کر سُرخ ہو گیا تھا۔ غلام اور آقا کی نبضیں ایک سی نہیں ہوتیں!

مجھے آج بھی حیرت ہے کہ عمار کو آخر سوجھی کیا۔ اللہ کے بندے تجھے اتنی بہادری دکھانے کی ضرورت کیا تھی! تُو بڑی آسانی سے کہہ سکتا تھا کہ محمدؐ عبادت کرنا سکھاتے ہیں، سچ بولنا سکھاتے ہیں، ہمسایوں کی خبر گیری کی تلقین کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ یقیناً تجھے چھوڑ دیتے لیکن تُو نے تو ایک فقرے میں وہ ساری کی ساری بنیاد ہلا کر رکھ دی جس پر مکّے کے مردم آزاد، استحصالی معاشرے کی عمارت تعمیر تھی۔ اس پر بھی بس نہیں۔ ایک بار پھر عمار کی آواز آئی:

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں سکھاتے ہیں کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرو"۔

ابوسفیان کو دوسرے آقاؤں کے مقابلے میں نیک سمجھا جاتا تھا۔ ہم غلاموں کے حلقے میں اُس کی شہرت اچھی تھی۔ اُس کے اپنے غلام بھی اُس کو بُرا آقا نہیں سمجھتے تھے۔ جہاں جنبشِ ابرو سے کام چل سکتا ہو وہاں وہ زبان کبھی نہیں ہلاتا تھا لیکن مجھے ابوسفیان کی خاموشی اور نرم رویّے سے خوف آتا تھا۔ عمار شاید اُس کے اسی دھیمے انداز سے دھوکا کھا گیا تھا جو سب کچھ کہتا چلا گیا۔ جب ابوسفیان نے اُس سے اپنے مخصوص لہجے میں سوال کیا تو عمار بدنصیب یہ سمجھا کہ وہ اُس سے برابر کی حیثیت سے بات کر رہا ہے اور واقعی اُس سے صحیح جواب چاہتا ہے۔

"ایک اللہ؟" ابوسفیان کے لہجے میں غصہ کم اور تجسس زیادہ تھا۔ لیکن ہمارے تو تین سو ساٹھ خدا ہیں جو ہماری حفاظت کرتے ہیں، ہماری مرادیں بر لاتے ہیں"۔

کتنی اچھی طرح یاد ہے مجھے وہ دن اور اس واقعے کا ایک ایک لمحہ، اور کیوں یاد نہ ہوتا کہ اُس دن چند ثانیوں بعد میری ساری کائنات بدل گئی تھی۔

"محمدؐ کو احساس نہیں ہے کہ ہم مکّے میں خداؤں کو گھر مہیا کرتے ہیں۔ یہی ہماری

روزی ہے، سب قبیلوں کے اپنے اپنے خدا ہیں جن کی پرستش کے لئے وہ یہاں آتے ہیں۔ خدا ہمارے معبود بھی ہیں اور ہمارا ذریعۂ معاش بھی۔ اور کیا ہم لوگ غریبوں، کمزوروں کی نگہداشت نہیں کرتے؟ ابوسفیان کہتے کہتے رُک گیا، بالکل ڈرامائی انداز میں، جیسے بڑے بڑے مقرر کوئی بات کہہ کر تاثر پیدا کرنے کے لئے تھوڑا سا وقفہ دیتے ہیں۔

"اگر ہم تین سو ساٹھ خداؤں کو چھوڑ کر ایک خدا کو ماننے لگیں جو نظر بھی نہیں آتا اور جو ہر جگہ بتایا جاتا ہے۔ اس باغ میں، طائف میں، مدینے میں، یروشلم میں، چاند پر، تو پھر مکہ کہاں جائے گا؟ جب ہر گھر میں خدا ہو گا تو یہاں کوئی کیا کرنے آئے گا؟

اس منطق پر ہر چہرہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔ بات یہیں ختم ہو جاتی اور کسی پر کوئی عذاب نہ نازل ہوتا مگر شومئی قسمت کہ میرے آقا نے اچانک مجھے اس معاملے میں الجھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اُمیہ اب تک خاموش بیٹھا تھا۔ میری پشت پر کھڑی دیوار کی طرح ساکت! لیکن اگلے ہی لمحے میری پشت پر کوئی دیوار نہیں تھی، کیونکہ میں اپنے آقا کے منہ سے اپنا نام سُن کر دوڑ پڑا تھا۔

اُمیہ اپنے ریشمی ملبوس کے لہراتے ہوئے گھیر میں عمار کے پاس پہنچا:

"تم کہتے ہو کہ ایک غلام کا رتبہ اُس کے آقا کے برابر ہے"۔

وہ تیزی سے چلتا ہوا عمار کے پاس آ کر یکایک رُکا تو اس کی ریشمی عبا اُس کی پشت پر لہرا کر ایک لمحے کے لئے اُس کے گرد لپٹ گئی۔

"یہ سیاہ فام بلال جسے میں نے اپنے پیسے سے خریدا ہے، میرے برابر ہے؟"

یہ کہہ کر وہ رُکا اور بزعمِ خود اپنے سوال کی معقولیت، کا لطف اُٹھانے لگا۔ میں، بلال، اس سارے قضیے سے الگ تھا۔ میرا کسی بات سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ مجھے تو خواہ مخواہ بیچ میں گھسیٹ لیا گیا تھا۔ میں غلام ابنِ غلام! مجھے کیا کہ کون کس کے برابر ہے یا

نہیں ہے۔ میں تو کچھ تھا ہی نہیں۔ نہ کسی کے برابر، نہ بہتر، نہ فروتر۔ میری نظر میں میرا کوئی وجود ہوتا تو میں اپنے آپ کو کسی پیمانے سے ناپتا بھی! میں تو تھا ہی نہیں۔ اُمیہ کے الفاظ میں غصّہ بھی تھا، طنز بھی اور اسی طنزیہ لہجے میں یہ سوال پوچھتے ہوئے وہ اپنا ہاتھ ایک پیالے کی سی شکل میں عمّار کے مُنہ کے پاس لے گیا، بالکل مسخروں کے سے انداز میں۔ صورتِ حال مختلف ہوتی تو شاید مجھے اس پر ہنسی آجاتی۔ اُمیہ کو جواب کا انتظار نہیں تھا۔ اُسے جواب کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ایسی بات کا جواب ہو بھی کیا سکتا تھا لیکن عمّار کی عاقبت نااندیشی کہ وہ اس سوال کا بھی جواب دینے کو تیار ہو گیا:

"محمدؐ کہتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک تمام انسان برابر ہیں، خواہ وہ کسی نسل، کسی رنگ کے ہوں"

محفل پر سناٹا چھا گیا۔ پھر میں نے اپنے آقا کی آواز سنی:

"بلال !"

مجھے کیا خبر تھی کہ اس دفعہ میرا نام اس لئے پکارا جا رہا ہے کہ مجھے ایک زندگی سے دوسری زندگی ملنے والی تھی۔ بس اللہ ہی ہے جو جانتا ہے کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ ایک ثانئے میں، میں تعمیلِ حکم کے لئے حاضر تھا۔

"بلال! اس کو بتاؤ کہ تم میں اور ایک رئیسِ مکہّ میں کیا فرق ہے؟ یہ لو اور مار مار کے اس کا چہرہ مسخ کردو تاکہ اسے سبق مل جائے"۔

یہ کہہ کر اُس نے کوڑا میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ کیسا واضح حکم تھا۔ کتنا مختصر اور جامع۔ میں آج تک ان فقروں کی جامعیت کا احاطہ نہیں کر سکا۔ سوچ میں ظلم کی انتہا مگر لفظ کتنے تھوڑے سے، کیسے گنے چُنے! مقصد میں تشدّد کی لامتناہی گنجائش مگر فقرے کیسے برجستہ، نپے تُلے! عمّار نے زمین پر اوندھے پڑے پڑے سر اٹھا کر اپنا چہرہ مجھے سزا کے لئے پیش کر دیا۔

اگلے لمحے کیا ہوا، یہ میں شاید کبھی بیان نہ کر سکوں۔ آج بھی جب میں اُس لمحے کا تصوّر کرتا ہوں تو میرے کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگتی ہیں اور مجھ پر سکتہ سا طاری ہونے لگتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ شاید وہ لمحہ اپنے وجود کی پوری وسعتوں اور پہنائیوں کے ساتھ میرے ذہن میں محفوظ ہی نہیں ہے۔ اُمیہ کی آنکھیں جو غصّے سے باہر نکلی پڑتی تھیں اور ابوسفیان کا نصف چہرہ، کیونکہ اُس نے نظریں دوسری طرف پھیر لیں تھیں۔ ابوسفیان سزا دینے کا قائل تھا مگر اُس میں براہِ راست شرکت کو وہ اپنے منصب سے گری ہوئی بات سمجھتا تھا لیکن عمّار صاف میری نظروں کے سامنے تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں پاکیزگی تھی، سکون تھا، بے خوفی تھی۔ سر تاپا مجبور مگر پُر عزم! میں نے اس کی آنکھوں میں ایک ایسی قوت دیکھی جو مجھے اپنے غلامی کے بندھن سے بھی زیادہ طاقتور محسوس ہوئی۔ ٹھیک اُس لمحے اُمیہ کا غلام بلال، کسی اور کا غلام ہو گیا۔

میں نے کوڑا ہاتھ سے گرا دیا۔

سب نے بیک وقت ایک آواز کے ساتھ اندر کی طرف سانس کھینچا۔ مُنہ کھلے ہوئے تھے۔ چہرے حیرت زدہ! جو انہوں نے دیکھا تھا، اُن کی سمجھ میں آگیا تھا۔ جو میں نے کیا تھا، مجھے معلوم تھا۔ ایک غلام باغی ہو گیا تھا۔ عمّار نے گھسٹتے گھسٹتے، ہاتھ بڑھا کر کوڑے کو پکڑنے کی کوشش کی اور بالآخر کامیاب ہو گیا۔ کوڑا پکڑ کر اُس نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے دوبارہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ ہولے ہولے کچھ کہہ بھی رہا تھا۔ اُس کی سرگوشی میرے دماغ میں چیخوں کی طرح گونج رہی تھی۔

"بلال! جو یہ کہتے ہیں کرو! بلال! یہ تمہیں مار ڈالیں گے"۔

لیکن اس بار جو میں نے کوڑا نیچے پھینکا تو میرے اُوپر جیسے نور کی پھوار پڑ گئی۔ میں نے دیکھا کہ ابوسفیان نے اُمیہ کو اشارہ کیا۔ میں نے ہند کی ہلکی سی ہنسی سنی اور مڑ کر اس کی طرف

دیکھا۔ میں ہند کو ساری زندگی سے جانتا تھا لیکن اُس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی جرأت مجھے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بس اُس کی کچھ جھلکیاں تھیں میرے ذہن میں، جن کو جوڑ کر میں اُنہیں ہند کی شخصیت سے تعبیر کر لیا کرتا تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ آج میں نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھ لیا ہے۔

اُمیہ کا چہرہ ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ غیر معمولی طور پر چُپ چُپ بھی تھا۔ پھر ایک دم میری طرف دیکھا اور کہنے لگا:

"بلال اگر تمہیں یہ زعم ہے کہ تم انسان ہو اور یہ کہ تمہیں بھی خدا رکھنے کا حق ہے تو کان کھول کر سُن لو، تمہارے خدا وہی ہوں گے جو تمہارے آقا کے خدا ہیں۔ کوئی نیا خدا میرے غلام خانے میں نہیں لایا جا سکتا،،۔ پھر اُمیہ نے باہر نظر دوڑائی اور کہا:

"تمہاری اصلاح کرنی پڑے گی۔ لیکن آج نہیں۔ میں سورج کے نصف النہار پر آنے کا انتظار کروں گا۔ آج وہ ذرا ڈھل گیا ہے"۔

پتہ نہیں کدھر سے اشارہ ہوا لیکن اگلے ہی لمحے مٰیں نے اپنے بازوؤں اور گردن کے گرد رسّیوں کی گرفت محسوس کی اور آناً فاناً انہوں نے مجھے جس طرح چاہا توڑا، مروڑا، جھنجھوڑا اور جکڑ کر رکھ دیا۔ میں غلام تھا۔ کبھی نافرمانی کا تصوّر بھی نہیں کیا تھا لیکن اُس وقت میں ضرورت سے زیادہ فرماں بردار بنا ہوا تھا۔

وہ مجھے جس طرف موڑتے مڑ جاتا، جس طرح بٹھاتے بیٹھ جاتا، جب کہتے کھڑا ہو جاتا، باندھنے لگتے تو میں خود ہاتھ پاؤں آگے بڑھا دیتا۔ اچھی طرح مشکیں کس کے انہوں نے مجھے کمرے سے باہر دھکیلا اور دھکا دے کر غلام خانے کے فرش پر گرا دیا۔ کل کے سورج کے انتظار میں!

غلامی کے داغ

آج میں اپنی زندگی کے ساٹھویں سال میں ہوں۔ اٹھائیس سال غلامی کے، بائیس سال شہنشاہی کے اور دس سال یادوں کے۔ جب میں بنوجمح کی غلامی میں تھا، اُس وقت مجھے لگتا تھا کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنہیں اختیار، شعور اور خوابوں سے نوازا گیا ہے اور دوسرے وہ جنہیں صرف ایک جسم عطا کر کے دنیا میں بھیج دیا گیا ہے۔ میں اپنے آپ کو اِس دوسری جماعت کا فرد سمجھتا تھا۔ میں کیا، میرے جیسے سارے غلام جانتے تھے کہ اُن کی ذات، کائنات کے لئے محض ایک جسم ہے جس کی طاقت کا ذکر ہوتا تھا۔ جس کو بیچا جا سکتا تھا، خریدا جا سکتا تھا، جس پر غصہ اتارا جا سکتا تھا، جس کی کھال کھینچی جا سکتی تھی، جسم کی اچھائی، برائی کے علاوہ ہماری کوئی بات قابلِ ذکر نہیں تھی۔ ہمارے ذہنوں میں بھی سوال اُبھرتے تھے، ہماری روحوں میں بھی تلاطم بپا ہوتے تھے، ہم بھی کبھی کبھار کوئی خواب دیکھ لیتے تھے لیکن ایسے جیسے ہم نے کسی شجرِ ممنوعہ کو ہاتھ لگا لیا ہو، جیسے ہم سے کوئی گناہ سرزد ہو

گیا ہو! ہماری یہ سوچ منشائے الٰہی سے نہیں، معاشرتی جبر سے اُبھری تھی جو ایک اٹل پہاڑ کی طرح ہر وقت ہمارے سامنے رہتا تھا۔ اس سے ٹکرانے کا تصوّر ہی ہمیں پاش پاش کر دینے کے لئے کافی تھا۔

یہ معاشرتی جبر کیا تھا؟ جاہلانہ ثقافت کا ایک شوشہ تھا جو اُس وقت سارے عرب میں پورے عروج پر تھی۔ اولادِ آدم فلاح اور ارتقا کی راہ سے بھٹک گئی تھی۔ زندگی کا کارواں ایک ایسی صورتِ حال کے نرغے میں تھا جو ظلم، تکبّر، شراب اور جوئے کی کشید تھی۔ انسان تمدّن کے معنی بھول کر خواہش پرستی کی اُس ادنیٰ سطح پر آ چکا تھا کہ اُس کی اخلاقی روح سسک رہی تھی۔ وہ درندوں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ہر زیر دست اس درندگی کا شکار تھا اور سب سے زیادہ ہم غلام، جو غلام سازی کے ایک ظالمانہ رواج میں تشدّد کے کولہو میں پیلے جا رہے تھے۔ یہ ایک ایسا آہنی قفس تھا جس میں کسی طرف کوئی روزن نہیں کھلتا تھا، کوئی آواز باہر نہیں جاتی تھی۔ ہمارے آقا بدلتے رہتے تھے مگر ہر تبدیلی کی چکّی ہمیں اور زیادہ تیزی سے پیستی تھی۔ تشدد کی اس خوف ناک فضا سے نبرد آزما ہونا تو در کنار ہم اُس کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند نہیں کر سکتے تھے۔ ہماری روحیں چیختی تھیں مگر پکار کا کہیں سے جواب نہیں آتا تھا۔ کوئی مذہب ہماری دستگیری کے لئے موجود نہیں تھا۔ پُرانے مذاہب تحریفوں اور تاویلوں کے غبار میں گم ہو چکے تھے اور مذہبی قائدین نے اجارہ داریاں قائم کر کے وقت کے حاکموں کی ظالمانہ قوتوں کے ساتھ سودے کر رکھے تھے۔ الہامی مذاہب کی تعلیم سر بہ گریباں تھی۔ انسان کی فکرِ اعلیٰ دم بخود اور بے بس، روشنی کی کسی کرن کا انتظار کر رہی تھی۔ یمن، سبا اور عدن کی قدیم سلطنتوں کے سائے میں بھی تہذیب کی نشو و نما ہوئی تھی مگر اُن سلطنتوں کو اُجڑے مدتیں گزر چکی تھیں۔ قریشِ مکہ نے مشرکانہ اور بت پرستانہ مذہبیت کے ساتھ کعبے کی مجاوری کا کاروبار بھی چمکا رکھا تھا۔ طائف اور مکّہ کے مہاجنوں نے سُود کے جال پھیلائے ہوئے تھے۔

تھے۔ چند پڑھے لکھے لوگ تھے جو پرانے مذاہب کا علم رکھتے تھے مگر انہوں نے بھی فقہی موشگافیوں اور من مانی تاویلوں کی دکانیں کھول رکھی تھیں۔ ایسا گھُپ اندھیرا تھا کہ کسی سمت کسی اُمید افزا اعتقاد، کسی خوش آئند نظریئے کا جگنو نہیں چمکتا تھا۔ آج میں اس دور کو کسی اور نظر سے دیکھ رہا ہوں۔ اُس وقت تو مجھے اس کا بھی ہوش نہیں تھا کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ ایک سمجھوتا سا کر لیا تھا ہم غلاموں نے اپنے شب و روز سے!

انہی دنوں مکّے میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے شہر کی فضا ہی بدل ڈالی تھی۔ ایک طوفان کی آمد آمد تھی۔ طوفان تو شاید ابھی دور تھا مگر اُس کی گھن گرج ہر ایک کو سنائی دے رہی تھی۔ گفتگو کے موضوع بدل گئے تھے۔ سارا شہر سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ مختلف سطحوں پر مختلف ردِ عمل تھے۔ کچھ لوگوں نے اسے اپنی ذات کے لئے خطرہ سمجھا۔ کچھ نے اسے اجتماعی سانحہ گردانا۔ کچھ نے جز وقتی حادثہ سمجھ کر ٹالنے کی کوشش کی۔ کچھ خوش فہموں نے اسے کسی اہمیت کے قابل نہیں سمجھا۔ کچھ اتنے متذبذب تھے کہ نہ اُسے اچھا کہہ سکے نہ بُرا مگر فکر مند سبھی تھے۔ جہاں دو آدمی اکٹھے ہوتے یہی ذکر چھڑ جاتا کہ محمدؐ نے رسالت کا دعویٰ کیا ہے۔ وہ لا الہ الا اللہ کا درس دیتے ہیں۔ انسانی مساوات کی بات کرتے ہیں۔ محمدؐ کو ہم سب جانتے تھے، کوئی کم کوئی زیادہ۔ سارے شہر میں اُن کی نیکی، اُن کی دیانت، اُن کی امانت، اُن کی دردمندی اور اُن کے اخلاق کا شہرہ تھا مگر یہ رسالت، یہ وحی، غارِ حرا میں فرشتے سے بات چیت، معبودِ واحد کا تصوّر، مساوات کا سبق، غریبوں کے حقوق کا ذکر، آخرت و مافیہا کی باتیں۔ کہاں جا کر ٹھہرے گا یہ طوفان۔ جو جتنا زیادہ با اختیار تھا اُتنا ہی زیادہ فکر مند تھا۔ سب کو محسوس ہو رہا تھا کہ اگر یہ بیل منڈھے چڑھ گئی تو اس کے پلّے سے کچھ نہ کچھ جا کر رہے گا۔ دولت کی صورت میں، یا اختیار کی صورت میں۔ ہم غلاموں کے پاس کیا تھا دینے کو جو ہم فکر مند ہوتے۔

میں بلالِ حبشی، دوسرے درجے کا انسان بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا مگر اس بار میری سوچ میں احساسِ گناہ شامل نہیں تھا۔ گھپ اندھیرے میں ایک جوت جاگی تھی۔ یہ اجالا میرے لئے کیا لے کر آئے گا اس روشنی میں جو کچھ نظر آئے گا، میں اس کا متحمل بھی ہو سکوں گا یا نہیں۔ مگر یہ ساری باتیں بعد کی تھیں۔ اُس وقت سب سے مقدم بات یہ تھی کہ تاریکی میں روشنی کی ایک کرن پھوٹی ہے اور مستقبل جو بھی ہو، حال سے بدتر نہیں ہو سکتا۔ اپنی اس سوچ کی مجھے بہت بڑی قیمت چکانا پڑی۔ وہ قیمت جو میرے خیال میں میرے پاس تھی ہی نہیں۔

میں نے محمدؐ کو کئی بار دیکھا تھا لیکن آج تک اُن سے بات نہیں کی تھی۔ عکاظ کے بیس روزہ سالانہ بڑے میلے کے بعد جب قافلے اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے کے لئے مکّہ سے نکلتے ہی اپنے گرد و غبار میں گم ہو جاتے تو مکّہ سکڑ سا جاتا۔ گلیوں میں دوبارہ وہی جانے پہچانے چہرے نظر آنے لگتے۔ یہ سب میرے واقف نہیں تھے لیکن صورت شناس میں سبھی کا تھا۔ بہت سے تو غلام سمجھ کر میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ کچھ پہچانتے بھی تھے لیکن اُن کا مجھ ایسے غلام کے ساتھ راہ و رسم رکھنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا لیکن محمدؐ مختلف تھے۔ وہ جب بھی پاس سے گزرتے تو مجھے محبت کے انداز سے مسکرا کے دیکھتے۔ یہی وہ محمدؐ تھے جو اللہ کی وحدانیت کی باتیں کر رہے تھے۔

محمدؐ مجھے اچھے لگتے تھے۔ اپنی ذات میں اچھے لگتے تھے۔ کسی سود و زیاں کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ تھے تو پہلے درجے کے انسانوں کی صف میں مگر مجھے لگتا تھا کہ اوروں کی طرح وہ مجھے نچلے درجے کا انسان نہیں سمجھتے تھے۔ اُن سے مجھ غلام کا کوئی براہِ راست تعلق نہیں تھا اور ہو بھی کیا سکتا تھا مگر اپنی جماعت کے انسانوں میں وہ واحد شخص تھے جن کی مسکراہٹ کو میں نے اپنے لئے محسوس کیا تھا بلکہ یوں کہئے کہ اُس وقت شاید میری ساری زندگی کی واحد خوشی وہ ایک لطیف سا تعلق تھا جو اُن کے تبسمِ سرِ راہ سے قائم ہو گیا تھا۔ اُن

کے علاوہ مجھے دیکھ کر کبھی کوئی اس شفقت اور التفات سے نہیں مسکرایا تھا۔ وہ مسکراتے تھے تو اُن کی آنکھیں اور چہرہ ہی نہیں اُن کا سارا وجود مسکراتا محسوس ہوتا تھا۔ میرے درجے کے لوگوں کے لئے تو شاید مسکراہٹ بنی ہی نہیں تھی۔

میں نے ہنستی ہوئی صبحیں دیکھی تھیں، رات کے آنچل پر ستاروں کی جھلملاہٹ دیکھی تھی، مسکراتے ہوئے پھول دیکھے تھے مگر ان سب کا تبسّم ہر ایک کے لئے ہوتا ہے۔ محمدؐ کی مسکراہٹ کا ایسا دل میں کھب جانے والا انداز تھا کہ بندہ ہزاروں کے ہجوم میں تنہا ہو جائے۔ اُس میں کسی غیر کی شرکت کا شائبہ بھی نہیں محسوس ہوتا تھا۔ وہ مسکرا کر میری طرف دیکھتے تو لگتا جیسے بادلوں سے چاند نکل آیا ہو، جیسے چلچلاتی دھوپ میں سایہ میسّر آ گیا ہو، جیسے تپتی دوپہر میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا گزر جائے، جیسے بے آب و گیاہ صحرا میں تھوہڑ کی کسی شاخ پر کوئی شاداب پھول نظر آ جائے!

ایک راندۂ خلق سیہ فام غلام پر نظر اٹھانے کی بھی بھلا کوئی اہمیت ہے لیکن جب وہ میری طرف دیکھتے تو اس توجہ سے کہ جیسے اُن کے نزدیک یہ دنیا کا اہم ترین کام تھا۔ یہ مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ ہر چھوٹے بڑے کام کو انتہائی انہماک اور مکمل یکسوئی سے انجام دینا اُن کی عادت تھی۔

اُن کی مسکراہٹ ایک سچّے انسان کی مسکراہٹ تھی اور میرے لئے یہی احساس ان کی ہر بات کی صحت کی ضمانت تھا۔ میرا دل کہتا تھا کہ اگر محمدؐ کہتے ہیں کہ اللہ ایک ہے تو یقیناً ایک ہی ہوگا۔ اگر وہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں تو واقعی وہ اللہ کے رسول ہوں گے۔ اگر محمدؐ کہتے ہیں کہ وہ فرشتے سے ہم کلام ہوئے ہیں تو ضرور ہوئے ہوں گے۔ مگر یہ ساری سوچ میرے لاشعور میں تھی۔ شعوری طور پر مجھے اس کا ادراک اُس وقت ہوا جب اُمیہ رات کو غلام خانے میں آیا اور اُس نے مجھ سے براہِ راست سوال کیا:

"سچ سچ بتا تیرا معبود کون ہے؟"

"محمدؐ کا معبود میرا معبود ہے!"

میرا جواب سنتے ہی اس کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی مگر شاید وہ اس جواب کے لئے تیار تھا۔ کہنے لگا:

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تُو ہمارے خداؤں سے انکار کرتا ہے"؟

"محمدؐ الامین ہیں۔ اُنہیں ایک فرشتے نے بتایا ہے کہ اللہ ایک ہے"۔

میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ کل میں عمار کے جن الفاظ پر معترض تھا، وہی الفاظ آج میری اپنی زبان سے نکل رہے ہیں۔ کل میں عمار کی وجہ سے خائف تھا مگر آج میں اپنے لفظوں پر بھی خائف نہیں تھا۔ یہ نہیں تھا کہ میں اس دیدہ دلیری کی سزا سے بے خبر تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے میرے اندر طاقت کا ایک سیلاب اُمڈ آیا ہے جس کے سامنے اُمیہ اور اُس جیسے کئی، خس و خاشاک سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ اُمیہ مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی دھمکیاں دیتا ہوا غلام خانے سے باہر چلا گیا۔ مجھے اُس وقت وہ ایک بے بس بچہ لگ رہا تھا جس کا کوئی کھلونا ٹوٹ گیا ہو۔

اس واقعے کے بعد اب روز کا یہ معمول ہو گیا کہ مجھے دوپہر کو غلام خانے سے باہر نکالا جاتا اور دھوپ میں جلتی ہوئی ریت پر لٹا کر میرے سینے پر تپتی ہوئی بھاری چٹانیں رکھ دی جاتیں کہ میں ہل بھی نہ سکوں۔ اسی حالت میں اُمیہ مجھ پر کوڑے برساتا اور مجھے مجبور کرتا کہ میں اُس کے خداؤں کو تسلیم کروں۔ میری کمر پر پہلے چھالے پڑے جو ایک دو روز میں زخم بن گئے جن سے خون رستا رہتا تھا۔ مگر اُمیہ نے میرے معمول میں فرق نہ آنے دیا بلکہ ہر روز اس کی شدت میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ ہر روز میرے لئے گزشتہ دن سے زیادہ گرم ریت تلاش کی جاتی، پہلے سے زیادہ وزنی چٹانیں ڈھونڈی جاتیں اور پہلے سے زیادہ کوڑوں کی ضربیں۔

ہر روز میں مرنے کے قریب ہو جاتا مگر اُمیہ کے سوالوں کا جواب میں 'احد' 'احد' کے سوا کچھ نہ کہتا۔ ایک دن اُس نے تنگ آکر مجھے ایک رات اور ایک دن بھوکا رکھا اور پھر مجھے گرم ریت پر لٹا کر مارنا شروع کر دیا مگر میں چٹانوں کے نیچے دبا دبا بھی اُس کے ہر سوال کے جواب میں 'احد'، 'احد' ہی دُہراتا رہا۔

بنوجُمح کے سارے محلّے کو علم تھا کہ بلال کی اصلاح کی جا رہی ہے۔ بعد میں ایک دفعہ عمرو بن العاصؓ نے مجھے بتایا کہ انہوں نے بھی مجھے سزائیں پاتے دیکھا تھا۔ بچہ بچہ میرے نام سے واقف ہو گیا تھا۔ ابوبکرؓ بھی جو بنوجُمح ہی کے محلّے میں رہتے تھے، مجھے روز دیکھتے تھے اور نظریں نیچی کر کے چلے جاتے تھے۔ جب دھوپ اور کوڑوں کی سزا کارگر نہ ہوئی تو اُمیہ نے میرے گلے میں رسّی باندھ کر مجھے بنوجُمح کے لڑکوں کے حوالے کر دیا۔ بچے سارا دن چیختے چلاتے، قہقہے لگاتے مجھے مکّے کی اونچی نیچی پتھریلی سڑکوں پر کھینچتے پھرتے۔ اُن کے قہقہوں میں میری چیخ پکار کسی کو سنائی نہ دیتی۔ بچوں کو ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آ گیا تھا اور وہ اس سے پورا پورا لطف اٹھانا چاہتے تھے۔ وہ رسّی سے میری گردن کو جھٹکا دیتے تو میں گر پڑتا۔ اور پھر وہ سب مل کر مجھے گھسیٹنے لگتے۔ میں اٹھنے کی کوشش کرتا تو ٹھوکریں مارتے۔ کبھی اٹھ کر کھڑا ہو جاتا تو پھر رسّی کے جھٹکے سے مجھے گرا دیتے۔ میں مُنہ کے بل گرتا تو پھر مجھے گھسیٹنا شروع کر دیتے۔ کبھی رسی اس زور سے کھینچتے کہ میرا دم گھٹنے لگتا۔ نوکیلے کنکروں، سنگریزوں اور پتھروں کی رگڑ سے روز میرے بدن پر نئے زخم بنتے۔ پہلے زخم بھرنے بھی نہ پاتے کہ پھر کھُل جاتے۔ میرا سارا جسم لہولہان ہو جاتا۔ دوپہر کے بعد جب سارا مکّہ تپ اُٹھتا تو وہ میرے کپڑے اتروا کر مجھے لوہے کی زرہ پہنا دیتے اور دھوپ میں ڈال دیتے۔ ایک دن انہوں نے مجھے دہکتے کوئلوں پر لٹا کر میرے سینے پر ایک بھاری پتھر رکھ دیا۔ آج بھی میرے جسم پر اُن کوئلوں کے داغ ہیں۔ ایک دن مدینے میں مَیں رسولِ کریمؐ کے گھر کا سودا سلف لے کر آ رہا تھا کہ میری چادر

شانوں سے سرک گئی۔ عبیدہ بن حارثؓ میرے پیچھے آرہے تھے۔ انہوں نے میرے جسم کے داغ دیکھے تو اُن پر رقت طاری ہو گئی۔ مگر کیسی کیسی لَو اٹھی ہے ان داغوں سے، کیسی کیسی شعاعیں پھوٹی ہیں۔

سورج ڈھلتے ہی میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر مجھے دوبارہ غلام خانے کے فرش پر پھینک دیا جاتا۔ میرا سارا جسم زخمی ہو گیا تھا بلکہ پورا بدن ایک زخم بن گیا تھا جس سے ہر وقت خون بہتا رہتا تھا۔ ہجُوم میں میرا تماشا ایک دفعہ حسان بن ثابتؓ نے بھی دیکھا تھا۔ انہوں نے مجھے خود بتایا کہ وہ مکّے میں عمرہ کرنے گئے ہوئے تھے مگر میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ تماشا کب تماشائی کو دیکھتا ہے۔ لیکن ایک ضعیف شخص مجھے یاد ہے اور میں اُسے کبھی نہیں بھولوں گا۔ ورقہ بن نوفل۔ میں روز مرّہ کی طرح گرم چٹانوں تلے دبا اُمیہ کے کوڑے کھا رہا تھا اور وہ مجھے ہر کوڑے پر لات اور عزیٰ کی عبادت پر مجبور کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُدھر سے ورقہ کا گزر ہوا۔ وہ میرے مُنہ سے 'احد'، احد' کی آواز سُن کر رُک گئے اور انہوں نے باآوازِ بلند کہا "بلال وہ واقعی ایک ہے" پھر انہوں نے اُمیہ سے مخاطب ہو کر کہا:

"میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تو نے اسے مار ڈالا تو میں اس کی قبر پر درگاہ تعمیر کروں گا"۔

مگر اُمیہ باز نہ آیا۔ ہر روز دوپہر کو جب بچّے مجھے مار مار کر نڈھال کر دیتے اور ریت پر لٹا کر میرے اوپر چٹانیں رکھ دیتے تو وہ بھی کوڑا گھماتا وہاں پہنچ جاتا اور ہر کوڑے کی ضرب کے بعد مجھ سے پوچھتا کہ میں محمدؐ کے اللہ سے منحرف ہوا ہوں یا نہیں؟ مگر میرا جواب 'احد'، 'احد' کے سوا کچھ اور نہ ہوتا۔ شاید میں کچھ اور کہنا ہی بھول گیا تھا۔ میرا روز مرّہ کا رقصِ بسمل بھی جب اُس کے دل کی مراد بر نہ لا سکا تو ایک دن اُس نے ایک قطعی فیصلہ کر لیا۔ آج کی رات بلال کی آخری رات ہو گی۔ کل کی صبح اُس کی آخری صبح۔ شدید ترین اذیتیں اور پھر موت!

آخری رات، پہلا دن

موت کا قرب کبھی کبھی انسان کے اندر شمعیں روشن کر دیتا ہے۔ میرے اندر بھی اُس رات اللہ نے اپنی رحمت سے ایک جوت جگا دی۔ میں نے اپنے والد اور والدہ کو دیکھا جو ایک کارخانے میں کام کر رہے تھے۔ یہ چمڑا رنگنے کا کارخانہ تھا جس میں چاروں طرف بھاپ اٹھ رہی تھی اور بھاپ نے میرے ماں باپ کو ڈھانپ رکھا تھا۔ جب میں ان کے قریب گیا تو ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ اُن کی اُداس آنکھوں میں میرے لئے بے پناہ محبت اور شفقت جھلک رہی تھی۔ میرے والد نہایت قوی انسان تھے لیکن اُن کی جسمانی قوت کو اس بے دردی سے استعمال کیا گیا تھا کہ وہ جوانی میں بھی بوڑھے نظر آتے تھے۔ میری ماں کھانس رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح کھانسے جا رہی تھی، یہاں تک کہ کھانستے کھانستے اُس نے دم دے دیا۔

میرے والدین حبشہ سے آئے تھے، بحیرۂ احمر پار کر کے۔ مجھے آج تک نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ غلام کیسے بنا لئے گئے۔ انہوں نے مجھے کبھی نہیں بتایا۔ شاید اس لئے کہ ایسی

باتوں کو بُھلا کر ہی وہ غلامی کی صعوبتیں برداشت کرنے کے قابل ہوئے تھے۔ ایک دن میری ماں نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ میں پیدا تو حالتِ غلامی میں ہوا لیکن جب میں اپنی ماں کے شکم میں آیا تھا تو میرے ماں باپ آزاد تھے۔ یہ بات میرے لئے کوئی خاص تسلّی کا باعث نہیں تھی، پھر بھی کبھی کبھی میں اس پر خوش ہو لیا کرتا تھا۔

پھر اس رات میں نے اپنے ماں باپ کی گفتگو سنی۔ وہ سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے مشورہ کر رہے تھے کہ کیوں نہ ہم اس بچے کو مار ڈالیں اور اسے پیدائشی غلامی کی لعنت سے بچالیں۔ میرے آنسو بہہ نکلے۔ اپنے دکھ پر نہیں، اُس کرب پر جو میرے والدین نے یہ فقرے کہتے ہوئے اپنے اندر محسوس کیا ہوگا۔

مجھے وہ دن بھی یاد آیا جب میں جوان ہونے پر بازار میں پہلی بار فروخت کے لئے لایا گیا تھا۔ اب میں لِبن غلام نہیں بذات خود غلام بننے والا تھا۔ پھر اس کے بعد میں کئی بار بکا۔ اونٹوں کے ساتھ، بکریوں کے ساتھ، بھیڑوں کے ساتھ اور بالکل انہی کی طرح۔ آج دمشق میں بیٹھ کر میں اُن باتوں پر ہنس سکتا ہوں مگر سوچتا ہوں مجھ پر کیسے کیسے دور گزرے ہیں۔ گرم ریت اور دہکتے انگاروں پر لٹائے جانے کے دور، مکّے کے گلی کوچوں میں گلے میں رسّی باندھ کر پھرائے جانے کے دور، گرم پتھروں تلے دبائے جانے کے دور، ڈنڈوں سے پٹائی کے دور، ٹھوکروں کے دور، کوڑوں کے دور لیکن اُس رات اُمیہ کے غلام خانے میں جب میری گردن میرے گھٹنوں سے جکڑی ہوئی تھی میرے ذہن میں ہنسی کا تصوّر بھی نہیں تھا۔

پھر اُسی کرب کے عالم میں مَیں نے اپنے گرد پھیلی ہوئی زندگی کے حسن کو محسوس کیا۔ وہ حُسن جو جلد ہی مجھ سے چھننے والا تھا۔ چاند تارے، دن رات، آتے جاتے موسم، دریاؤں، پہاڑوں، میدانوں اور جنگلوں میں جیتی جاگتی، رنگ برنگی مخلوق اور ان سب کا سردار انسان اپنی تمام آرزوؤں، امنگوں، اُداسیوں، خوشیوں، مجبوریوں، کامرانیوں اور قربانیوں کے

ساتھ۔ اُس رات میں نے ایک سُرخ بھورا بھی دیکھا تھا جو تیز دھوپ میں ایک ٹُنڈ نخل پر بیٹھا تھا۔ آج بھی جب کہیں مجھے سُرخ بھورا نظر آجاتا ہے، میرا سارا دن خوشی میں گزر جاتا ہے۔ یہ سُرخ بھورے، روئے ارض پر پھیلی ہوئی مخلوق، قبروں میں لیٹے ہوئے میرے ماں باپ یہ سب کہاں سے آگئے تھے اُس رات، موت نزدیک محسوس ہوتی ہے تو انسان کا ذہن کہاں سے کہاں چھلانگیں لگاتا پھرتا ہے۔

پھر عمار کے واقعے کی تفصیل نظروں کے سامنے پھرنے لگی۔ میں کیسے پھنس گیا اس سارے معاملے میں؟ میرا کیا واسطہ تھا؟ ذہن سے جواب آیا۔

'عمار۔ عمار نے تجھے اس دلدل میں دھکیلا ہے۔

لیکن عمار میرا کیا لگتا تھا؟ کیا رشتہ تھا میرا اُس سے یا اُس کا مجھ سے؟

اگر میں واقعی اُسے کوڑا مار دیتا تو وہ ہرگز مجھے الزام نہ دیتا۔ اُسے پتہ تھا کہ غلام حکم عدولی کر ہی نہیں سکتے۔ بلکہ اُس بے چارے نے تو خود کوڑا میرے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ لیکن پھر بھی میرا ہاتھ اُس پر نہیں اٹھ سکا۔ دراصل اس میں عمار کا قصور نہیں تھا۔ میرے اندر، حبشی غلام بلال کے اندر، کوئی کہہ رہا تھا کہ کچھ بھی ہو آج حکم کی تعمیل نہیں ہوگی۔

غلام خود تو ایسے فیصلے نہیں کر سکتے۔ غلام تو کوئی بھی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ فیصلے بغیر اختیار کے نہیں ہوتے اور غلاموں کے پاس اختیار کہاں! تو پھر کوڑا میرے ہاتھ سے کیسے گر گیا۔ غلام کو تو خود اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے۔ پھر کیسے ہو گئی مجھ سے یہ حکم عدولی۔ میں نہ بہادر تھا، نہ احمق کہ بغاوت پر اُتر آتا۔ پھر کہاں سے آیا مجھ میں یہ حوصلہ۔ اس کا جواب کہیں اور تھا۔ یہ حوصلہ مجھے محمدؐ سے ملا تھا۔

رات بھر میں غلام خانے کے فرش پر کس مپرسی کے عالم میں پڑا کراہتا رہا۔ رسیوں سے جکڑا ہوا۔ رسیاں میرے زخموں میں دھنسی جاتی تھیں اور میری ذہنی کیفیت ایسی

تھی جیسے اندر ہتھوڑے چل رہے ہوں۔ تھوڑا سا خیال یہ بھی آتا تھا کہ اگر صبح میں اُن کی خوشامد کروں، واسطے دوں، منت سماجت کروں، اُن کے قدموں پر سر رکھ دوں تو شاید مجھے زندگی اور موت کے درمیان ایک حدِ فاصل میسّر آجائے۔ کوئی اُمید تو ہوگی جو میں زندہ تھا۔

صبح ہو رہی تھی۔ میں نے گہرے گہرے سانس لے کر نئے دن کی تازہ ہوا کو اپنے اندر جذب کیا مگر اب میرا ذہن پھر اُس ایک اللہ کے تصوّر کی طرف چل پڑا۔ اُن دنوں میں بالکل ان پڑھ تھا۔ میری سوچ میں کوئی ابجد شامل نہیں تھی۔ میں چل تو پڑا ایک انجانی، ان دیکھی راہ پر لیکن محض ایک خانہ بدوش کی حیثیت سے، جسے پیاس تو ضرور لگتی ہے مگر راستے کے کنویں اُس کے اپنے نہیں ہوتے۔ مجھے بھی پیاس تھی، شدید پیاس۔ کنویں میرے نہیں تھے لیکن میں پیاسا تھا اور یہ پیاس مجھے کھینچے لئے جا رہی تھی۔ نامانوس راہوں پر، نہ جانے کس منزل کی طرف!

اُس دن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے میں نے اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر دیا۔ یہی میرا اسلام تھا۔ میرے اندر مٹھاس کی ایک لہر دوڑ گئی، ایسی کہ مجھے اپنے بندھنوں میں بھی چین ملنے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میری عافیت صرف اور صرف اُس ایک اللہ کے قُرب میں ہے، یہ سچائی میرے دماغ میں نہیں میرے دل میں، میری روح کی گہرائیوں میں اتر گئی۔ میں نے عبادت شروع کی تو میرا باطن نور نور ہو گیا۔ میں نے ربِّ جلیل کی حمد و ثنا کی تو میرے اندر انجانی قوتوں کے سوتے اُبل پڑے۔ میں نے اللہ کی رحمتوں کی تلاش کی تو خوف میرے اندر سے نکل گیا۔

اور پھر اللہ کی قدرت سے سورج طلوع ہوا۔

جب وہ مجھے لینے کے لئے آئے تو میں سراپا تشکر تھا۔ اُن بد نصیبوں کو کیا خبر تھی کہ یہاں کیا ہو چکا ہے۔ انہیں شاید توقع تھی بلکہ مناسب بھی یہی تھا کہ میں اُن کے سامنے

گڑگڑاتا، اُن کے پاؤں پکڑتا، زمین پر ماتھا رگڑتا، اُن سے رحم کی بھیک مانگتا لیکن جب ایسا نہ ہوا تو وہ سمجھے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ خوف سے میرا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ میں اپنے خالقِ حقیقی کے حصارِ عاطفت میں ہوں اور اب وہ جو کچھ بھی کریں گے، یا نہیں کریں گے، وہ سب میرے رب ہی کی رضا سے ہوگا۔ انہوں نے مجھے میری جائے عقوبت پر لے جانے کے لئے زمین سے اٹھایا مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ میرا اللہ مجھے پہلے ہی اُن کے ہاتھوں کی پہنچ سے کہیں زیادہ بلندی پر لے جا چکا ہے۔

اجرِ عظیم

انہوں نے مجھے اٹھایا اور بڑی تیزی سے باہر لے گئے۔ ہمیں دیکھ کر گلیوں میں کچھ کھڑکیاں بند ہوئیں۔ لوگ عام طور پر ظالم نہیں ہوتے، بہت کم ہوتے ہیں جو دوسروں پر تشدد ہوتا دیکھ سکتے ہیں۔ ویسے بات سب کی سمجھ میں آگئی تھی۔ سارا مکہ جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ غلاموں کو راہِ راست پر لانے کے معاملے میں اہلِ مکہ کا آپس میں مکمل اتفاق تھا۔ میں نے بغاوت کی تھی، حکم عدولی کی تھی، اپنے آقا کو اُس کے احباب کے سامنے رسوا کیا تھا، اُس کے مذہبی عقائد سے ٹکر لی تھی، اور ایسی بے راہ روی برداشت نہیں کی جا سکتی تھی۔

جہاں تک اُمیہ کا تعلق تھا، اس کے لئے بات بالکل واضح تھی۔ وہ مجھے مجرم سمجھتا تھا۔ خطاکار، قصوروار۔ میں اپنی حرکتوں کی وجہ سے بحیثیت غلام اپنی قیمت گنوا بیٹھا تھا۔ اس لئے وہ مجھے اُس رقم کا دین دار سمجھتا تھا جو اُس نے مجھ پر خرچ کی تھی۔ اب صرف میری کھال اُس کے کام کی تھی۔ وہ اسے کھنچوا سکتا تھا، کتوں کے آگے پھنکوا سکتا تھا، دوسرے غلاموں کی

عبرت کے لئے اُس کی نمائش لگوا سکتا تھا۔ آج میں یہ سب باتیں سوچتا ہوں تو مجھے اُمیہ پر ترس آتا ہے کیونکہ جو دوسروں سے ناانصافی کرتا ہے، وہ در حقیقت اپنے ساتھ ناانصافی کرتا ہے۔

وہ مجھے ایک میدان میں لے گئے جس کے بیچوں بیچ ایک لکڑی کا کھمبا گڑا ہوا تھا۔ اس کھمبے سے انہوں نے مجھے مضبوطی سے جکڑ دیا۔ اُمیہ نے کوڑا سنبھال لیا۔ میں اس تشدد کی روداد بیان نہیں کروں گا۔ درد کی یاد نہیں ہوتی۔ درد جب ہوتا ہے تب ہوتا ہے، اُس کے بعد نہیں، صرف اتنا کہوں گا کہ اللہ سورج سے زیادہ طاقتور ہے اور کوڑے انسان کی روح کو نہیں چھو سکتے۔

مجھے یاد ہے کہ اُس وقت میں زور زور سے اللہ کو پکار رہا تھا۔ ایک ہی طریقے سے جو مجھے آتا تھا اور ایک ہی نام سے جو میں جانتا تھا 'احدؐ، احدؐ'۔ میں بلال جس نے اب تک ہزاروں لاکھوں لوگوں کو نماز کے لئے پکارا ہے، اُس وقت عبادت کے طریقوں سے واقف نہیں تھا لیکن جب میں نے اُس کا نام پکارا تو میرے دل نے گواہی دی کہ اُس نے سن لیا۔ کوڑے پڑتے تھے تو میں چیختا نہیں تھا۔ میں نے اپنی زندگی کی باقی ماندہ سانسیں اللہ کے لئے وقف کر دی تھیں۔ ہر کوڑے پر میری آواز مدھم ہوتی جا رہی تھی مگر میں اُسی کا نام لیتا رہا۔ میں نے اُن سے رحم کی التجا نہیں کی۔ صرف اپنے اللہ سے رحم مانگا۔

اگر میں دو چار کوڑوں ہی میں دم دے دیتا، جو عین ممکن تھا تو اُمیہ یقیناً یہ سمجھتا کہ اس کے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہو گیا ہے اور اُس کے ذوقِ ایذا رسانی کی تسکین نہ ہوتی اور وہ شاید مجھے دوہرا مجرم سمجھنے لگتا۔ ایک تو اُس کی رقم ڈوبی، دوسرے غلام مناسب سزا کے بغیر ہی فراغت حاصل کر گیا۔

کوڑوں کا ایک دور ختم ہوتا تو وقفہ ہوتا اور پھر دوسرا دور شروع ہو جاتا۔ ایسے ہی ایک مختصر وقفے میں ابوسفیان کی بیوی ہند چھاتا لئے ہوئے، خوشبوؤں میں بسی میرے پاس

آئی اور کان لگا کر میری نحیف آواز سننے کی کوشش کی۔ 'احدؐ، احدؐ'۔ یہ سُن کر مڑی اور ہنستی ہوئی واپس چلی گئی۔ ہند کی ہنسی بڑی مترنم تھی۔

"یہ بد نصیب تو وعظ کر رہا ہے"۔

اور پھر مجھ پر کوڑے برسنے لگے۔ ایک۔ دو۔ تین۔ نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔

میں نے اکثر سوچا ہے کہ شاید اُس دن میں درخت پر پڑے کسی جھولے پر جھولتا ہوا موت کے دامن میں پہنچ گیا لیکن ایسا نہیں تھا۔ موت کیا ہوتی ہے یہ صرف وہی جانتے ہیں جو واقعی مر جاتے ہیں، البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ میں ہر درد سے آزاد ہو چکا تھا۔ مجھے کسی تکلیف کا احساس نہیں رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اپنی دانست میں مجھ پر ظلم کرنے والے میری دنیا سے بہت دور کہیں اپنے ظلم میں مصروف ہیں، یہاں تک کہ جب انہوں نے مجھ پر تپتی ہوئی چٹانیں رکھیں، جن کے بوجھ تلے میری موت یقینی تھی، تو مجھے صرف اتنا محسوس ہوا کہ انہوں نے ایک کھیل ختم کر کے دوسرا شروع کر دیا ہے۔ میں اُن کی پہنچ سے باہر جا چکا تھا۔ اُن کی حرکتیں مجھے احمقانہ لگ رہی تھیں بالکل بچگانہ۔ مجھے وہ ایسے لگ رہے تھے جیسے عکاظ کے میلے پر ناچنے والی بھیڑیں۔

پھر میں نے آنکھیں بند کر لیں اور چہرہ آسمان کی طرف اٹھا دیا۔ مجھے اپنے سامنے سرسبز و شاداب کھیت نظر آنے لگے۔ چاروں طرف پھلوں سے لدے ہوئے درخت تھے۔ میں نے بہتے جھرنوں کی گنگناہٹ سنی۔ مجھے اپنے اوپر ایک روح پرور سائے کا احساس ہونے لگا۔ پھر میں ایک نہایت خوبصورت باغ میں داخل ہو گیا جہاں ہر رنگ، ہر نسل کے نوجوان مرد عورتیں سیر و تفریح میں مشغول تھے۔ اُن کے چہروں پر وقار تھا اور اُن کے پور پور سے خوشیاں پھوٹ رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے خوش آمدید کہا اور ایک فوارے کے پاس لے گئے جہاں میں نے پانی پیا۔ اتنا کہ میری روح کی پیاس بجھ گئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں ذاتِ باری

تعالیٰ کے قرب میں ہوں۔

میں نہیں جانتا یہ کیا تھا۔ واہمہ تھا، خواب تھا، کوئی وجدانی کیفیت تھی، کوئی مافوق الفطرت کرشمہ تھا، کوڑوں سے میرا دماغ معطل ہو گیا تھا یا محض میری افتادِ طبع تھی یا پھر اس کیفیت میں یہ سارے ہی عناصر شامل تھے۔ بہر کیف جو کچھ بھی تھا جلد ہی ختم ہو گیا لیکن میں آج بھی اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کہ بلال کیا واقعی تو نے جیتے جی جنّتِ بریں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا!

آخری سزا

میں نے کچھ آوازیں سنیں جیسے لوگ آپس میں کسی بات پر بحث کر رہے ہوں۔ ایک تو امیہ تھا مگر یہ ایک اور ذرا دھیمی سی آواز کس کی تھی۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی بہت کوشش کی مگر سورج جو اس وقت اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ آگ برسا رہا تھا، مجھے چندھیائے دے رہا تھا۔ کچھ رقم کا ذکر ہو رہا تھا۔ یہ تو کوئی نئی بات نہیں تھی مکّے کا معمول تھا۔ مکّے میں دولت کمانے کا شوق وبا کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا میں دوبارہ سو جاؤں اور پھر غلام کی حیثیت سے کبھی نہ جاگوں، کبھی نظر نہ آؤں ان لوگوں کو، کبھی ان کی آوازیں نہ سنوں۔ اب میں وہ جان گیا تھا جو آج سے پہلے نہیں جانتا تھا۔

اللہ رحیم و کریم جب کسی کو اس دنیا سے اٹھاتا ہے تو اُس کے عمل میں نرمی ہوتی ہے لیکن انسان جب اپنے کسی ساتھی کی جان لینا چاہتا ہے تو اُس کے لئے نہایت اذیت ناک منصوبے بناتا ہے مگر اُس کڑے وقت میں بھی اللہ اپنے بندوں کے شاملِ حال رہتا ہے۔ میری

اس آزمائش کی گھڑی میں وہ میرے ساتھ بھی تھا۔ اُسی نے اس آزمائش پر پورا اترنے کے لئے مجھے ایک خاص شعور دے کر اپنے کرم سے نوازا۔

اب میرے کانوں میں ایک تیسری آواز آئی۔ بڑی جانی پہچانی آواز! ابو جہل مجسم اختیار بنا تحکمانہ انداز میں کہہ رہا تھا:

"یہ ہمارے اصول کے خلاف ہے کہ غلام کو سزا ختم ہونے سے پہلے خرید لیا جائے"۔ میں نے اپنے حواس قائم کرنے کی کوشش کی۔ اب یہ اُمیہ تھا:

"یہ غلام تو پہلے ہی مر چکا ہے۔ اگر ابو بکر اس کی لاش کے سو درہم دیتا ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے"۔

ابو بکر! اچھا تو یہ تھی وہ دھیمی سی آواز جو میں نے کچھ دیر پہلے سنی تھی مگر ابو بکر یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟

دھوپ کی شدت کے باوجود میں نے آنکھیں کھولیں اور اس چھوٹے سے عمل کے لئے مجھے لگا جیسے میں نے اپنے سارے جسم کا زور لگا دیا ہو۔ دھوپ کے دہکتے جہنم کے اُس پار سے مجھے اُمیہ کی آواز آئی۔ وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا، چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا:

"غلام...... زندہ ہے، زندہ ہے۔ میں نے ابھی اُسے حرکت کرتے دیکھا ہے"۔

وہ نہایت تیزی سے میرے قریب آیا اور سرگوشی کے سے انداز میں میرے کانوں کے پاس مُنہ لا کر بولا:

"سانس لے، ارے بدبخت سیہ فام حیوان سانس لے!"

سارا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ وہ شخص جو گھنٹوں سے میرے خون کا پیاسا تھا، مجھے زندہ رہنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ دیکھا جائے تو زندگی میں ہنسی کم اور ہنسنے کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔

اُمیہ پھر کچھ کہہ رہا تھا:

"ابو بکر! غلام نے اپنے جسم کی حرکت سے اپنی قیمت چڑھا لی ہے۔ اب سو میں

نہیں، دو سو میں سودا ہو گا۔ دو سو درہم میرے حوالے کرو اور لے جاؤ اسے"۔

میرے اوپر رکھے ہوئے بھاری پتھر ہٹا لئے گئے۔ میری مشکیں کھول دی گئیں۔ بلال ایک بار پھر بکا، ایک بار پھر خریدا گیا۔ لیکن اس بار صرف ایک منٹ کے لئے۔ ایک نوجوان نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ میری آنکھیں خون اور آنسوؤں سے اتنی دھندلائی ہوئی تھیں کہ مجھے اُس کا چہرہ نظر نہیں آیا۔ کچھ دیر میں میری نظر ٹھہری تو میں نے اُسے پہچان لیا۔ یہ زید تھے، محمدؐ کے منہ بولے بیٹے۔ زید بن حارثہؓ نے کہا:

"بلال! اب تم آزاد ہو!"۔

میں خاموش رہا۔ اس ایک فقرے کے بعد میں کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ اُدھر اُمیہ لہک لہک کر اپنی رقم گن رہا تھا۔ اُس کی ہنسی تھی کہ تھم نہیں رہی تھی۔

"ابنِ ابو قحافہ! تم نے اِس کے دو سو درہم دئے ہیں، میں تو اِسے سو پر بھی بیچنے کو تیار تھا،،۔ اس پر ایک قہقہہ گونجا۔

اب میں نے ابو بکرؓ کو دیکھا۔ ایک شخص جس کا چہرہ قندیل کی طرح روشن تھا۔

"اُمیہ! دھوکا میں نے نہیں، تم نے کھایا ہے۔ مجھ سے پوچھو تو یمن کی بادشاہی بھی اس کے آگے ہیچ ہے"۔

کیا میری قیمت واقعی اتنی بڑھ گئی تھی؟ میری ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ چلنا تو در کنار، میں کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ابو بکر نے مجھے ایک بازو سے پکڑا، زید نے دوسرے سے اور مجھ نیم مردہ کو آدھا راستہ چلاتے اور آدھا تقریباً گھسیٹتے ساتھ لے گئے۔

پانچ دن تک میں ابو بکرؓ کے گھر ایک تاریک کمرے میں بے ہوش پڑا رہا۔ کبھی تھوڑی دیر کے لئے ہوش بھی آجاتا تھا مگر زیادہ عرصہ بے ہوشی طاری رہتی تھی۔ میرے بستر کے گرد سرگوشیاں کرتے ہیولے مجھے مرہم لگاتے، تیل ملتے اور میرے بدن پر ٹھنڈے پھاہے رکھتے۔ ایک بار مجھے ہوش آیا تو میں نے کمرے کے ایک گوشے میں کسی کو عبادت

کرتے دیکھا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔ چھٹے دن صبح کے وقت میں چند قدم اٹھانے کے قابل ہو گیا۔ میں اپنے قدموں پر چل کر باہر کھلی فضا میں آیا تو ابو بکرؓ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ فوراً ایک بکری لائے اور میرے سامنے اُس کا دودھ دوہ کر مجھے پلایا۔ پھر وہ بولے:

"اللہ کے رسولؐ متواتر تین دن تک تمہارے کمرے میں جا کر تمہاری صحت کی دُعا کرتے رہے۔ جب تک تمہارا بخار نہیں اُترا، انہوں نے دعائیں جاری رکھیں۔ تمہاری صحت پر وہ اتنے خوش تھے کہ میں نے کبھی کسی کو اتنا خوش نہیں دیکھا۔ وہ کہتے تھے بلال اسلام میں داخل ہو گیا ہے۔ کل ہم دونوں اُن کی خدمت میں حاضری دیں گے"۔

ابو بکرؓ مجھ سے پہلے بھی چھ غلاموں کو آزاد کرا چکے تھے جن میں عامر بن فہیرہؓ جیسے لوگ بھی شامل تھے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں میں دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والا ساتواں شخص تھا، کچھ کہتے ہیں نواں لیکن میرے لئے یہی بہت ہے کہ میں سابقون الاوّلون میں تھا۔ بہت بڑا اعزاز تھا یہ ایک بے نوا غلام کا۔ میری اوقات ہی کیا تھی۔ میں وہی تو تھا جو ایک پتھر کے نیچے پڑا پایا گیا تھا۔

دربارِ رسالت میں

دوسرے دن ابو بکرؓ مجھے اُن کی خدمت میں لے گئے۔

اُن کی کشادہ پیشانی، اُنکی عالی ظرفی اور نجابت کا مظہر تھی۔ اُن کی مسکراہٹ روح میں خوشیوں کی لہر دوڑا دیتی تھی۔ اُن کی خوب صورت متناسب آنکھوں کی سیاہی میں گھرے بادامی رنگ کی ہلکی سی آمیزش تھی۔ ہاتھ ملاتے تھے تو مضبوطی سے، اور اُس وقت تک گرفت ڈھیلی نہیں کرتے تھے جب تک دوسرا اُن کا ہاتھ نہیں چھوڑتا تھا۔ زمین پر اُن کے قدم اتنے ہلکے پڑتے تھے کہ لگتا تھا پانی پر چل رہے ہیں۔ پیچھے دیکھنے کے لئے مڑتے تھے تو صرف گردن نہیں موڑتے تھے بلکہ کمر سے اُن کا سارا جسم ساتھ مڑتا تھا، یہ محمدؐ تھے۔ اللہ کے برگزیدہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم!

جب میں پہلی مرتبہ اُن سے ملا تو وہ تنکوں کی ایک سادہ سی چٹائی پر اپنے عم زاد علیؓ کے ساتھ بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو اُن کی آنکھیں بھر آئیں۔ علیؓ نے جو اُس وقت بچے

تھے، اُن کا ہاتھ تھام کر کہا:

"آپ کیوں رو رہے ہیں۔ یہ کوئی بُرا آدمی ہے کیا؟"

"نہیں علی! نہیں۔ یہ وہ شخص ہے جسے اللہ کی خوشنودی حاصل ہوئی ہے"۔

یہ کہہ کر محمدؐ جلدی سے اٹھے اور مجھ سے بغلگیر ہو گئے، اور مجھے گلے لگائے لگائے فرمایا:

"بلال! جب تک دنیا قائم ہے، یہ بات یاد رکھی جائے گی کہ اسلام کی راہ میں اذیت برداشت کرنے والے پہلے شخص تم تھے"۔

اُن کے گرم گرم آنسو میرے چہرے پر گر رہے تھے۔ جب سے میرے ماں باپ اللہ کو پیارے ہوئے تھے، یہ پہلے شخص تھے جن کے محبت بھرے آنسو میں نے اپنے چہرے پر محسوس کئے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھے کسی نے ایک گڑھے کی تہ سے بہ حفاظت باہر نکال لیا ہو لیکن اس کے باوجود میرے لئے یہ لمحہ خوشی کا نہیں تھا۔ میری خوشی کا کیا محل تھا جب محمدؐ اشکبار تھے۔ کائنات کا سب سے پاک صاف دل میری وجہ سے غمزدہ ہوا تھا۔ یہ بات میری فہم سے باہر ہے کہ نصاریٰ اس بات میں کیا خوشی محسوس کرتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اُن کے لئے روئے تھے۔ مجھ ناچیز کی سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ کسی پیغمبر کو رنجیدہ کرنا کوئی خوشی کی بات نہیں ہے۔ سب مجھے کہتے ہیں کہ نبیؐ نے تیرے لئے آنسو بہائے۔ تجھے بہت بڑا مرتبہ حاصل ہوا۔ تو نے بڑی منزلت پائی لیکن مجھے اُن سے اختلاف ہے۔

محمدؐ نے میرا بازو پکڑا اور مجھے اپنے ساتھ چٹائی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ اس بات پر میں چونک گیا۔ کہاں میں کہاں وہ عالی نسب! مَیں آج تک قریش کے کسی فرد کے سامنے نہیں بیٹھا تھا۔ میرا منصب یہ تھا کہ میں اُن کے روبرو جاؤں تو ایستادہ رہوں۔ ایک ہی چٹائی پر اُن کے ساتھ بیٹھنے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں انتہائی تذبذب کے عالم میں تھا کہ محمدؐ نے

اپنے مخصوص مشفقانہ انداز میں میری مدد فرمائی۔

"دیکھو بلال! اگر تم بیٹھو گے نہیں تو علی ہم کو اپنے کھیل نہیں دکھائے گا"۔

میں بیٹھ گیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اہلِ منصب کے پہلو میں، ایک ہی چٹائی پر اور یہیں سے میری بائیس سالہ رفاقت کا آغاز ہوا جس کی بنا پر مجھے صحابیِ رسولؐ کہلانے کا شرف حاصل ہوا۔ بائیس سال پر محیط شب و روز کا یہ ساتھ حضورؐ کی زندگی کے آخری لمحے تک رہا۔ اس تمام عرصے میں، میں اُن کے ساتھ بیٹھا، اُن کے ساتھ چلا، اُن کے ساتھ سفر کئے۔

مدینہ منورہ میں انہیں صبح نماز کے لئے بیدار کرنے کی سعادت بھی میرے مقدر میں آئی۔ صبح جب مَیں اذان کے لئے جاتا تو پہلے اُن کو بیدار کرتا۔ اُن کے حجرے کے دروازے پر ہلکے سے دستک دیتا اور کہتا یا رسول اللہ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ ہاں میں صحابیِ رسولؐ تھا اور یہ وہ مرتبہ ہے جس پر شاہانِ عالم رشک کرتے ہیں۔ اُس دن جب میں اُن کے ساتھ چٹائی پر بیٹھا تو بیٹھا کیا، عرش کی بلندیوں تک اُٹھ گیا۔ جب علی اپنے کھیل دکھا رہے تھے تو سارا گھر خوشیوں سے معمور ہو گیا تھا۔ وہ پھلانگتے تھے، کودتے تھے، قلابازیاں لگاتے تھے، الٹی سیدھی، اور پھر ہوا میں اچھلتے تو حضورؐ اُن کو ہوا ہی میں پکڑ کر، اپنے بازوؤں میں لے لیتے۔ بچوں کو اُن سے بڑا پیار تھا۔ وہ اُن کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اُن کے اندر کوئی موسیقی ہے جسے صرف بچے ہی سن سکتے تھے۔ وہ لوگوں سے اُن کی عمر اور مزاج کی مناسبت سے گفتگو کرتے تھے۔ بچوں سے بچوں کی باتیں، بچوں کے لطیفے، بچوں کے مذاق اور بڑوں سے بڑوں کی دلچسپی کی باتیں۔

ایک دن مدینے میں نماز پڑھنے تشریف لائے تو شانوں پر ایک چھوٹی سی بچی کو سوار کرایا ہوا تھا۔ یہ بچی ایک ننھے فرشتے کی طرح مسجد میں سب سے اونچی نظر آ رہی تھی اور اپنی معصومیت میں حضورؐ کے بال کھینچنے کی گستاخی بھی کر رہی تھی۔ اُسے بہت دیر تک شانوں پر

بٹھائے رکھا۔ اتار اُس وقت جب نماز کے لئے کھڑے ہوئے۔ اور نماز ختم کرتے ہی پھر اُسے اٹھالیا۔ اُس بچی کا نام امامہ تھا۔ یہ حضورؐ کی نواسی اور خدیجہؓ کی ہمشیرہ ہالہؓ کی پوتی تھیں، ابو العاصؓ اور زینبؓ کی دختر۔

نبیِ کریمؐ کا ذکر چھیڑتا ہوں تو بات کہیں سے کہیں جا نکلتی ہے۔ بے شمار واقعات ذہن میں اُبھرنے لگتے ہیں۔ کس کو چھوڑوں، کس کو بیان کروں، کہاں سے ابتدا کروں، کہاں انتہا۔ اُن کی یادوں، اُن کی باتوں نے میری زندگی کے آخری دنوں کے ایک ایک لمحے کو حُسن سے بھر رکھا ہے۔ چاروں طرف نور ہی نور پھیلا محسوس ہوتا ہے اور نور کے اس دائرے میں، میں ایک سیاہ نکتہ۔ کتنی رحمت ہے مجھ پر اللہ تعالیٰ کی!

علیؓ کے کھیل ابھی جاری تھے کہ باقی افرادِ خاندان بھی وہاں آگئے۔ خدیجہؓ، سرورِ کائناتؐ کی چاروں دختران زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ، فاطمہؓ۔ یہ اپنا ایک الگ حلقہ بنا کر بیٹھ گئیں۔ سب نے مجھے نہایت اپنائیت کی نظر سے دیکھا۔ فاطمہؓ نے تو بیٹھتے ہی مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ حبشہ کہاں ہے، کیسا ہے، وہاں کے درخت کیسے ہوتے ہیں، پہاڑ کیسے ہوتے ہیں، پھول کیسے ہوتے ہیں، چڑیاں کیسی ہوتی ہیں۔ میں بے چارہ کیا جواب دیتا۔ میں نے تو حبشہ کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ اِدھر اُدھر کے جواب دیتا رہا۔

اتنے میں امّ کلثومؓ نے کھجوروں کی ایک ٹوکری لا کر رسولِ اکرمؐ کے سامنے رکھ دی۔ حضورؐ نرم نرم، پکی پکی کھجوریں انگلیوں سے دبا دبا کر دیکھتے اور مجھے دیتے جاتے تھے۔ خود کھانے کے لئے جو کھجور بھی ہاتھ میں آتی کھا لیتے تھے۔

پھر خدیجہؓ نے ہمارے لئے بکریوں کا تازہ دودھ منگوایا۔ خدیجہؓ اپنے شوہر سے پندرہ سال بڑی تھیں۔ دراز قد، خوش خرام، خوش مزاج، پُر وقار۔ اس عمر میں بھی وہ ایک خوبصورت خاتون تھیں۔ وہ پچیس سال تک حضورؐ کے عقد میں رہیں اور جب تک انتقال نہیں

فرمایا، حضورؐ نے دوسرا نکاح نہیں کیا اور نہ کبھی اس خواہش کا اظہار فرمایا۔ خدیجہؓ کے انتقال کے وقت رسالتمآبؐ کی عمر پچاس سال تھی۔ دونوں کا آپس میں بے حد پیار تھا۔ زندگی بڑی خوشیوں میں بسر ہو رہی تھی لیکن مکمل خوشی تو شاید انسان کے مقدر ہی میں نہیں ہوتی۔ ان دونوں کو بھی ایک غم تھا۔ ان کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ دو بیٹے پیدا ہوئے تھے۔ قاسم اور عبداللہ، لیکن اُن کا صغر سنی ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ قاسم حضورؐ کی سب سے پہلی اولاد تھے۔ زینب سے بھی پہلے۔ انہیں کے نام پر آپ کی کنیت ابو القاسم پڑی۔ عبداللہ سب سے چھوٹے تھے، فاطمہ سے بھی۔

اب دن ڈھلنے لگا تھا، سائے دراز ہوتے جا رہے تھے۔ باہر تھوڑی سی ہوا چلنی شروع ہو گئی تھی اور مکہ جو دھوپ کی حدّت میں دم سادھے پڑا تھا، آہستہ آہستہ بیدار ہونے لگا تھا۔ مکہ ہوا کے جھونکوں سے بیدار ہوتا ہے۔ گرمی میں اتنی گھٹن ہوتی ہے کہ سانس لینا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔ ہوا چلی تو سب نے گہرے گہرے سانس لے کر اُس کا خیر مقدم کیا۔ رسولِ کریمؐ نے فرمایا:

"چلو باہر بیٹھتے ہیں۔ صحن میں موسم بہتر ہو گا"۔

میں اُٹھنے کو تو اٹھ گیا لیکن اٹھتے ہی مجھے احساس ہوا کہ میں تو تقریباً اپاہج ہوں۔ میں اپنا بوجھ نہیں سنبھال پا رہا تھا۔ لڑکھڑا کر گرنے ہی والا تھا کہ ابو بکرؓ نے لپک کر مجھے سہارا دیا اور اپنے بازوؤں میں سنبھال کر مجھے دوبارہ بٹھا دیا۔ خدیجہؓ نے یہ صورتِ حال دیکھی تو بیٹیوں کو آواز دے کر کہا کہ کمبل اور گرم تیل لے آئیں۔ لیکن محمدؐ کے پاس ایک اور علاج تھا۔ انہوں نے فرمایا۔

"اُٹھنے کی کوشش کرو بلال! خون کو گردش میں آنے دو"۔

یہ کہہ کر انہوں نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیا۔ میں اپنی ٹانگیں سیدھی نہیں کر پا

رہا تھا، اُن پر وزن ڈالنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ انہوں نے آہستہ آہستہ مجھے کھینچ کر اٹھانے کی کوشش کی اور میں اُن کا ہاتھ تھامے اوپر اٹھتا چلا گیا۔ اس بار جب میں کھڑا ہوا تو اپنا سارا درد وہیں چٹائی پر ہی چھوڑ آیا۔

محمدؐ کبھی معجزے نہیں دکھاتے تھے۔ انہیں بیماروں کو شفایاب کرنے کا کوئی دعویٰ نہیں تھا۔ وہ مُردوں کو زندہ نہیں کرتے تھے۔ پانی پر چل کر نہیں دکھاتے تھے۔ لوہے کو پانی پر تیرا کر لوگوں کو حیرت میں مبتلا نہیں کرتے تھے اور نہ زخموں سے نڈھال غلاموں کا درد رفع کرنے کے لئے کوئی اعجاز دکھاتے تھے۔ اُس شام بھی جب انہوں نے مجھے اٹھایا اور اُن کے ہاتھ کے لمس سے میرا سارا درد دور ہو گیا تو انہوں نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا تھا۔ وہ ان باتوں سے بہت بلند تھے۔ انہوں نے صرف اتنا کیا کہ مجھے اپنی تکلیف کو برداشت کرنے کی طاقت عطا کی۔ یہ اُن کا وصف تھا کہ وہ ہر شخص کے اندر چھپی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کو دیکھ لیتے تھے اور اُسے اُن کا شعور دے دیتے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے محسوس کیا کہ ہر شخص کے اندر فطری طور پر رحم کا جذبہ موجود ہے تو انہوں نے سب کو اس کا ادراک کرا دیا اور اس طرح انسان کی یہ فطری خوبی اُبھر کر سامنے آ گئی اور زندگی کا روزمرّہ بن گئی۔

محمدؐ کاملاً بشریت کے دائرے میں زندگی گزارتے تھے۔ اُن کی ولادت بھی دائرۂ بشریت میں ہوئی، اُن کی وفات بھی۔ یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اللہ نے اُن کو وہ کچھ مرحمت کیا جو پہلے کسی نبی کے حصے میں نہیں آیا۔ اللہ نے انہیں قرآنِ حکیم عطا کیا اور یہی کلامِ الٰہی جو ہمیں اُن کی وساطت سے ملا، سب سے بڑا معجزہ ہے۔

چلتے چلتے انہوں نے دھیمی آواز میں کہا:

"بلال! تم اللہ کو کس کس طرح جانتے ہو؟"

"میرا دل اللہ کی شہادت دیتا ہے"۔

وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔ چند قدم اور چلے تو میں نے مزید کہا:

"میں اللہ کو جانتا ہوں، لیکن پھر بھی نہیں جانتا، کیا اللہ تلاش سے مل سکتا ہے؟"

وہ خاموش قدم بڑھاتے رہے۔ میں اُن سے ذرا پیچھے تھا۔ شاید انہوں نے میرا سوال نہیں سُنا تھا۔ پھر وہ رکے اور اپنے سارے جسم کے ساتھ نہایت دلکش انداز میں مڑتے ہوئے، بہت اپنائیت اور تعلق کے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئے:

"ہاں بلال۔ تلاش سے۔ اُس کی عبادت کرنے سے۔ اس کی حمد و توصیف کرنے سے اور اس کے بندوں کے ساتھ ہمدردی کرنے سے اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے قریب ہو جاتا ہے لیکن ہمیشہ یاد رکھنا! بندہ اللہ کو نہیں پاتا۔ اللہ تعالیٰ خود بندے کو تلاش کرتا ہے۔ ایمان بندے کی اپنی صفت نہیں، اللہ کا عطیہ ہے"۔

اُن کے چہرے پر عجیب استقامت اور طمانیت تھی۔ لہجے میں یقین کی قوت جھلکتی تھی:

"میں اللہ کا پیغمبر ہوں اور مجھے علم ہے کہ اللہ تک رسائی کا راستہ اسلام ہے"۔

اُس یادگار دن میں 'اسلام' کا لفظ میں نے دوسری مرتبہ سُنا تھا مگر ابھی تک اِس لفظ کا اصل مفہوم مجھ پر واضح نہیں تھا۔ ویسے ہر بار سننے کے بعد اس لفظ کے معنی میں وسعت پیدا ہوتی جاتی تھی۔ انہوں نے میری بے علمی اور کم مائیگی کو محسوس کیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمانے لگے:

"اسلام کا مطلب ہے اپنے آپ کو اللہ لاشریک کی مرضی کے تابع کر لینا۔ اسلام کا مطلب ہے سب انسانوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا خواہ وہ کسی رنگ، کسی نسل، کسی منصب کے ہوں۔ اسلام نوعِ انسان کی مساوات کا پیغام ہے۔ اسلام انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کا منتخب کیا ہوا دین ہے"۔

انہوں نے میرے کندھے سے ہاتھ اٹھالیا اور شرمیلے سے انداز سے منہ پھیر لیا۔ شاید انہیں خیال آیا ہو کہ انہوں نے ایک کندۂ ناتراش سے بہت کچھ، بہت جلدی کہہ دیا۔

"سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے"۔

انہوں نے دبی زبان میں کہا، جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہوں۔

یہ تھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے میری پہلی ملاقات اور اس طرح میرے اسلام کی ابتدا ہوئی۔

آزادی کی تعلیم

میرے حالات واقعی بدل گئے تھے۔ اب میں ایسے گھر میں رہتا تھا جہاں غلام خانے نہیں تھے اور نہ ڈرے سہمے چہرے دیکھنے میں آتے تھے۔ یہ ابوبکرؓ کا گھر تھا لیکن ابوبکرؓ اپنے مہمانوں کے لئے میزبان کم اور خادم زیادہ تھے۔ صبح سویرے اُن کا پہلا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی تین بکریوں کا دودھ دوہیں۔ نہیں، بلکہ اس سے بھی پہلے وہ نماز پڑھتے تھے۔ رسولِ پاکؐ کے تمام اصحاب کو محبت اور شفقت کی خاص تعلیم تھی مگر ان سب میں ابوبکرؓ سب سے زیادہ شفیق و خلیق تھے۔ اُن کے مزاج میں بے حد دھیما پن تھا۔ بہت حلیم الطبع، نہایت بھلے مانس انسان تھے، یہی نہیں وہ بہادری اور شجاعت کے ہر امتحان میں بھی پورے اُترے۔

گھر کا ادنیٰ سے ادنیٰ کام بھی اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ تاریخ بھی اُن کا مزاج نہ بدل سکی۔ رسولِ پاکؐ کی وفات کے وصال کے بعد جب وہ اُن کے خلیفہ ہوئے تو اُس وقت تقریباً نصف دنیا اُن کے زیرِ نگیں تھی اور اُن کی فوجوں کی ہیبت سے دنیا کی عظیم سلطنتوں کے ایوانوں

میں لرزہ تھا۔ اُن دنوں میں بھی وہ اپنے گھر کی دہلیز پر بیٹھے اپنے ہاتھوں سے اپنے جوتے مرمت کرتے دیکھے گئے۔

جب میں انہیں معرکۂ عراق میں مسلمانوں کی عظیم الشان فتح کی خوش خبری سنانے گیا تو میں نے اُن کو اِسی حالت میں اپنی دہلیز پر بیٹھے ہوئے پایا۔ لیکن اِس وقت میں جس دن کا ذکر کر رہا ہوں، اُس دن تک تو بیس بندے بھی مسلمان نہیں ہوئے تھے اور فارس کی ملوکیت ابھی تک اپنے ہزار سالہ قدیم تخت پر قائم تھی۔

میں نے ابو بکرؓ کو آتے دیکھا تو ایک مرتبہ پھر اُن کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے مجھے خرید کر آزاد کیا۔ میری بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ الٹا انہوں نے میرا شکریہ ادا کرنا شروع کر دیا، گویا میرا ہی اُن پر احسان تھا اور گویا وہ رقم بھی میں نے ہی دی تھی جس سے مجھے خریدا گیا تھا۔ ابو بکرؓ کہنے لگے :

"رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ غلاموں کو آزاد کرنے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے"۔

یہ بات انہوں نے شرماتے شرماتے کہی بلکہ یہ کہتے ہوئے ان کی زبان ایک آدھ بار لڑکھڑائی بھی۔ شاید اس لئے کہ اپنی ایمان داری سے مجبور ہو کر وہ میرے ہی سامنے اعتراف کر رہے تھے کہ انہوں نے مجھے اپنے ثواب کی غرض سے آزاد کرایا ہے لیکن نیک کاموں کے پس منظر میں اس قسم کی روحانی خود غرضی تو ہر دینؔ کا حصہ ہے۔ وہ کہنے لگے :

"بلال اب تمہیں نئے کام کرنے ہوں گے اور شاید اتنے سخت کہ اب سے پہلے کبھی نہ کئے ہوں"۔

میرے منہ سے معاً نکلا :

"جو حکم آقا!"

میرے جواب سے انہیں بہت دکھ پہنچا۔ مجھے بھی فوری طور پر احساس ہوا کہ یہ

الفاظ کہہ کر میں دوبارہ اپنے ماضی کی ظلمت میں داخل ہو گیا اور اب اتنی تاریکی میں ہوں کہ پتہ نہیں انہیں نظر بھی آ رہا ہوں یا نہیں۔ میں نے یہ تین نامناسب الفاظ ہی نہیں کہے تھے بلکہ انہیں کہتے ہوئے میں نے غلاموں کے مخصوص انداز میں اپنا سر بھی نہوڑا لیا تھا۔

ابو بکرؓ نے دودھ کا برتن زمین پر رکھا اور دونوں ہاتھوں سے میرے دونوں کان پکڑ لئے، اور میری پیشانی سے اپنی پیشانی بار بار ٹکراتے ہوئے کہا :

"بلال! سنو، غور سے سنو۔ تم ایک آزاد انسان ہو۔ تمہارا کوئی آقا نہیں ہے لیکن آزاد رہا کیسے جاتا ہے، یہ تمہیں سیکھنا ہو گا"۔

یہ کہتے جا رہے تھے اور پیشانی سے ٹکریں مارتے جاتے تھے۔ میں ہر ٹکر پر ہاں، ہاں کہتا جاتا تھا۔ پھر وہ یکا یک ہنس پڑے اور انہوں نے میرے کان چھوڑ دئے۔

"دیکھو بلال! میں تمہیں یہی سکھا سکتا ہوں کہ جب کوئی تم سے مخاطب ہو تو چونک نہ پڑا کرو۔ بات کرتے وقت لوگوں کے چہروں پر نظریں رکھو اور اپنے سائے کو اپنا ہی سایہ سمجھو۔ یہ سب ضروری باتیں ہیں......"

وہ کہتے کہتے رک گئے۔ ایک بلی جس کے پیٹ میں بچے تھے، زمین پر رکھے ہوئے دودھ کے برتن کے گرد منڈلانے لگی۔ ابو بکرؓ کی ساری توجہ اُدھر ہو گئی۔ انہوں نے ایک پیالے میں دودھ نکالا اور بلی کے آگے رکھ دیا، یعنی مجھ سے پہلے اُس نئے مہمان کی تواضع ہوئی۔

یہ بات مجھے عجیب سی لگی۔ میں ہوتا تو شاید ایک ٹھوکر مار کر بلی کو بھگا دیتا لیکن نہیں، ابھی مجھے بہت کچھ سیکھنا تھا۔ مجھے یاد ہے جب ہم مکے کی طرف دس ہزار کی فوج کے ساتھ پیش قدمی کر رہے تھے تو ایک جگہ ہمارے راستے میں ایک کتیا نے بچے دے رکھے تھے۔ حضورِ اکرمؐ نے جب یہ دیکھا تو فوج کو راستہ بدلنے کا حکم دے دیا اور ہم اُس بچوں والی کتیا سے سو گز دور نیا

راستہ بنا کر گزرے۔ سارے کے سارے دس ہزار۔ محض اس لئے کہ بچوں والی کتیا پریشان نہ ہو۔ محمدؐ نبیوں میں پہلے نبی تھے جنہوں نے جانوروں پر رحم کرنے کی تاکید کی۔ ایک بار انہوں نے فرمایا تھا کہ بندہ ایک بلی پر ظلم کر کے جہنم میں جا سکتا ہے اور ایک بے زبان کو پانی پلا کر انعام پا سکتا ہے۔

لیکن اُس وقت یہ ساری باتیں میرے لئے نئی تھیں۔ میں سوچتا تھا بلی کو دودھ دیا جا رہا ہے اور مجھے نہیں۔ مجھے اُس کی شکم سیری کا انتظار کرنا ہے۔ میں انہی خیالات میں گم تھا کہ بلی کے پاس زمین پر بیٹھے ہوئے اُس عظیم اور حلیم النفس انسان نے اپنا سلسلۂ کلام دوبارہ شروع کیا، وہیں سے جہاں سے ٹوٹا تھا:

”زیادہ ضروری نکتہ یہ ہے بلال کہ غلام کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا اور مستقبل کا ہونا بہت اہم ہے“۔

یہ کہہ کر وہ ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئے تا کہ ذرا فاصلے سے بلی کو دودھ پیتے دیکھیں۔ مجھے ابھی یہ سیکھنا تھا کہ جنہیں اللہ سے پیار ہوتا ہے اُن کے لئے ہر جاندار چیز میں مدرسے کھلے ہوتے ہیں، جانوروں میں، پھولوں میں، پھلوں میں۔ ابوبکرؓ کے لئے رودبارِ حیات کی ہر لہر، گلشنِ زندگی کی ہر لرزش، فرش و عرش کے درمیان تخلیقِ ایزدی کا ادنیٰ سے ادنیٰ مظہر ایک درس تھا۔

”بلال! اگر میں تمہیں ایک قلم بنا دوں تو تم لکھنا سیکھنے کی کوشش کرو گے؟“

یہ سوال ایسے پوچھا گیا جیسے بے ارادہ ہو۔ جیسے میرے لئے اس کا سننا بھی ضروری نہیں تھا، حالانکہ یہی نادانستہ سوال میرے لئے غلامی سے قطعی نجات کا پیش خیمہ بنا۔ غلامی سے اصل رہائی میں نے ابوبکرؓ کی تربیت سے پائی۔ اُن کی اُس رقم سے نہیں جس سے اُن نے مجھے خرید کر آزاد کیا تھا، گویا ابوبکرؓ کا حقیقی احسان وہ تھا جو انہوں نے مجھے دیا، وہ نہیں جو انہوں

نے میرے لئے دیا۔

ابوبکرؓ کی رہبری اور نگرانی میں، میں لکھنا سیکھ گیا۔ میں سیاہی بنانے کے لئے نیل کے پتے لاتا تھا۔ مغرب سے فجر تک انہیں پانی میں بھگوئے رکھتا۔ پھر صبح انہیں کوٹتا اور کوٹ کر سیاہی بنا لیتا۔ میں کھال پر لکھتا تھا۔ درختوں کی چھال پر لکھتا تھا۔ بھیڑ کے کندھے کی سوکھی ہڈی پر، گیلی زمین پر، راکھ پر، پتھروں پر، غرض ہر اُس چیز پر جس پر لکھا جا سکتا تھا۔ چلتے پھرتے میں ہوا میں بھی انگلیوں سے کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا تھا۔

ہر روز ابوبکرؓ مجھے تھوہر کا ایک نیا قلم تراش کر دیتے تھے۔ اب اُن کی صبح کا معمول یوں ہو گیا تھا۔ پہلے نماز، پھر قلم، پھر بکریوں کا دودھ۔

میں لکھنے بیٹھتا تو اکثر وہ میرے پیچھے آ کھڑے ہوتے۔ مجھے لکھتے دیکھتے رہتے اور میری اصلاح کرتے۔ ایک دن انہوں نے مجھے عنترہ کی نظمیں لا کر دیں جنہیں میں نے پہلے ایک ایک لفظ اور پھر ایک ایک مصرع کر کے زور زور سے پڑھنا سیکھا۔ عنترہ صحراؤں کا شہزادہ تھا۔ اس کے عظیم کارنامے، یکہ و تنہا کئی کئی سے لڑ کر دادِ شجاعت وصول کرنے کی داستانیں، اُس کی نیکیوں کے قصے، مہمان نوازیوں کی کہانیاں، عبلہ سے محبت کے افسانے اور عبلہ کے عشق میں ڈھلے ہوئے اس کے رومانی اشعار زبان زدِ خلائق تھے۔ عنترہ اپنے عہد کا ہیرو تھا۔ اُس کا کوئی ثانی نہیں تھا، نہ شمشیر زنی میں نہ شاعری میں۔ مجھے اُس کا ہر مصرع مبہوت کر دیتا تھا۔ یہ اُس کی نظم کی عظمت کا تقاضا تھا مگر میرا اُن سے ایک تعلق یہ بھی تھا کہ عنترہ بھی میری طرح حبشہ کی ایک غلام خاتون کا بیٹا تھا۔

ایک دن ابوبکرؓ باہر سے آئے تو بہت خوش تھے۔ میں اپنے لئے سیاہی بنا رہا تھا۔ مجھے سیاہی بناتے دیکھ کر اور بھی خوش ہوئے۔ انہوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر میرے سیاہی سے داغدار ہاتھ پکڑ کر چوم لئے:

"تمہیں پتہ ہے آج رسول اللہؐ نے کیا فرمایا؟"

ابو بکر میرا ہاتھ پکڑے پکڑے مجھے ایک گدّے کے پاس لے گئے۔ بیٹھنے کو کہا اور ساتھ ہی خود بھی بیٹھ گئے۔ جو خبر وہ لے کر آئے تھے اُس کے لئے اتنا اہتمام ضروری تھا۔ جب ہم بیٹھ گئے تو انہوں نے کہا:

"طالب علم کی سیاہی، شہید کے خون سے زیادہ قیمتی ہے۔ یہ رسولِ کریمؐ کے الفاظ ہیں"۔

میں اٹھا اور میں نے اپنے دونوں ہاتھ سیاہی کے برتن میں ڈبو دیئے، پھر ہاتھ باہر نکالے اور بہت دیر تک انہیں دیکھتا رہا۔ سیاہی پر سیاہی!

اُن کی باتیں

اب میں آپ کو محمدؐ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں چند باتیں بتاتا ہوں۔ جو کچھ میں نے دیکھا سنا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر کو غریب اور یتیم پیدا کیا۔ اُنکے والد عبداللہ نے کبھی اپنے فرزندِ جلیل کو گود میں نہیں اٹھایا۔ محمدؐ ابھی شکمِ مادر ہی میں تھے کہ عبداللہ کا انتقال ہو گیا۔ اپنے بیٹے کے لئے انہوں نے جو ترکہ چھوڑا وہ بھی کیا تھا۔ پانچ نحیف و نزار اونٹ اور چند بھیڑیں!

محمدؐ عام الفیل میں واقعہ فیل سے پچاس یا پچپن دن بعد مکّے میں پیدا ہوئے تھے۔ مجھ غلام کی پیدائش سے بارہ سال پہلے۔ صبح کا وقت تھا اور بہار کا موسم۔ ربیع الاوّل کی نو یا بارہ تاریخ تھی۔ پیدائش کے دن کے متعلق انہوں نے میرے سامنے ایک اعرابی کو بتایا تھا کہ ان کی ولادت پیر کے دن ہوئی تھی۔ عیسوی تاریخ کے مطابق سن ٥٧٠ تھا یا ٥٧١ عیسوی مہینے پر بھی اختلاف ہے۔ زیادہ لوگوں کا خیال ہے کہ اپریل کی آخری تاریخیں تھیں۔

کہتے ہیں میلادِ محمدؐ کی رات عرشِ الٰہی پر ایک جشن بپا ہوا تھا۔ کچھ لوگوں سے میں نے سنا کہ اُس رات انہوں نے آسمان پر قندیلیں روشن دیکھی تھیں۔ یہ بھی سُنا ہے کہ اُس رات فرشتے نظر آئے تھے جو آسمان پر شادمانی کے گیت گا رہے تھے۔ سُنا ہے لوگوں نے یہ بھی کہا کہ ولادتِ محمدؐ کے ساتھ فارس کے ہزار سالہ قدیم آتش کدے کا دائمی شعلہ بجھ گیا۔ لوگوں سے یہ بھی سُنا ہے کہ اُس رات فردوسِ بریں سے ایک کبوتر نیچے اترا تھا جس کی منقار جواہرات سے مزیّن تھی۔ اُس نے حضرت آمنہ کے شکمِ مبارک پر اپنے پر رگڑے اور وہ زچگی کی تکلیف سے مامون ہو گئیں۔ عیسیٰ علیہ السّلام کی پیدائش کے موقع کی بھی ایسی بہت سی باتیں سنی ہیں۔ کہتے ہیں اُس رات آسمان پر ایک نیا ستارہ نمودار ہوا تھا جس نے تین بادشاہوں کو یروشلم کی راہ دکھائی تھی اور اس طرح وہ تینوں اُس کی رہبری میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے پالنے تک پہنچ گئے تھے۔ یہ بھی سُنا ہے کہ اُن تین کے علاوہ ایک ملکہ بھی تھی جو دیر سے یروشلم پہنچی تھی کیونکہ راستے میں اُس راہبر ستارے پر بادل کا ایک ٹکڑا آ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ دیر تک نظروں سے اوجھل رہا لیکن اللہ ہی جانے۔

میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ جب محمدؐ کی عمر چار سال کی تھی تو دو فرشتوں نے اُن کا سینہ چاک کر کے اُن کا دل باہر نکالا اور اُسے گناہِ آدم سے پاک کر کے دوبارہ اُس کے مقام پر رکھ دیا۔ نہ انہیں کوئی تکلیف محسوس ہوئی نہ جسم پر کوئی نشان رہا۔ اس واقعے کا راوی ایک بچہ بتایا جاتا ہے جو اُس وقت محمدؐ کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ یہاں میں پھر کہوں گا کہ واللہ اعلم بالصّواب اللہ کی اللہ ہی جانے۔

چھ سال کے ہوئے تو اُن کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اُن کے دادا عبدالمطلب انہیں اپنے یہاں لے آئے اور اپنے بچوں کی طرح اُن کی پرورش کرنے لگے۔ دو ہی سال بعد عبدالمطلب بھی وفات پا گئے۔ پھر اُن کے بڑے بیٹے زبیر نے بنو ہاشم کے سربراہ کی حیثیت

سے قبیلے کی باگ ڈور سنبھالی۔ محمدؐ کی کفالت اور پرورش کے ذمے داری بھی سردار بنو ہاشم کی حیثیت سے اُنہوں نے ہی قبول کی۔ جب بیس اکیس سال کے ہوئے تو زبیر کی بھی وفات ہو گئی مگر اب وہ بیس اکیس سالہ نوجوان تھے۔ زبیر کے بعد ابو طالب بنو ہاشم کے سردار بن گئے اور محمدؐ اُن کے یہاں منتقل ہو گئے۔ غربت اور کثرتِ اولاد کی وجہ سے ابو طالب کے حالات باقی بھائیوں جیسے نہ تھے مگر محمدؐ کو اُن سے اور ان کی اولاد سے بہت محبت تھی۔ خود ابو طالب کو اُن سے بہت پیار تھا۔ ایک مرتبہ وہ انہیں ایک تجارتی قافلے میں اپنے ساتھ شام بھی لے گئے تھے۔ اس سفر کے بارے میں بھی کئی معجزات مشہور ہیں۔ کہتے ہیں اُن پر ایک بادل کا ٹکڑا سایہ کیے رہتا تھا۔ یہ بھی سُنا ہے کہ بحیرہ نامی ایک عیسائی راہب نے جب یہ دیکھا تو اُسے حیرت ہوئی۔ پھر اُس نے اُن کے شانوں کے درمیان، مُہرِ نبوّت دیکھی جو ایک بڑے سکے کے برابر تھی۔ یہ آنے والے پیغمبر کی نشانیاں تھیں جو بحیرہ نے اپنی کتابوں میں پڑھی تھیں۔ یہ دیکھ کر اُس نے اُن کی نبوت کی پیش گوئی کر دی تھی۔

معجزات کے بارے میں، میں تو اتنا ہی کہوں گا جو قرآن میں تحریر ہے کہ وہ لوگ جو علم نہیں رکھتے، معجزوں سے اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں۔ دراصل انسان کی ہوس کبھی کبھی اُس کی ضرورتوں سے بڑھ جاتی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اُس کی ضرورت اُتنا ہی جاننے کی ہے جو ان موقعوں کے بارے میں قرآن میں آیا ہے۔ نہ کم، نہ زیادہ۔ ویسے یوں بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک شخص کسی واقعے کو معجزہ کہتا ہے اور دوسرا اُسے محض ایک رمزیہ حکایت سمجھتا ہے، میں اکثر سوچتا ہوں کہ موسیٰ علیہ السّلام کے سولہ معجزات جنھیں ہزاروں لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، کائنات میں ایک فوری اور دائمی انقلاب کیوں نہ لا سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب نازل فرمادی تو اُس نے مزید کسی معجزے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ قرآنِ حکیم ہی ایک مرکزی اعجاز تھا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اُسی

طرح جیسے پہلے عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مرکزی اعجاز کی حیثیت رکھتے تھے۔

محمدؐ نے مجھے بتایا کہ بچپن میں وہ گلّہ بانی کیا کرتے تھے۔ صبح صبح بھیڑوں کے ریوڑ مکّے کی پہاڑیوں سے پرے لے جاتے تھے اور وہاں دن بھر اُن کے چارے کے لئے خودرو، خاردار جھاڑیوں کے سیاہی مائل پھل اکٹھے کیا کرتے تھے۔ انہوں نے ہی مجھے بتایا کہ اپنے وقتوں میں سبھی پیغمبروں نے بھیڑیں چرائی ہیں۔ میرے خیال میں اس میں بھی قدرت کی مصلحت ہے۔ تنہائی انسان کو فطرت کے قریب کر دیتی ہے۔ انسان جب صحرا کی کھلی اور تازہ فضا میں تنہا اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے تو اُسے لگتا ہے جیسے وہ سب مناظر صرف اُس کے لئے تخلیق ہوئے ہیں۔ اُس کے ذہن میں انسان کی اہمیت کا احساس جاگنے لگتا ہے۔ چارسُو پھیلے ہوئے فطرت کے بیکراں مناظر اُسے دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ وہ اپنی ذات اور کائنات کے تعلق پر غور کرنے لگتا ہے اور بات خالقِ کائنات تک جا پہنچتی ہے۔ شہر سے دُوری اس کے ذہن کو اُلجھنے نہیں دیتی۔ شہروں میں انسان وقت کی چیرہ دستیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ماضی کی پرچھائیاں اور مستقبل کے سائے اُس کے حال پر چھائے رہتے ہیں اور وہ کسی عظیم مقصد کی جستجو کے قابل نہیں رہتا۔ شہروں کی مستقل آبادیاں، وہاں کے گلی کوچے رفتہ رفتہ انسان کی اخلاقی اور روحانی اقدار کو دیمک کی طرح چاٹ جاتے ہیں اور وہ اپنے ماحول کا غلام بن کر اپنے اندر سمٹ کے رہ جاتا ہے۔ صحرا کی آزاد فضا یہ تمام بندھن توڑ دیتی ہے اور انسان کو کشادگی اور آفاقیت کا احساس دلاتی ہے۔

فطرت اپنی تمام تر معصومیت اور پاکیزگی کے ساتھ اپنی تمام تر قوت اور ہیبت کے ساتھ ہمیشہ سے صداقتوں کی علامت رہی ہے۔ یہ ایک راہ اور ایک مسلک بھی ہے جس میں ہر دور کے انسان نے پناہ پائی ہے۔ اس کی عظمت کا اندازہ یوں لگائیے کہ اگر ہمیں انسان کے بنائے ہوئے اعلیٰ سے اعلیٰ مدرسے اور فطرت کے مدرسۂ ازلی کے درمیان انتخاب کرنا ہو تو

ہم فطرت ہی کی درس گاہ کا انتخاب کریں گے۔ انسان کی بنائی ہوئی تمام چیزیں ختم ہو جائیں تب بھی فطرت کی تباہی کے مقابلے میں وہ ایک معمولی حادثہ ہوگا۔ صحراؤں میں گلّہ بانی کرنے والے اسی مدرسۂ فطرت کے طالب علم ہوتے ہیں۔

وہ جب چودہ سال کے ہوئے تو اُن سے گلّہ بانی چھڑا دی گئی۔ اب اُن کی عسکری تعلیم ہونا تھی۔ محمدؐ کم عمری کی وجہ سے تلوار نہیں چلا سکتے تھے، البتہ اپنے جدِّ امجد حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی طرح اُن کا رجحان تیر اندازی کی طرف تھا۔ اس عمر میں بھی انہوں نے اس فنِ حرب میں خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔ اس مہارت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُن کی نظر غیر معمولی طور پر تیز تھی۔ مکّے میں مشہور تھا کہ وہ عقدِ ثریا کے بارہ ستارے گن سکتے تھے۔ پہلی جنگ جس میں وہ شریک ہوئے حرب الفجار تھی۔ یہ خوں ریز جنگ تین چار سال جاری رہی مگر لڑائی صرف پانچ دن ہوئی۔ حرب الفجار کی جس جنگ میں محمدؐ شریک ہوئے تھے ایک دن کی تھی۔ اُس میں اُن کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ دشمن کے چلے ہوئے تیروں کو میدان جنگ سے اٹھا اٹھا کر جمع کریں اور اپنے تایا زبیر اور ابو طالب کو لا کر دیں۔ اُن کے ترکش خالی ہونے لگیں تو وہ مزید تیر جمع کر کے لائیں۔ سارا دن وہ چیختے چلّاتے زخمیوں، لاشوں اور کٹے ہوئے انسانی اعضاء کے درمیان، تلواروں، نیزوں اور بھالوں کی زد سے اپنے آپ کو محفوظ کرتے گھوڑوں کی ٹانگوں سے بچتے بچاتے انسانی خون سے رنگے میدانِ کارزار میں دوڑ دوڑ کر تیر جمع کرتے رہے۔

اُن کو یہ دن اچھا نہیں لگا۔ وہ اسے اپنے ذہن سے محو کر دینا چاہتے تھے۔ میں نے ایک دن انہیں کہتے سنا کہ کاش وہ دن کبھی طلوع ہی نہ ہوتا! کتنا خون بہا تھا اُس جنگ میں اور بات اتنی تھی کہ کنانہ کے ایک شرابی نے ہوازن کی شاخ بنو عامر کے ایک فرد کو سوتے میں قتل کر دیا تھا۔ قریش، کنانہ کے حلیف تھے۔ اس لئے اُن کی زیادتی کے باوجود اُن کا ساتھ

دے رہے تھے۔

وہ اور بڑے ہوئے تو انہوں نے تجارت شروع کر دی، اپنے والد کی طرح۔ بہت چھوٹے پیمانے پر! یہ مجھے کبھی معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کس چیز کی تجارت کرتے تھے، پھلوں کی، جانوروں کی، مصالحوں کی، عطر کی یا ریشم کی۔ اس بات کا کبھی ذکر نہیں آیا۔ ان تمام معمولات کے باوجود جن میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی، محمدؐ کی اپنی ذات غیر معمولی تھی۔ وہ تمام مکی انسانوں سے بہت مختلف تھے۔

مکہ تاجروں، سوداگروں اور دُکان داروں کا شہر تھا اور ہر کاروبار میں چھل کپٹ کرنے والوں کی بہتات تھی۔ ان میں محمدؐ واحد شخص تھے، جن کے بارے میں ہر زبان پر یہ تھا کہ وہ لین دین میں انتہائی ایماندار ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ کسی کو اپنے مال کے بارے میں مغالطے میں نہیں رکھا۔ جو نقص ہوا، گاہک کو پہلے بتا دیا۔ مکے کے ماحول میں اُن کی ذات ایک عجیب مثال تھی، سب سے الگ۔ اتنا اعتبار تھا اُن کا کہ شہر کے لوگ اُن کے پاس اپنی امانتیں رکھوا جاتے تھے۔ سارے مکے میں وہ الامین کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ یہ شاید اس لئے بھی کہ اُن کا اپنا نام سب کے لئے بہت غیر مانوس تھا۔ محمدؐ سب کے لئے ایک نیا نام تھا جو پہلے کسی کا نہیں رکھا گیا تھا۔

ان کی امانت اور ایمان داری کا چرچا اس قدر پھیل گیا تھا کہ اُن سے تین تین گنا عمر کے تاجر انہیں بلواتے اور انہیں ثالث تسلیم کر کے آپس کے جھگڑے چکاتے۔ اس دور میں انہوں نے اتنے بڑے بڑے فیصلے کئے کہ حضرت سلیمانؑ بھی ہوتے تو ان پر فخر کرتے۔ وہی قصہ لے لیجئے، خانۂ کعبہ میں حجرِ اسود نصب کرنے کا۔ خانۂ کعبہ کی عمارت پرانی ہو گئی تھی، اس کی دیواریں بھی نیچی تھیں اور چھت بھی نہیں تھی۔ اُس میں رکھے ہوئے بت اور چڑھاوے کا سامان غیر محفوظ تھا۔ اُن دنوں جدہ میں ایک بحری جہاز خشکی پر چڑھ کر بے کار ہوا پڑا تھا۔ قریشِ مکہ نے وہ جہاز خرید لیا اور اس کی لکڑی سے کعبے کی تعمیر نو کا فیصلہ کیا۔ پرانی

دیواریں گرا دی گئیں۔ حجرِ اسود کو اپنی جگہ سے ہٹا کر ایک طرف رکھ دیا گیا اور نئی دیواریں حضرت ابراہیمؑ کی رکھی ہوئی بنیادوں سے اٹھائی گئیں۔ جب حجرِ اسود کو اُس کے مقام پر رکھنے کا وقت آیا تو ایک قضیہ کھڑا ہو گیا۔ حجرِ اسود کو نصب کرنے کی سعادت کس قبیلے کے حصے میں آئے گی۔ چار دعوے دار تھے اور ہر ایک اپنے تئیں، اپنے قبیلے کو اس اعزاز کا مستحق سمجھتا تھا۔ چار پانچ دن سے جھگڑا جاری تھا۔ سارے شہر میں یہی باتیں ہو رہی تھیں مگر مسئلے کا کوئی حل نہیں نکل رہا تھا۔ کوئی مصالحت پر تیار نہیں تھا۔ ایک دن بات اتنی بڑھ گئی کہ آنکھوں میں خون اتر آئے اور چاروں قبیلوں کے نوجوان اپنے اپنے گھروں سے تلواریں لانے کے لئے دوڑ پڑے۔ حاضرین میں مخزومی خاندان کے ایک بزرگ ابو اُمیہ بن مغیرہ نے جو وہاں موجود لوگوں میں سب سے معمر تھے، انہیں روکا اور حرمتِ کعبہ کا واسطہ دے کر کہا:

"اے اہلِ قریش! بات کا فیصلہ نہیں ہو رہا تو کسی کو ثالث بنا لو۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اب جو پہلا شخص حرم میں داخل ہو اُسے منصف بنا لیا جائے"۔

اُس بزرگ کی نہایت دردمندی سے کہی ہوئی بات سب کے دل پر اثر کر گئی اور سب نے یہ مشورہ تسلیم کر لیا۔ اب سب حرم کعبہ کے دروازے پر نظریں جمائے انتظار کرنے لگے کہ اتنے میں محمدؐ داخل ہوئے۔ اُسی متانت کے ساتھ جو اُن کا مزاج تھی، اُسی خود اعتمادی کے ساتھ جو اُن کا خاصہ تھی، اُسی بردباری کے ساتھ جو اُن کا شیوہ تھی، اسی خندہ پیشانی کے ساتھ جو اُن کی پہچان تھی۔ حلم اور وقار کا حسین امتزاج عدل و انصاف کا نقیب الامین آ پہنچا تھا۔ سب نے خوشی خوشی اُنہیں ثالث بنا کے معاملہ اُن کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے تنازعے کی نوعیت سنی اور ایک عبا لانے کو کہا۔ کسی نے عبا پیش کر دی تو انہوں نے اُسے فرش پر بچھا دیا اور حجرِ اسود کو اٹھا کر اُس کے وسط میں رکھ دیا۔ اس کے بعد انہوں نے چاروں قبیلوں کے ایک ایک فرد کو عزت دی کہ وہ عبا کا ایک ایک گوشہ سنبھالیں اور سب مل کر اُسے حجرِ اسود سمیت، بیک وقت اُوپر اٹھائیں۔ جب حجرِ اسود مطلوبہ بلندی تک اٹھ گیا تو محمدؐ نے اُسے اٹھا کر اُس کے مقررہ مقام پر رکھ دیا۔ جہاں وہ آج بھی نصب ہے۔

خانہ آبادی

میں نے پہلی مرتبہ خدیجہؓ کا نام اُس وقت سنا تھا جب میری ماں نے ایک شہد لگا روٹی کا ٹکڑا میرے منہ میں ڈالا تھا۔ میں کوئی پانچ سال کا تھا۔ یہ روٹی خدیجہؓ کے گھر سے آئی تھی، اُس دن سے آج تک میرے ذہن میں خدیجہؓ کے نام کے ساتھ شہد کی حلاوت وابستہ ہے۔ خدیجہؓ مجسم عنایت، سر تاپا شفقت تھیں۔ اُن کے گھر کے دروازے ہمیشہ حاجت مندوں کے لئے کھلے رہتے تھے۔ اُن کے یہاں ہر ضرورت مند، ہر مسکین، ہر بے کس، بے نوا کی پذیرائی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی اُن کی نوازشیں، اُن کے گھر سے بہت دُور بھی پہنچ جاتی تھیں۔ وہ خود غریبوں کے محلّوں میں اُن کا حال پوچھنے آجاتی تھیں اور اُن کی حاجت روائی کرتی تھیں۔ خدیجہؓ اپنی مثال آپ تھیں۔ ایک رئیس خاتون جن کا دل غریبوں کے ساتھ دھڑکتا تھا۔

اُس وقت جب رسول اللہؐ نے عورتوں کے حقوق کا اعلان نہیں فرمایا تھا، مکّے میں انسان اور انسان کے درمیان تفاوت شرمناک حد تک بڑھا ہوا تھا۔ چند کھاتی پیتی خواتین کا

معززینِ شہر میں شمار ہوتا تھا جیسے خدیجہؓ اور ابوسفیان کی بیوی ہند، لیکن باقی غربت اور بے چارگی کی چکی میں بُری طرح پس رہی تھیں۔ وہ مردوں کی ہوس اور ظلم تلے روندی جارہی تھیں۔ مرد انہیں اپنا مال اسباب سمجھتے تھے، مال مویشی کی طرح۔ عنترہ جیسا شاعر بھی اب نہیں رہا تھا جو اپنے اشعار میں اُن کی حالتِ زار پر اشک بہایا کرتا تھا۔

مکہ اس لحاظ سے عجیب شہر تھا کہ یہاں ایک طرف تولات، منات اور عزیٰ کی صورت میں عورتوں کی پرستش ہوتی تھی اور دوسری طرف عورتوں کو تسکینِ ہوس کا سامان بنا کر انہیں بنیادی انسانی حقوق سے بھی محروم کیا ہوا تھا۔

یہ باتیں میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ خدیجہؓ کی صورت میں اللہ جل شانہ، نے اپنے رسولؐ کو کتنا بڑا تحفہ دیا تھا۔ ان دونوں کے مراسم کی ابتداء تو عجیب حالات میں ہوئی تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ تعلق بڑھتا گیا اور خوشگوار سے خوش گوار تر ہوتا گیا۔ پہلے پہل خدیجہؓ نے محمدؐ کو اپنے تجارتی قافلے کے سالار کی حیثیت سے ملازم رکھا تھا۔ اُن کا یہ قافلہ تجارت کے لئے شام آتا جاتا رہتا تھا۔ اُس وقت جب وہ پہلی بار خدیجہؓ کے تجارتی قافلے شمال کی طرف لے گئے، اُن کی عمر چوبیس سال تھی۔

ایک ایسے ہی قافلے کا تصوّر کیجیے۔ ریگستان کی رات میں چلتے ہوئے اونٹوں کے قدموں کی دھب دھب، کسی حدی خواں کے نغمے کی دلسوز آواز، ہر قدم پر نزدیک آتی منزل کا تصوّر، جانور اور انسان سب ایک مقصد کی خاطر سر نیہوڑائے رواں دواں، اطراف میں دور دور تک پھیلا ہوا بے نشان ریگ زار مگر اُوپر آسمان پر ستاروں کی قندیلیں جو نہ صرف انہیں اُن کی منزل کا راستہ بتا رہی ہیں بلکہ کئی نئی منزلوں کی بھی نشان دہی کر رہی ہیں، اَن گنت جہانوں کی جو اُن سے پرے آباد ہیں۔ انسان اپنا سر اٹھاتا ہے اور فطرت کی بیکراں پہنائیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ یہ پہنائیاں اس کے توسنِ فکر کو مہمیز دیتی ہیں، اُسے بلندیوں کی طرف

بلاتی ہیں۔ ذہن میں نئے جذبے جنم لیتے ہیں، نئی امنگیں جاگتی ہیں اور اس کے سامنے نئے افق کھلنے لگتے ہیں۔

جب یہ قافلہ دمشق پہنچا تو ساربانوں نے شہر کے روایتی شراب خانوں میں اپنی پیاس اور تھکن دور کرنے کا پروگرام بنایا۔ محمدؐ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور شہر کے باہر ہی اپنے اونٹوں کے ساتھ ٹھہر گئے۔ انہیں شاید علم تھا کہ ملاح سمندروں میں کم اور ساحلوں پر زیادہ ڈوبتے ہیں۔ یہ سفر انہوں نے نہایت ذمے داری کے ساتھ پورا کیا اور خدیجہؓ کو اُن کی توقع سے کہیں زیادہ منافع لا کر دیا۔ جب وہ سفر کی روداد سُنا رہے تھے تو خدیجہؓ اُن کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ اسی وقت اُن کی ذکاوت نے انہیں محمدؐ کی ذات میں اپنے ہونے والے شوہر کی جھلک دکھا دی۔

خدیجہؓ نے ایک رشتے کروانے والی خاتون نُفَیسہ کو بلوایا اور اُسے کہا کہ ذرا اپنے طور پر محمد کا عندیہ تو لو کہ شادی کے بارے میں اُن کا کیا خیال ہے۔ نُفَیسہ نے بات چھیڑی تو انہوں نے کہا:

”میرے پاس ہے کیا جو میں شادی کا سوچوں“۔

”بھلا غربت بھی کوئی بہانہ ہے۔ فرض کیجیے آپ کی کسی ایسی خاتون سے شادی ہو جائے جس کے پاس اتنا ہو جو دونوں کے لئے کافی ہو!“

پھر وہ اُن کے اور قریب آئی اور رشتے کرانے والیوں کے مخصوص رازدارانہ انداز میں کہا:

”فرض کیجیے آپ کو کسی ایسی خاتون کا رشتہ مل جائے جو حسین ہو، جس کے پاس دولت ہو، عزت ہو، جو کسی باوقار گھر کی مالکہ ہو تو؟“

محمدؐ اب نُفَیسہ کی باتوں سے بیزار ہو چلے تھے۔ انہوں نے کہا:

"یہ بھی تو دیکھنا ہوگا کہ وہ خاتون خود کیسی ہے"۔

"یقیناً۔ یقیناً"

"ایسی کون سی خاتون ہے"

"خدیجہ"

وہ یہ نام سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہنے لگے :

"یہ کیسے ہو سکتا ہے"

نُفَیسہ نے کہا :

"سب مجھ پر چھوڑ دیجیے"

خدیجہؓ اُس وقت چالیس سال کی تھیں۔ دو مرتبہ بیوہ ہو چکی تھیں۔ محمدؐ کی عمر پچیس سال تھی۔ یہاں دمشق میں، میں نے چند لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ اس عقد میں خدیجہؓ کا زیادہ فائدہ ہوا لیکن وہ کم عقل کچھ نہیں جانتے۔ انہیں کیا معلوم کہ اس تعلق میں محمدؐ نے کیا پایا۔ یہ شادی ہر لحاظ سے اتنی مکمل اور کامیاب تھی کہ لگتا تھا یہ انسان کی نہیں کسی فرشتے کی تجویز تھی۔ دراصل یہ رشتہ اُن کے مشن کی تکمیل کا پہلا مرحلہ تھا۔ خدیجہؓ نے انہیں غربت سے نجات دلائی۔ ہر پریشانی میں خدیجہؓ انہیں دلاسہ دیتیں۔ ایک دفعہ میں نے رسالتمآبؐ کو کہتے ہوئے سُنا :

"جب سب مجھے کاذب کہتے تھے تو صرف خدیجہ مجھ پر یقین کرتی تھی"۔

خدیجہؓ سب سے پہلے اُن کے مشن پر ایمان لائیں، سب مردوں سب عورتوں سے پہلے، اس وقت جب خود سرورِ کائناتؐ بھی پریشان تھے۔ محمدؐ اور خدیجہؓ کی شادی ایک مثالی شادی تھی، اتنی خوش گوار اور کامیاب کہ اس کے ذریعے گویا اللہ نے بندوں کو ایک ثبوت فراہم کر دیا کہ مرد کی بہترین ساتھی صرف عورت ہی ہو سکتی ہے۔

پہلی وحی

یہ واقعہ جو میں بیان کر رہا ہوں، مصدّقہ بھی ہے اور ناقابل تردید بھی۔ مصدّقہ یوں کہ اس کے راوی ہی صدیق ہیں، صدیق اکبر، ابوبکرؓ جنہوں نے اسے زیدؓ سے سُنا، زیدؓ نے علیؓ سے علیؓ نے خدیجہؓ سے اور خدیجہؓ نے خود اللہ کے رسولؐ سے جن کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا۔ ناقابلِ تردید یوں کہ قرآن شریف میں اس کا ذکر ہے۔ اس حوالے سے یہ ہمارا جزوِ ایمان ہے۔

جبل النور پر غارِ حرا میں محمدؐ تنہا تھے کہ جبریل علیہ السّلام نے حاضری دی اور کہا :

"پڑھو"

محمدؐ نے جواب دیا :

"میں پڑھ نہیں سکتا"۔

جبریل علیہ السلام نے زور دے کر کہا :

"اپنے رب کا نام لے کر پڑھو جس نے عالم کو پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا اور جس نے انسان کو وہ علم دیا جس سے وہ پہلے ناواقف تھا"۔

محمدؐ خاموش رہے تو اور زور دے کر کہا۔

"پڑھو!"

اس کے بعد بھی اُنھوں نے وہی کہا :

"میں پڑھنا نہیں جانتا"۔

ہر بار جب جبریلؑ اُنہیں کہتے کہ پڑھو اور محمدؐ اپنی مجبوری بیان کرتے کہ وہ پڑھنا نہیں جانتے تو جبریلؑ اُن کے جسم کو اس زور سے بھینچتے کہ محمدؐ کو اپنی قوتِ برداشت جواب دیتی محسوس ہوتی۔ تیسری مرتبہ بھی جب جبریلؑ نے یہی انداز اختیار کیا تو محمدؐ سمجھے بس اب موت قریب ہے لیکن اس کے فوراً ہی بعد جبریلؑ نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور غار سے باہر چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد محمدؐ کو یوں لگا کہ کوئی تحریر یا پیغام اُن کے اندر ثبت ہو گیا ہے۔ پیغام کیا تھا، اِس کا انہیں ابھی علم نہیں تھا مگر وہ اس کا وزن محسوس کر رہے تھے۔

یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع' اتنا عجیب و غریب' اتنا اچانک ہوُا تھا کہ محمدؐ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کلامِ الٰہی کی جلالت و تمکنت سے وہ لرزہ براندام تھے اور اس واقعے کے ایک ایک پہلو پر غور کر کے اُسے دائرۂ فہم میں لانے کی کوشش کر رہے تھے مگر گُتھی تھی کہ کسی طرح سلجھنے میں نہیں آتی تھی۔ مکّے میں وہ حسنِ اخلاق کا اعلیٰ ترین نمونہ تسلیم کیے جاتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کے چالیس سال اس متانت' سنجیدگی اور شائستگی سے گذارے

تھے کہ کسی سے تلخ کلامی تک کی نوبت نہیں آئی تھی چہ جائیکہ کسی کا اِس سختی سے اُنہیں بھینچنا۔ یہ تجربہ اُن کے لئے قطعی ناقابلِ توجیہہ تھا اور کلامِ الٰہی کی سطوتِ نزول کے تناظر میں' جو خود اپنی جگہ ایک معمّہ بنا ہوُا تھا' یہ نامانوس سلوک انہیں ناروا معلوم ہوُا۔

سوچ کی ایک لہر یہ بھی اٹھتی تھی کہ یہ عقدہ جتنا حیرت انگیز اور ناقابلِ فہم تھا ہو سکتا ہے اس کا حل بھی اتنا ہی انوکھا اور خلافِ معمول ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں تشویش کی کوئی بات ہی نہ ہو بلکہ سب کچھ بظاہر جتنا پریشان کن اور تکلیف دہ محسوس ہو رہا ہے' اتنا ہی خوش آئند اور نیک انجام ہو۔

پھر بھی اس مُحیّر العقل تجربے کے انجانے مضمرات سے اُن کا سارا بدن لرزاں تھا۔ اسی کیفیت میں وہ لرزتے، کانپتے غارِ حرا سے باہر آئے اور حیرت کے عالم میں آہستہ آہستہ کوہِ حرا کی بلندی پر اُس سمت میں چڑھنا شروع کر دیا جدھر سے نیچے اُترنے کا راستہ تھا۔ ابھی نصف راستہ بھی طے نہیں ہوُا تھا کہ جبریلؑ اُنہیں دوبارہ نظر آئے۔ اس بار وہ انسانی شکل میں تھے اور اُفق پر کھڑے تھے۔ محمدؐ جس سمت بھی رخ کرتے، شمال، جنوب، مشرق، مغرب انہیں موجود پاتے۔ پھر ایک بار انہیں اُن کی آواز سنائی دی۔

"محمدؐ! تم اللہ کے رسول ہو اور میں جبریلؑ ہوں"۔

حیرت اور پریشانی کے اسی عالم میں وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ سارا بدن کانپ رہا تھا۔ گھر پہنچتے ہی بستر پر لیٹ گئے اور کئی کمبل اپنے اوپر اوڑھ لئے۔ سر منہ سب ڈھانپ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی موقعے کی مناسبت سے اُنہیں مُدثّر کہہ کر پکارا تھا۔ مُدثّر یعنی چھپنے والا، اپنے آپ کو ڈھانپنے والا۔ ربِّ ذوالجلال والاکرام کو تو علم تھا کہ

اُس نے کیا کہا ہے اور کیوں کہا ہے۔ اس کا پیغام پہنچنے پر محمدؐ کی جو حالت ہوئی تھی اور اس محیر العقول روحانی تجربے کے بعد وہ جس کیفیت سے دوچار تھے، وہ بھی اللہ جلّ شانہ، کے علم میں تھا۔ لیکن یہ سب کچھ ایک خیرِ عظیم کی خاطر ہو رہا تھا اور ناگزیر تھا۔ اُدھر محمدؐ کے دل کا یہ حال تھا کہ اس واقعے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد بھی وہ اپنے آپ کو کمبلوں میں سمیٹے اس کے رموز و نکات، اس کی توجیہ اور توضیح میں مصروف مجسّم سوال بنے ہوئے تھے۔ یہ رُویت واقعی منجانب اللہ تھی یا شیطان نے انہیں دھوکا دیا تھا۔ ایسا تو نہیں کہ فی الواقع کچھ بھی نہ ہوا اور اُن کے ذہن نے از خود کچھ ہیولے کھڑے کر دیئے ہوں۔ یہ تو وہ جانتے تھے کہ وہ محض انسان ہیں۔ بدن کی کپکپی تھی کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ اُنھوں نے کچھ اور کمبل اوڑھ لئے۔ اتنے میں خدیجہؓ آ گئیں۔ تو اُنہوں نے اُنھیں شروع سے آخر تک سارا واقعہ تفصیل سے سُنایا۔

ایسے بھی لوگ ہیں جنہیں واقعات میں رنگ آمیزی کا شوق ہوتا ہے۔ انھوں نے اس واقعے سے بھی بہت سی کہانیاں منسوب کر رکھی ہیں۔ مگر اس قسم کی خوش کن رنگ آمیزیاں خانہ بدوشوں کے الاؤ کے گرد ہی سجتی ہیں، تاریخ کے اوراق کو زیب نہیں دیتیں۔ میں تو وہی کہوں گا جو میں جانتا ہوں۔ ربِّ کریم نے خدیجہؓ کو بڑی بصیرت سے نوازا تھا۔ انہوں نے اپنے خاوند کو تسلی دی، اُن کا خوف ختم کرنے کی کوشش کی، اُن کے خدشات دور کرنے کے لئے دلائل دیئے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے ساری صورتِ حال کا ادراک کر لیا اور اس وقت جب حضور اکرمؐ کو بھی یقین نہیں تھا کہ کیا ہوا ہے، کچھ ہوا بھی ہے یا نہیں، وہ اِس واقعے کی صحت پر ایمان لے آئیں۔

اُن کے ایمان نے رسولؐ کو حوصلہ دیا۔ خدیجہؓ نے اُن سے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ واقعی رحیم و کریم ہے اور اپنے بندوں کا خیال رکھنے والا ہے تو وہ ایک نیک اور سچے انسان کو کبھی کسی عذاب میں مبتلا نہیں کرے گا۔ وہ ساری رات حضورؐ کے ساتھ جاگتی رہیں اور لمحے لمحے بعد

اُن کو جبریلِ امین کے الفاظ دہرا دہرا کر باور کراتی رہیں کہ محمد آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں۔

اُس رات کو لیلۃ القدر کہتے ہیں، قوت و جبروت کی رات، عظمت و جلالت کی رات۔ اُس رات اللہ غفور الرحیم نے انسان کو روشنی عطا کی اور اس پر اپنی رحمتوں کا نزول فرمایا۔ اس رات اُس نے جبریلؑ کو کرۂ ارض پر بھیجا، اُس رات اُس نے اپنے رسولؐ کو اپنا پہلا پیغام پہنچایا۔ وہ رات حضرت خدیجہؓ کے ایمان لانے کی رات تھی۔ اسی مناسبت سے اس عظیم و برگزیدہ خاتون کو ام المومنین کا لقب عطا ہوا۔ بعد میں دیگر ازواجِ مطہرات نے بھی یہی لقب پایا۔

کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ رات کب آتی ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ رمضان المبارک میں آتی ہے مگر کب؟ رمضان ماہِ صیام ہے، نزول قرآن کا مہینہ! کشف اسرارِ ربّانی، عرفانِ حقیقت اور معرفتِ الٰہی کا مہینہ ہے لیکن ایک چاند سے دوسرے چاند تک رمضان کی تیس راتوں میں سے وہ کون سی رات ہے جس کی برکات قرآنِ کریم کی سورۂ قدر میں بیان ہوئی ہیں۔ کچھ کہتے ہیں سترھویں۔ کچھ کہتے ہیں تیسئیویں۔ کچھ کا خیال ہے پچیسویں یا ستائیسویں۔ اس پر سب متفق ہیں کہ یہ ماہِ رمضان کے آخری پندرھواڑے کی ایک طاق رات ہے۔ سورۂ قدر میں اللہ تعالیٰ اس رات کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ یہ رات ہزار مہینوں سے افضل ہے مگر صرف اللہ ہی کو علم ہے کہ یہ رات کون سی ہے۔

اس واقعے کے بعد میں کئی دفعہ جبل النّور پر گیا۔ غارِ حرا کا مدخل اتنا نیچا ہے کہ تقریباً رکوع کی حالت میں اندر داخل ہونا پڑتا ہے۔ اندر، مدخل سے بائیں ہاتھ، چھت بھی اتنی نیچی ہے کہ جھک کر بیٹھنا پڑتا ہے مگر آرام سے نہیں کیونکہ سطح ہموار نہیں ہے۔ اسی ناہموار سطح پر بیٹھ جائیں اس طرح کہ مدخل آپ کے دائیں ہاتھ کی طرف ہو تو بائیں طرف اور سامنے غار کی چٹانوں میں چار چار چھ چھ اُنگل کی درزیں ہیں، لمبائی کے رُخ پر تقریباً تین تین چار چار فٹ لمبی۔ ان درزوں سے ہوا بھی آتی ہے اور روشنی بھی۔ ایک خاص رُخ سے بیٹھیں تو بائیں ہاتھ کی درزوں سے خانۂ کعبہ کی عمارت صاف نظر آتی ہے۔ سامنے یعنی مدخل سے

دائیں طرف پہاڑی سلسلے اور صحرا نظر آتا ہے۔ یہاں سطحِ زمین تقریباً ڈیڑھ فٹ نیچی ہے اور چھت بھی ذرا اونچی ہے۔ یہاں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ نیچے ریت ہے۔ اندر کا کل رقبہ اتنا ہوگا کہ دس پندرہ آدمی آجائیں۔ یہی چھوٹا سا غار، مہبطِ وحی ہے جہاں اللہ کا پہلا پیغام نازل ہوا۔ میں جب جب وہاں گیا، مجھ پر ہیبت طاری ہوگئی۔ میرے گھٹنے میرا ساتھ نہیں دے پاتے تھے اور مجھے کھڑے رہنے کے لئے کسی چٹان کا سہارا لینا پڑتا تھا۔

انسان پہاڑ کی بلندی پر کھڑا ہو تو دور دور تک دیکھ سکتا ہے۔ ساری چیزیں کتنی چھوٹی چھوٹی کتنی بدلی بدلی سی نظر آتی ہیں۔ زاویۂ نگاہ بھی چیزوں کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ حرِا سے مکّے کی طرف دیکھیں اور پھر مکّے کی پہاڑیوں سے اُدھر حجاز کی وسعتوں پر نظر دوڑائیں جہاں قبائل آباد ہیں۔ قافلے رواں ہیں، چرواہے صدیوں سے اپنے گلّوں کی نگہبانی کر رہے ہیں۔ ایک پوری دنیا بسی ہوئی ہے۔ حسن، حرکت اور جہد للبقا کی جیتی جاگتی دنیا۔ مگر یہاں حرا کی بلندی سے یوں لگتا ہے جیسے ساری کائنات جامد و ساکت ہے۔ نہ کوئی حرکت ہے، نہ آواز۔ بس اللہ بول رہا ہے اور بندہ سُن رہا ہے۔

نزولِ قرآن

طلوعِ اسلام کے اوّلیں شاہدوں کی حیثیت سے ہم قابلِ رشک ہیں مگر کئی لحاظ سے ہم قابلِ رحم بھی ہیں، ہم ہمہ وقت اس خوف سے لرزہ براندم رہتے تھے کہ ایسا نہ ہو ہمارے ذہنوں میں اس نئے علم کو سمجھنے کی گنجائش ہی نہ ہو۔ نوح علیہ السّلام بھی تو اسی الہامی علم کی روشنی سے خوف زدہ ہو کر چھپ گئے تھے۔ ہم محدود صلاحیتوں کے لوگ تھے۔ ہم تو ایک جماعت ترتیب دینے کے بھی اہل نہیں تھے چہ جائیکہ ہم اُن عظیم روحانی صداقتوں کو جو ہمارے دلوں میں اتر چکی تھیں، خانوں خانوں میں رکھ کر اُن کو کوئی نام دیتے اور اُن کو نفس مضمون کے اعتبار سے کسی منطقی ضابطے میں لاتے۔ دل سے کسی الہامی سچائی کو محسوس کر لینا اور بات ہے اور دماغ سے اُس کی جزئیات کو سمجھنا اور اس پر عمل پیرا ہو کر اُسے جزوِ حیات بنا لینا دوسری بات۔ یہ رسالتمآبؐ کا ہی کام تھا کہ انہوں نے ایک الہامی پیغام کو ایک معاشرتی

حقیقت بنا دیا۔ آج کل کے نوجوان بڑے سیانے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں علم کے انبار لگے ہیں۔ ہمارے پاس کیا تھا۔ ہماری ذہنی تاریکیاں اور پہلی پہلی آیتوں کے چھوٹے چھوٹے چراغ

قل هو الله احد

الله الصّمد

لمه يلد ولمه يولد

ولمه يكن له كفواً احد ه

لیکن میرے خیال میں اللہ تعالیٰ کا اوّلیں مقصد اپنی مخلوق کی حفاظت کرنا ہے، اُسے خارجی علوم سکھانا نہیں ہے۔ اللہ کی ذات کا واسطہ حکمت اور لدیت سے ہے، خارجی اور ثانوی علوم سے نہیں۔ یہ علوم اللہ تبارک تعالیٰ کی ازلی حکمت کو سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں، اُس کا متبادل نہیں ہو سکتے۔ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی اسی حکمت اور لدیت کا صحیفہ ہے۔ ماڈی نفسیات سے بلند تر اور عینِ حقیقت۔ میرے خیال میں اس کے رموز واسرار کا انسانی منطق پر پورا پورا اترنا لازم نہیں ہے کیونکہ یہ عینِ حقیقت کائنات کے دل کی دھڑکن ہے جو مرکز و محورِ کائنات سے اُبھرتی ہے۔ قرآنِ کریم کا ہر لفظ ایک حوالہ ہے جس سے رشد وہدایت کے کبھی نہ خشک ہونے والے سوتے پھوٹتے رہتے ہیں۔ کائنات کی بیرونی حدود پر بسنے والے انسان اگر قرآنی الفاظ کا مکمل ادراک نہ بھی کر سکیں تب بھی یہ حقیقتِ عظمیٰ اپنی جگہ مسلّم رہتی ہے۔

قرآنِ کریم کے ذریعے منشائے الٰہی کی فہم ہم میں سے ہر ایک کو محمدؐ کی ذات سے حاصل ہوئی۔ عائشہؓ نے ایک بار فرمایا تھا کہ وہ قرآنِ ناطق ہیں۔ اُن کے قول و فعل سے ہم

پیغامِ الٰہی کے رموز جاننے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ جو میری سمجھ میں آیا وہ یہ ہے کہ انسان دنیاوی حرص وہوس سے کنارہ کش ہو کر ذاتِ الٰہی سے منسلک ہو جائے۔ اگر اُسے اللہ کی ذات کا اس حد تک ادراک نہیں ہو پاتا کہ وہ اُس سے عشق کر سکے تو کم از کم اتنا ضرور ہو کہ وہ اُس کے جلال وہیبت سے آشنا ہو جائے۔

مجھ جیسے چھوٹے چھوٹے ذہنوں کے کم مایہ لوگ ماورائی حقیقتوں کو سمجھنے کے لئے ماڈی علامتوں کا سہارا لیتے ہیں۔ میں جب خود کو اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ میں کسی بلند وبالا، برف پوش پہاڑ پر تنہا، گہرے گہرے سانس لے کر برف سے دھلی صبح کی شفاف اور پاکیزہ فضا کو اپنے وجود میں جذب کر رہا ہوں۔ تازہ فضا سے میرا سینہ کشادہ ہوتا جا رہا ہے اور اس طرح شرحِ صدر اور کشادگی کے راستے سے اللہ تعالیٰ کا نور میرے اندر سرائیت کرتا جا رہا ہے اور پھر جتنا کچھ اِس مٹی کے کوزے میں سما جائے، اِس کی کثافت جتنی لطافت سمیٹ سکے، یہی میرے نزدیک قربِ الٰہی ہے جس کی ترغیب اور توفیق دونوں ذاتِ الٰہی سے ملتی ہیں اور جو انسان کو انسانوں کی آقائیت سے نجات دلاتا ہے۔

ہند سچ ہی کہتی تھی۔ میں تو واقعی واعظ بنتا جا رہا ہوں۔

میں نے بار ہا رسولؐ کو نزولِ وحی کے وقت دیکھا ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے، کھڑے کھڑے، لیٹے لیٹے یا جس حال میں بھی ہوں، کانپنے لگتے تھے اور اِدھر اُدھر کوئی تخلیہ تلاش کرنے لگتے تھے۔ سرد ترین راتوں میں، میں نے اُن کا چہرہ پسینے سے شرابور دیکھا ہے۔ ایک بار نہیں کئی بار میں نے وہ کرب محسوس کیا ہے جس میں وہ مبتلا ہو جاتے تھے۔ سارے بدن پر لرزہ، پریشانی کے عالم میں اپنی پسلیوں کو زور زور سے بھینچتے تھے۔ کبھی ایک ایک گھنٹہ خاموش لیٹے رہتے نہ خود کچھ کہتے۔ نہ ہمیں کچھ عرض کرنے کی جرات ہوتی تھی۔

نزولِ وحی اچانک ہوتا تھا۔ رسولِ کریمؐ کو پہلے سے کوئی اشارہ نہیں ملتا تھا۔ کبھی گفتگو کے دوران میں، کبھی اپنے گھر کے اندر چلتے پھرتے، کبھی اونٹ پر بیٹھے بیٹھے۔ ایسے موقعوں پر وہ فوراً اونٹ سے اُتر آتے تھے اور اپنے آپ کو اپنی عبا میں چھپا لیتے تھے۔ نزولِ وحی کے وقت کبھی انہیں گھنٹیاں سی سنائی دیتیں، کبھی پروں کے پھڑ پھڑانے کی آواز، کبھی زنجیروں کی جھنکار۔

ایک فرشتہ اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے ہم کلام ہوتا لیکن ہم جو اُن سے صرف ایک ہاتھ کے فاصلے پر بیٹھے ہوتے تھے نہ سن سکتے تھے، نہ کچھ دیکھ سکتے تھے۔

رسولِ پاکؐ اس روحانی تجربے کے کرب سے باہر آنے کے بعد اُس الہام کو بیان فرماتے تھے۔ اِس پیغام کا ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف، ایک ایک زیر زبر، من و عن ارشادِ الٰہی کے مطابق۔ اس کے بعد یہ آیاتِ ربانی کسی کھال پر یا چھال پر یا کسی صاف ہڈی پر جو بھی اس وقت موجود ہو لکھ کر محفوظ کر لی جاتی تھیں۔ بعینہٖ جیسے جبریل علیہ السلام انہیں لے کر آتے تھے۔

ایسے موقعوں پر جب میں اُن کے کرب کی کیفیت دیکھتا تو مجھ سے برداشت نہ ہوتا۔ کبھی کبھی اُن کی محبت، کلامِ الٰہی کی افادیت پر غالب آنے لگتی۔ میرا جی چاہتا کہ میں اُن کے پاس جاؤں اور اُن کو اس تکلیف سے نجات دلاؤں لیکن میرے پاؤں من من بھر کے ہو جاتے، بندے کی کیا مجال کہ وہ اللہ کے کاموں میں دخل دے۔ ایک بار اُنہوں نے ہمیں بتایا کہ نزولِ وحی کے وقت ہر بار انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی طاقت اُن کی روح کو ان سے نوچے لئے جا رہی ہے۔

وحی کے بعد وحی نازل ہوتی رہی، یہاں تک کہ ہمارا دین مکمل ہو گیا۔

یہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت تھی کہ اُس نے اپنا پیغام نازل کرنے کے لئے ایک ایسے

شخص کو نبوت سونپی جو امی تھا۔ نہ لکھ سکتا تھا، نہ پڑھ سکتا تھا۔ اللہ کا منشا شاید یہ تھا کہ اُس کی آیات کا پیغامبر الفاظ کے اُن ناقص تلازمات میں نہ الجھا رہے جو ہمیشہ لکھے ہوئے الفاظ کے پس منظر میں سر اٹھاتے رہتے ہیں اور جن سے نفسِ مضمون کبھی بکھر جاتا ہے، کبھی مجروح ہو جاتا ہے۔ وہ ایسا شخص نہ ہو جس نے بحرِ علم کے چند موتی چن رکھے ہوں جن کی چمک دمک اُس کی نگاہوں کو خیرہ کئے رکھتی ہے اور وہ اپنی نیم علمی کو اتنی اہمیت نہ دے بیٹھے کہ اصلِ علم کی حقیقت تک نہ پہنچ سکے۔

دوسرے الفاظ میں رمز شاید یہ تھی کہ ایک ارفع پیغام کو نازل کرنے کے لئے جس ظرف کا انتخاب کیا جائے وہ اس سے پہلے کسی کم تر مقصد کے لئے استعمال نہ ہوا ہو۔ وہ ایک ایسا کورا کاغذ ہو جس پر اولیں تحریر الہامی قلم سے لکھی جائے تاکہ اُس کی شرح بشری تاویلات سے مبرّا اور عین منشائے الٰہی کے مطابق ہو۔

محمدؐ نبی بھی تھے اور رسول بھی۔ نبی وہ ہوتا ہے جو ایک محدود پیغام لے کر آتا ہے۔ رسول قدرتِ الٰہی کے لامحدود امکانات کے لامحدود شواہد کی مدد سے مخلوق کو خالق کی عظمت و جلالت، اس کی شوکت و جبروت اور اس کی قوت و قدرت کے ساتھ منضبط اور مربوط کرتا ہے۔ اس حیثیت سے رسول کا دائرۂ کار، قوانینِ فطرت کے علاوہ انسان کے تمام روحانی تجربات اور مادّی حرکات و سکنات تک پھیلا ہوا ہے۔ انسان کو آخرت کا شعور دینا بھی رسول کا کام ہے۔ اس لئے وہ اُن سب عوامل سے بھی براہِ راست منسلک ہے جن کے ذریعے انسان یہ شعور حاصل کرتا ہے۔

نبوّت کا استحکام رسالت کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ محمدؐ اپنی حیثیتِ نبوی میں امّی تھے، اپنی حیثیتِ رسالت میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک امّی کو نبی بنا کر اُسے نبوت کے ایک

مثالی درجے پر فائز کر دیا تاکہ رسالت کے وسیع تر مقاصد کے لئے اُس کی کامیابی کی بدرجۂ اتم ضمانت مہیا ہو جائے۔

مجھے پتہ نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام لکھنا پڑھنا جانتے تھے یا نہیں۔ لوگوں نے کبھی کبھی انہیں زمین پر انگلی سے کچھ لکھتے تو دیکھا لیکن یہ معلوم نہیں کہ وہ واقعی کوئی تحریر تھی یا محض ایک غیر شعوری عمل۔ یہ تو طے ہے کہ اُن کے ہاتھ کی کوئی تحریر موجود نہیں ہے۔

نفرت کا سبب

یہ لوگ آخر ہم سے کیوں نفرت کرتے تھے۔ کیوں بغض لئے پھرتے تھے ہمارے خلاف! یہ بُرے لوگ نہیں تھے۔ اپنی قدیم روایات کے پاسدار، اپنی خاندانی اور قبائلی وضعداریوں پر قائم، وعدے کے پابند، بات کے دھنی، غیرت کے پتلے، عزّت کی خاطر جان پر کھیل جانے والے، جفاکش، جرأت مند، جری، مہمان نواز۔ کچھ حد تک کرخت اور اکھڑ لیکن وہ اُن کی صحرائی زندگی کی سختیوں کا تقاضا تھا۔

بات دراصل یہ تھی کہ انہیں ہم سے نہیں ہمارے تصوّرِ وحدانیت سے نفرت تھی۔ انہیں اپنے ان گنت خداؤں سے اتنی محبّت تھی یا اُنھیں اُن کی اتنی ضرورت تھی کہ وحدہٗ لاشریک کا تصوّر ہی اُن کے دلوں میں نفرت کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے کافی تھا۔ بت پرستی کی تاریخ میں بتوں سے اتنا پیار کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ وہ خداؤں کا استحصال بھی کرتے تھے، اُنھیں سجاتے سنوارتے بھی تھے۔ یہ لین دین کا ایک ایسا نظام تھا جس میں انسان

ایک سودا کرتا تھا۔

"ہُبل تم میرا اُونٹ تلاش کر دو۔ میں تمہاری پرستش کروں گا، تمہارا احترام کروں گا، تمہارے لئے تحفے لے کر آؤں گا اور بار بار تمہارے در پر حاضری دے کر تمہیں خدائی مقام پر فائز رکھوں گا"۔

جس خدا کے ماننے والے نہیں رہتے تھے، اُسے خدائی سے خارج تصوّر کر کے پھینک دیا جاتا تھا۔

لیکن میں بلال جو خود بھی کبھی ان خداؤں کو مانتا تھا، شاید پوری بات نہیں کہہ سکا۔ ان خداؤں کا معاملہ اتنا سادہ بھی نہیں تھا۔ ان کی کمزوریاں تھیں تو قوت بھی تھی۔ میں اس موضوع پر ذرا وضاحت سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

ہم لکڑی اور پتھر کے خداؤں کی بات تو کرتے ہیں لیکن جاہلیت کے دور میں بھی لوگ اس قدر احمق نہیں تھے کہ وہ پتھر کی پوجا کرتے جسے وہ ریزہ ریزہ کر سکتے تھے یا لکڑی کی پرستش کرتے جسے وہ پل بھر میں جلا کر راکھ کر سکتے تھے۔ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ پتھر یا لکڑی کے اندر ایک روحانی جوہر بسا ہوا ہے۔ وہ اس غیر مادّی جوہر کی عبادت کرتے تھے لیکن اس عقیدے کی کمزوری یہ تھی کہ یہ غیر مادّی جوہر جسے خدا مانا جاتا تھا، ایک شے کے اندر موجود تھا۔ لکڑی میں یا پتھر میں، گویا یہ مادّی چیزیں اس خدا کا مسکن تھیں، جیسے خانۂ کعبہ اللہ کا گھر ہے مگر اپنے لکڑی یا پتھر کے مسکن سے باہر اُن کی خدائی ختم ہو جاتی تھی اور اُن کا کوئی اختیار باقی نہیں رہتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس غیر مادّی جوہر کی خدائی، اس کی معبودیت، اُس کے مادّی مسکن کی حدود تک محدود تھی۔ اُن حدود سے باہر اُن کا اختیار ختم ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ہر قبیلے کے، ہر شہر کے، ہر معبد کے اپنے اپنے خدا تھے جو اپنی مادّی حدود کے اندر خدائی کرتے تھے۔ ایک خدا جو مکّے میں دروازہ کھول سکتا تھا، وہ مدینے میں بند نہیں کر سکتا تھا۔ یہ عالم تھا ان خداؤں کی خدائی کا!

اس سے بھی بدتر صورتِ حال یہ تھی کہ خدا اپنی خدائی کے لئے بندوں کے محتاج تھے۔ اہلِ روما بھی اپنے بت پرستی کے دور میں جانتے تھے کہ اُن کے خداؤں کا اپنے پرستاروں پر کس حد تک انحصار ہے۔ مثال کے طور پر اگر خداؤں کا نام نہ رکھا جائے، یا اُن کے پرستش کرنے والے نہ رہیں تو وہ خدائی سے خارج ہو جاتے تھے۔ جولیس سیزر کے اپنے خدا تھے، آگسٹس سیزر کے اپنے۔ شخصیتوں کے ساتھ خداؤں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ بندہ خداؤں کو مانتا رہے، اُن کا احترام کرتا رہے، اُن پر چڑھاوے چڑھاتا رہے، اُن کی پرستش کرتا رہے تو وہ خدا اور اگر وہ یہ سب کچھ نہ کرے اور اُن کے سامنے سے بغیر جھکے گزر جائے تو وہ کچھ بھی نہیں، گویا خداؤں کی ساری طاقت بندوں کے ہاتھ میں تھی۔ پھر خدائی کیا رہ گئی!

یہ وہ شرک تھا جو ایک اللہ کو تسلیم کرنے کے باوجود تھا۔ میں نے سنا ہے پرانے وقتوں میں عمرو بن لحی نام کا ایک کاہن تھا جو بت پرستی کی رسم شام سے لے کر آیا تھا۔ یہ رسم آہستہ آہستہ عرب کا مذہب بن گئی۔ پہلے شاید دو چار بت آئے پھر اُن کی تعداد بڑھتی گئی۔ ایک بت کے ماننے والوں کا آپس میں خلوص محبت کا رشتہ بڑھا اور وہ ایک گروہ بن گئے۔ بتوں میں اضافہ ہوتا گیا اور انسانیت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہوتی گئی۔ ظاہر ہے یہ بٹوارہ اللہ وحدہٗ لاشریک کی مشیت کے خلاف تھا کیونکہ وہ جو کل عالموں کا رب ہے ساری انسانیت کو محبت اور مودت کے رشتے میں پرونا چاہتا تھا۔

بت پرستی کی ایک وجہ میری سمجھ میں یہ بھی آتی ہے کہ مشرکین نے بتوں کو مرکزِ محسوس بنا کر اُنھیں پوجنا تو شروع کر دیا مگر بت اُن کے لئے مرکزِ ہدایت نہ بن سکے۔ یہ بھی گویا ایک طرح کی آسانی تھی کہ اُنھیں اپنی بداعمالیوں پر بتوں کی طرف سے کسی سرزنش، عیب گیری یا تادیب کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ بت اُنھیں کسی بات پر نہیں ٹوک سکتے

تھے گویا من مانیاں کرنے کے کھلے مواقع حاصل تھے۔ کسی قبیلے کا بت سارے قبیلوں کو ایک مرکز پر نہیں لا سکتا تھا، لہٰذا خانۂ کعبہ میں بتوں کا میلہ لگ گیا اور اس کثرت میں قریش نے اپنے لئے شہرت، عزّت اور مالی منفعت کی راہیں ڈھونڈ لیں۔ غرض زندگی چین سے کٹ رہی تھی کہ محمدؐ کے کلمہء لاَ اِلٰہَ اِلا اللّٰہ نے بنیاد ہی ہلا کر رکھ دی۔

ہم سے نفرت کی خاص وجہ یہی تھی کہ وحدہ، لاشریک کا تصوّر اُن کی عقل میں نہیں آتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ جب رسالتمآبؐ جسموں کے دوبارہ اٹھائے جانے کی بات کر رہے تھے تو یہ لوگ کیسے جزبز ہو رہے تھے۔ ابولہب بھی موجود تھا۔ وہ نہایت تضحیک آمیز لہجے میں محمدؐ کی باتوں کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس دن اُبی ابن خلف کہیں سے انسانی ہڈی کا ایک بوسیدہ ٹکڑا لے آیا تھا۔ اُسے اپنی انگلیوں سے چُورا چُورا کرتے ہوئے وہ سرورِ عالمؐ سے کہنے لگا:

"تم اسے کہتے ہو کہ یہ ہڈیّ دوبارہ اپنی اصلی حالت میں انسان کے جسم کا حصّہ بنا کر اٹھائی جائے گی؟۔ اس سے بنے گا انسان دوبارہ؟"

اور یہ کہتے ہوئے اس بدبخت نے ہڈی کے چُورے کو اپنی ہتھیلی سے پھونک مار کر رسولِ خداؐ کے چہرے پر اُڑا دیا۔ رسول کریمؐ نے نہایت تحمل سے اپنا چہرہ صاف کیا اور ابنِ خلف سے مخاطب ہوئے:

"جس نے ایک دفعہ انسان کو تخلیق کیا ہے، وہی اُسے دوبارہ بنائے گا"۔

اس کے بعد وہ سورۃ بنی اسرائیل کی پچاسویں اور اکیاونویں آیتیں پڑھتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

ابولہب کا چہرہ غیظ وغضب سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ اُس کا بھاری بھرکم وجود غصّے سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں اس سے ہمیشہ خائف رہتا تھا۔ اُس دن جب اُس کے غصّے سے

گویا زمین لرز رہی تھی، وہ مجھے اور بھی خوفناک لگا۔ شیطان میں بھی شاید تھوڑا بہت حلم ہو مگر اس شخص میں اس کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ ابنِ خلف اور ابولہب یہ سوچنے سے قاصر تھے کہ اُن کی دنیاوی اہمیّت تو شاید آخرت میں نہ منتقل ہو لیکن اُن کے وجود کا شاید کوئی حصّہ وہاں پہنچ جائے۔

میں جس جس کافر سے ملا ہوں اُس کی منطق میں، میں نے تکبرّ کی ایک جھلک ضرور دیکھی ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کی عزت و منزلت قلتِ فکر کی مرہونِ منّت ہے اور اس کی کج کلاہی محض اس کی کج فہمی پر قائم ہے وہ غیب پر یقین لانے کا تو اہل نہیں ہوتا تھا مگر دلیل یہ دیتا تھا کہ زندگی صرف یہاں کی زندگی ہے اور جو مر جاتا ہے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے۔ مرنے کے بعد اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس کی آخرت زیرِ زمین، ایک قبر ہے جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔

جولیس سیزر جیسے انسان نے بھی اپنی عظیم فتح کے دن قربان گاہ کے نزدیک کھڑے ہو کر یہی کہا تھا:

"موت ہر چیز کے خاتمے کا نام ہے!"

اس سوچ میں یہ تفاخر کار فرما ہے کہ انسان گویا اپنے وجود اور عدم وجود پر خود قادر ہے۔ اس میں زندگی سے بیزاری کی کیفیت بھی ہے جو خودکشی کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی روح کو خطرے میں ڈال سکتا ہے، اسے آلودہ کر سکتا ہے، اُس کی تذلیل کر سکتا ہے، اُسے سیاہ کر سکتا ہے لیکن اُسے مار نہیں سکتا ہر شخص اپنے اندر ایک ابدیت رکھتا ہے جس کو وہ جواب دہ ہے۔ یہ ابدیت اُس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے کیونکہ اسے قائم رکھنے کی ضمانت اللہ جلّ شانہٗ دیتا ہے۔ ادھر ابولہب اور اُبی بن خلف تھے کہ وہ ایک ہڈی کو چُورا کر کے مصلحتِ الٰہی اور تخلیقِ کائنات کے مقاصدِ جلیلہ کی نفی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس ماحول میں ہماری چھوٹی سی بے وسیلہ جماعت سب کے لئے تفریح اور استہزا کا سامان بنی ہوئی تھی۔ وہ ہمارا مذاق اڑاتے، ہم پر پھبتیاں کستے، ہمیں طعنے دیتے، ہمیں طنز و تشنیع کا نشانہ بناتے، ہم پر نفرتوں کی بوچھاڑ کرتے، ہم پر غلاظتیں پھینکتے اور ہماری باتوں کو شراب کے پیالوں میں غرق کرتے رہتے تھے۔ غلاظتیں دھل جاتی تھیں لیکن اپنے نبیِ مکرمؐ کی توہین ہمیں خون کے آنسو رُلاتی رہتی تھی۔ یہ ہماری برداشت سے باہر تھا کہ ایک شخص جو خالقِ ارض و سما کا محبوب ہو، فرشتے جس کا احترام کرتے ہوں، سارا مکہ جس کے حُسنِ اخلاق اور انصاف پسندی کا معترف ہو، چند راہ گم کردہ بندوں کے ہاتھوں رسوا ہو۔ ہمیں لگتا تھا کہ روشنی کی راہ میں کچھ حائل ہو گیا ہے لیکن رسولِ کریمؐ یہ سب کچھ نہایت صبر اور تحمل کے ساتھ سہتے رہتے تھے۔ صبر پیغمبروں کا ہتھیار بھی ہے اور اُن کی ڈھال بھی۔ یہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے۔ مجھ ناچیز کو یہ دعویٰ نہیں تھا۔ ایک دفعہ عکرمہ اور چھ اور آدمیوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔ سب میرے گرد کھڑے ہو گئے، ایک دائرے کی صورت میں۔ سب خاموش کھڑے مجھے گھورتے رہے، مجھ پر انگشت نمائی کرتے رہے، کوئی لفظ نہیں، کوئی آواز نہیں۔ سب کے چہروں پر ایک شرارت آمیز طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ میں خوف زدہ ہو گیا، پتہ نہیں اُن کا کیا ارادہ ہے۔ میں دائیں طرف مڑا تو بائیں طرف سے کسی نے میری پسلیوں میں انگلیاں چبھو دیں۔ اُدھر دیکھا تو دائیں طرف سے یہی حرکت ہوئی۔ چاروں طرف سے انگلیاں چبھنے لگیں تو میں اُن کے درمیان لٹو کی طرح گھومنے لگا۔ وہ قہقہے لگاتے رہے، میں اُن کے نرغے میں بے بس اُن کے اشاروں پر اِدھر اُدھر اچھلتا رہا۔ پھر مجھے اسی حالت میں چھوڑ کر سب ہنستے ہوئے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اُنھیں مجھ جیسے سابق غلاموں سے نمٹنا آتا تھا۔

اُن میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ اُن کے وہ خدا جن کے

نام سے وہ لرزہ براندام رہتے تھے محمدؐ پر کوئی عذاب نازل نہیں کر پا رہے تھے، جو علی الاعلان اُن کے منکر تھے۔ محمدؐ کی گفتگو میں ان خداؤں کے بارے میں بہت سے تضحیک آمیز پہلو نکلتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ بے خوف و خطر اپنے مشن کی راہ پر گامزن تھے۔ وہ کبھی کبھار سوچتے کہ شاید محمدؐ ہی ٹھیک کہہ رہے ہوں۔ شاید ان معبودوں کے بارے میں اُن کا عقیدہ درست نہ ہو لیکن اُن کے عمل میں اُن کی اس سوچ کی ہمیں کوئی شہادت نہ ملتی۔

آج میں سوچتا ہوں کہ کفارِ مکہ کی نفرت کا ایک جواز اور بھی تھا۔ یہ انسانوں کی بد نصیبی ہے جو تقریباً ایک کلئے حیثیت رکھتی ہے کہ جب اُن کے سامنے صداقت سر اٹھاتی ہے تو وہ اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اُس کا سر قلم کرنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں، جیسے اُن کے اندر کوئی عفریت داخل ہو گیا ہو۔ انسانوں کو حق کی پہلی جھلک ہمیشہ معاندانہ لگتی ہے۔ اُسے دیکھتے ہی اُن کے اندر نفرت کا ایک سیلاب اُمڈ پڑتا ہے اور وہ پاگلوں کی طرح اُس کی بیخ کنی کے لئے ٹوٹ پڑتے ہیں۔

ابتدائے انقلاب

ابو سُفیان، ابو لہب، اُمیہ، عُتبہ اور تمام مشرکینِ مکہ کا سرغنہ ابو جہل معمولی لوگ نہیں تھے۔ یہ سب نہایت سیانے، سنجیدہ لوگ تھے۔ انہیں ابتدا ہی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسلام کوئی عارضی، جزوقتی تحریک نہیں ہے بلکہ ایک انقلاب ہے۔ محمدؐ صرف اللہ ہی کا ایک نیا تصوّر لے کر نہیں آئے ہیں بلکہ وہ انسان کا بھی ایک نیا تصوّر پیش کر رہے ہے۔ اسلام اپنے نظامِ زکوۃ کی وجہ سے چھوٹی بڑی ہر جائداد اور ملکیت کے لئے ان کی نظر میں خطرہ تھا۔ جو صاحبِ نصاب ہیں وہ غریبوں کو اپنی دولت میں شریک کریں۔ یہ انقلاب نہیں تھا تو اور کیا تھا۔ اسلام غریبوں کی دادرسی پر ہی اکتفا نہیں کرتا تھا، اُن کے حقوق بھی جتاتا تھا۔ اسلام یہ بھی تسلیم نہیں کرتا تھا کہ حسب نسب کے اعتبار سے کچھ قبیلوں کو دوسرے قبیلوں پر پیدائشی برتری حاصل ہے۔ اسلام کا مساوات کا سبق عرب کی ساری معاشرتی اقدار کے لئے چیلنج تھا۔ عرب ایسے قوانین کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

ابو جہل نے کوشش کی، ابو سفیان اور ابو لہب نے بہت سر مارا کہ محمدؐ راہِ راست پر آجائیں۔ راہِ راست سے اُن کی مراد یہ تھی کہ وہ مشرکین کے نکتہ نظر کو تسلیم کر لیں اور اپنے دین کی اشاعت سے باز آجائیں۔ انھوں نے اُنہیں رشوت، منصب، اختیار، یہاں تک کہ کعبے کی آمدنی کا حصہ تک پیش کیا۔ وہ بے وقوف شاید یہ سمجھتے تھے کہ رسالت زمین سے نکلنے والی دھاتوں کے عوض خریدی جا سکتی ہے۔ سارے حربے بے اثر ہوئے اور ایک دن مکے کے طول و عرض میں محمدؐ کا یہ اعلان گونج اٹھا:

"اگر تم میرے دائیں ہاتھ پر سورج لا کر رکھ دو اور بائیں ہاتھ پر چاند تب بھی میں پیغامِ الٰہی کی تبلیغ سے باز نہیں آؤں گا"۔

ہر شخص اس اعلان کی بات کر رہا تھا۔ کوئی علی الاعلان اور کوئی سرگوشیوں میں اس بیان کی قطعیت پر تبصرہ کر رہا تھا۔ مشرکینِ مکہ نے جب محمدؐ کے منہ سے یہ الفاظ سُنے تو وہ ہکا بکا رہ گئے۔ اُن کو لگا جیسے ساری بساط ہی الٹتی جا رہی ہے۔ یہ کہتے ہوئے محمدؐ کو اُن پر ترس بھی آیا کہ وہ کیوں اس سادہ سی حقیقت کو سمجھ نہیں پا رہے۔ چلتے چلتے انھوں نے مشرکین سے یہ بھی کہا:

"اور تم اپنی اولاد کے قتل سے باز رہو!"

اولاد کے قتل سے کیا مراد ہے، یہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ دراصل محمدؐ کی تعلیمات نے گزشتہ تیس سال میں دنیا کو اس تیز رفتاری سے آگے بڑھایا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ ہم ابھی تک زمین پر کیسے موجود ہیں۔ زمانے کی برق رفتاری نے کرۂ ارض سے ہمارے پاؤں اکھاڑ کر ہمیں کسی اور سیارے پر کیوں نہیں پھینک دیا۔ اولاد کا قتل صرف تیس سال پرانی بات ہے لیکن محسوس یہ ہوتا ہے جیسے کسی صدیوں پرانے رواج کا ذکر ہو رہا ہو۔ جب نبیِ کریمؐ نے یہ الفاظ کہے تھے تو اُن کا بعینہٖ یہی مطلب تھا۔ اسلام سے پہلے صحرائے عرب میں بچے کے

مستقبل کا فیصلہ شکمِ مادر سے باہر آتے ہی ہو جاتا تھا۔ لڑکا ہے تو اُسے زندہ رہنے دیا جائے گا۔ اُس کی ولادت پر جشن ہو گا۔ لڑکی ہے تو مستقبل تاریک۔ اُس پر سرگوشیاں ہوں گی۔ اگر خاندان میں پہلے ہی لڑکیاں کافی ہیں یا قبیلے کے خیموں میں اُن کی خاطر خواہ تعداد موجود ہے تو نوزائیدہ لڑکی کو پیدا ہوتے ہی صحرا میں لے جایا جائے گا اور اُس پر ریت ڈال کر اُسے زندہ دفن کر دیا جائے گا۔

اُن کے پاس اس بہیمانہ رسم کے باقاعدہ جواز تھے۔

'ہم زندگی کو محفوظ رکھنے کے لئے زندگی کو ختم کرتے ہیں'۔

'لڑکیوں کا قتل دراصل صحرائی معیشت کا تقاضا ہے، اُن کا اپنا فیصلہ نہیں ہے'۔

'غربت میں بچی کو زندہ رکھنے کا مطلب یہی ہے کہ ایک بھوکے پیٹ کا اور اضافہ ہو گیا'۔

'لڑکی آبادی میں مزید اضافے کا باعث ہوتی ہے'۔

'ہم لڑکیوں کو قتل کر کے لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان اپنے خداؤں کے پیدا کئے ہوئے عدم توازن کو درست کرتے ہیں کیونکہ ہمارے یہاں لڑکے کم اور لڑکیاں زیادہ پیدا ہوتی ہیں'۔

اُن کی باتیں سُن کر دکھ ہوتا تھا۔ قدرت کے عملِ تخلیق کی اُن کے ذہن میں کوئی تقدیس نہیں تھی۔ کچھ اور برائیاں بھی تھیں اُن کے معاشرے میں مثلاً سود، جوا، شراب خوری، عورتوں کے بارے میں اُن کا غیر منصفانہ رویہ، غلاموں کے ساتھ انتہائی بہیمانہ سلوک، جانوروں سے بے رحمی کا برتاؤ وغیرہ۔ لیکن یہ برائیاں محض باہر سے آنے والوں کو نظر آتی تھیں۔ اہلِ مکہ کے مزاج میں یہ اس قدر راسخ ہو چکی تھیں کہ اُنھیں ان کے شر کا احساس تک نہیں تھا۔

لیکن اس حمام میں کچھ اور لوگ بھی ننگے تھے۔ جب عربستان میں محمدؐ مردوں اور عورتوں کو مساوات کی تعلیم دے رہے تھے تو انہی دنوں فرانس میں عیسائی بشپوں کی ایک کانفرنس ہو رہی تھی۔ اس کانفرنس میں زیرِ بحث موضوع یہ تھا کہ عورتیں روح رکھتی ہیں یا نہیں۔ یہ پتہ نہیں کہ بالآخر فیصلہ کیا ہوا۔ یہاں شام میں باتیں تو سب پہنچ جاتی ہیں لیکن تفصیلات نہیں ملتیں۔ پھر بھی اس ضمن میں، میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انسانی مذاہب میں خواتین کے بارے میں کیسے کیسے تضادات ملتے ہیں۔ ایک طرف تو عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریمؑ کی اتنی تعظیم اور دوسری طرف حواؑ کی دوسری بیٹیوں کے بارے میں یہ سوچ کہ پتہ نہیں ان کی روح بھی ہے یا نہیں۔ یہ نہیں سوچا جاتا کہ آخر یہ نسلِ انسانی کی مائیں ہیں۔

اُن کے خداؤں سے انکار پر بھی انہیں غصہ تھا۔ بچیوں کو زندہ درگور کرنے سے منع کرنے پر بھی وہ معترض تھے لیکن اب تو غصے کی ایک اور وجہ پیدا ہو گئی تھی۔ محمدؐ نے بیویوں کی تعداد محدود کر دی تھی۔ اب تک رواج یہ تھا کہ لوگ اپنی خواہش اور مالی وسائل کے مطابق جتنی چاہیں شادیاں کر لیتے تھے۔ بعض کے تو دس دس بیس بیس بیویاں بھی تھیں۔ اسلام نے بیویوں کو چار تک محدود کر دیا، جس فرمان کے تحت یہ تعداد مقرر ہوئی اُس کی رُو سے آسانیاں ایک ہی بیوی کے رکھنے میں تھیں۔ حکم یہ تھا کہ سب بیویوں کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھا جائے اور اُن کے حقوق کی ادائیگی میں کسی کو کسی پر فوقیت نہ دی جائے اور اگر مرد یہ نہ کر سکے تو پھر وہ ایک ہی بیوی رکھے۔

ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ جب عورتوں کو یہ اعزاز بخشا گیا تو وہ اس کا خیر مقدم کرتیں لیکن ہوا یہ کہ وہ بھی اللہ کے رسولؐ کے خلاف صف آرا ہو گئیں۔ گھر گھر بحث چھڑ گئی کہ اگر کسی کی چار سے زیادہ بیویاں ہیں تو جنہیں علیحدہ کیا جائے گا وہ کون ہوں گی۔ انہیں کون رکھے گا اپنے گھر۔ کون اُن کی کفالت کرے گا۔ کون اُن کی دیکھ بھال کرے گا۔ صحرائی زندگی میں کثرتِ ازواج کا رواج محض اس لئے نہیں تھا کہ مرد حریص تھے بلکہ اس لئے بھی کہ وہ فیاض تھے۔ یوں بیویوں کی تعداد پر پابندی کو شروع شروع میں عورتوں کے ساتھ زیادتی بلکہ سراسر ظلم کا نام دیا گیا۔

محمدؐ نے بات یہیں ختم نہیں کی بلکہ اُسے آگے بڑھایا کہ یہ فرمانِ الٰہی تھا۔ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ عورتیں ہر چند مردوں سے ہیئت میں مختلف ہیں، پھر بھی وہ مردوں کے برابر ہیں، اُن کے مساوی حقوق رکھتی ہیں۔ انہوں نے تعلیم دی کہ عورتیں مردوں کی زینت ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے محافظ اور نگہبان ہیں، دونوں کو آخرت میں اپنا اپنا حساب دینا ہے اور وہاں بھی دونوں کے ساتھ یکساں سلوک ہوگا۔

آج لوگ اِن سادہ اور منصفانہ خیالات پر محمدؐ سے محبت کرتے ہیں۔ اُس زمانے میں انہی باتوں پر لوگ اُن سے نفرت کرتے تھے۔ ایک دور ایک بات کا مذاق اڑاتا ہے، دوسرا اُسے قابلِ ستائش سمجھتا ہے۔ شاید اس لئے کہ پھل میٹھا ہونے سے پہلا کڑوا ہوتا ہے۔

میری دُعائیں

محمدؐ کے پیغام کے بارے میں کفّار کو اب کوئی غلط فہمی نہیں رہی تھی۔ جو تھوڑی بہت خوش فہمیاں تھیں، وہ بھی دور ہو چکی تھیں۔ قریش کے تمام سرداروں پر اس پیغام کے مضمرات آشکار ہو چکے تھے اور اب براہِ راست تصادم ناگزیر تھا۔ اسلام کا کلمہ لا الہ الا اللہ ایک انتہائی انقلابی نعرہ تھا۔ نہایت مختصر لیکن اتنا عمیق اور دوررس کہ اُس کی ضربِ کاری جاہلیت کی بنیادیں ہلانے کی طاقت رکھتی تھی۔ اس کلمہ پر ایمان رکھنے والا علی الاعلان پکار رہا تھا کہ اب اللہ وحدہ لاشریک کے علاوہ کسی کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا جائے گا۔ کوئی ایسا نظام، کوئی ایسی طرزِ معاشرت قبول نہیں کی جائے گی جو غیر اللہ کی ایجاد ہو۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی حاکمیت تسلیم نہیں کی جائے گی۔ تمام فوق الانسانی حقوق ختم کر دیئے جائیں گے۔ نسلی، قومی اور قبائلی وحدتوں کی روایات، پجاری اور جاگیردار طبقوں کی امتیازی مراعات اور خود ساختہ مفروضوں پر قائم تمام عظمتیں اور بالادستیاں مٹا کر قافلۂ انسانیت کو

اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اصولوں کے تحت فلاح وارتقا کی راہ پر گامزن کیا جائے گا۔

یہ ایک نظریۂ حیات تھا۔ ایک فلسفہ تھا جس کا جواب یہ ہونا چاہئے تھا کہ اس کے مقابلے پر ایک متبادل نظریہ پیش کیا جاتا اور دلائل سے اُس کی فوقیت تسلیم کرائی جاتی لیکن یہ نہ ہوا اور وہ زِچ ہو کر کھلم کھلا ظلم پر کمربستہ ہو گئے۔

رسول اللہؐ نے جب معاذ بن جبلؓ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تھا تو رخصت کے وقت انہیں سب سے بڑی نصیحت یہ کی تھی:

"معاذ! مظلوموں کی بددعا سے ڈرتے رہنا۔ یاد رکھنا کہ اُن کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہے"۔

لیکن ظالم شاید یہ نکتہ نہیں سمجھتے۔

آج میں ضعیف اور قریبِ مرگ ہوں لیکن آج بھی ظلم پر میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ مجھے ظلم سے بہت نفرت ہے۔ میں بلال جس نے بہتوں سے زیادہ ظلم سہے ہیں، ظلم سے محفوظ رہنے کے لئے دعائیں مانگتا رہتا ہوں۔ بلالِ حبشی کی یہ دُعا ہے:

"یا اللہ! ظالم کو مجبور کر دے کہ وہ اپنے آپ کو اُس بدن میں دیکھے جس پر وہ ظلم ڈھا رہا ہے"۔

'یا اللہ! غلط فیصلے کرنے والوں کو اپنے فیصلوں کے نتیجے خود بھگتنے پڑیں'۔

'یا اللہ! عدل چاہنے والے مجبور کل خود کرسیِ عدل پر متمکن ہوں'۔

'یا اللہ! کوئی منصف قانون کے معاملے میں من مانی نہ کرے کیونکہ دنیاوی قانون بھی تیری رحمت ہی سے بنے ہیں'۔

'یا اللہ! ہر ظالم کو اُس کے ظلم کی دہری سزا دے'۔

'یا اللہ! ظالم کو اُسی وقت سزا دے جب وہ ظلم کر رہا ہو'۔

ایک اور چھوٹی سی دُعا جو میں ہر رات سونے سے پہلے مانگتا ہوں میرا زندگی بھر کا وظیفہ ہے:

'یاباری تعالیٰ مجھ سے میری برائیاں دُور کر دے اور مجھے بُری عادتوں سے چھٹکارا دلا دے'۔

فجر کی اذان سے پہلے جب میں مسجدِ نبویؐ سے ملحق ایک چھت پر بیٹھا اذان کے وقت کا انتظار کیا کرتا تھا تو ہمیشہ یہ دُعا مانگا کرتا تھا:

'اے اللہ میں تیری حمد کرتا ہوں اور قریشِ مکہؔ کے بارے میں تجھ سے مدد مانگتا ہوں کہ وہ تیرے دین کو قائم کریں'

لیکن یہ مدینے کی دُعا ہے، اُس وقت مکےؔ میں تو ہر وقت میری یہی دُعا تھی کہ اللہ تعالیٰ قریش کو نیکی کی ہدایت دے اور وہ اپنے ظلم سے باز رہیں۔

پہلی ہجرت

اب تشدّد کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ پہلے سے کہیں زیادہ قساوت لئے ہوئے۔ قتل تک نوبت پہنچنے لگی۔ کوئی دن نہیں گزرتا تھا کہ ہم مسلمانوں پر کوئی نہ کوئی ظلم نہ ہوتا ہو۔ ہم جب آنحضورؐ کی طرف دیکھتے تو ہمیں لگتا تھا کہ چشمِ فلک اُن کی آنکھوں میں گریہ کناں ہے لیکن وہ جس راہ پر گامزن تھے اُسے چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ رضائے الٰہی یہی ہے کہ اُس کے پیغمبر سنگلاخ چٹانوں کو کاٹ کاٹ کر راستہ بنائیں اور اُن کی پیروی کرنے والے خون پسینے سے بنے ہوئے اس جادۂ پیمبری کو فلاح اور بہتری کا ایک آسان راستہ سمجھتے ہوئے، اُن کے نقشِ قدم پر چلتے جائیں۔ دنیا میں ایسے بہت سے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے بدی سے نفرت کی لیکن وہ بدی کا مقابلہ کرنے پر تیار نہ ہو سکے اور جان کی سلامتی کے لئے دنیا ہی تج بیٹھے۔ غاروں اور گپھاؤں میں جا بسے، جوگی اور راہب بن کر زندگی گزار دی۔ محمدؐ اُن میں سے نہیں تھے۔

اسلام کی راہ میں سب سے پہلے ایک خاتون نے شہادت پائی۔ اُسے اسی وقت جنت کی بشارت مل گئی جب ہمارے دشمنِ ازلی، ابو جہل نے جہالت کے جوش میں اس کی پسلیوں میں اپنا نیزہ گاڑ دیا تھا۔ اُس کا نام سُمیّہ تھا۔ سُمیّہ بنتِ خبّاط۔ عمّار کی والدہ سُمیّہ کا جرم یہ تھا کہ اُس نے ہبل کی پرستش سے انکار کیا تھا۔

اور بھی تھے جنھیں میدانوں میں کھمبے گاڑ گاڑ کر اُن کے ساتھ باندھا گیا اور کوڑے مار مار کر شہید کر دیا گیا یا ادھ موا کر کے سسک سسک کر مرنے کے لئے چھوڑ دیا۔

اب صورتِ حال اتنی بدل چکی تھی کہ کچھ کئے بغیر چارہ نہیں تھا۔ مسلمانوں کی صفوں سے ایک ایک کر کے کئی اہلِ ایمان رخصت ہو چکے تھے یا معذور کر دیئے گئے تھے۔ یہ محمدؐ کے لئے لمحۂ فکریہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے ایک بہت بڑا فیصلہ کیا۔ فیصلہ یہ تھا کہ جو لوگ کمزور ہیں اور جنہیں مکّے میں کسی کی پشت پناہی حاصل نہیں وہ ہجرت کر جائیں۔ صرف وہ رہ جائیں جنھیں خون خرابے کے ڈر سے کوئی ہاتھ لگانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ وہ جو کسی مکّی خاندان کے فرد تھے یا جنھیں مکّے کے کسی خاندان کی سرپرستی حاصل تھی محفوظ تھے، اس لئے کیونکہ اُن پر ہاتھ اٹھانے سے خاندانی بلکہ قبائلی محاذ آرائیوں کا خدشہ تھا۔ میں ابو بکرؓ کی سرپرستی میں تھا اس لئے مکّے میں رہ سکتا تھا۔

ایک مقرّرہ رات کو علیؓ کے بڑے بھائی جعفرؓ تراسی مردوں اور سترہ عورتوں کو لے کر صحرا میں نکل گئے۔ ان میں جعفرؓ کی بیوی اسماء بنت عمیسؓ بھی تھیں، سودا بنت زمعہؓ بھی اور مقداد بن اسودؓ، ابو عبیدہ بن جراحؓ جیسے عظیم صحابی اور ام المومنین خدیجہؓ کے بھتیجے خالد بن حزامؓ، حکیم بن حزام کے بھائی بھی شامل تھے۔ وہ مکّے سے ہجرت کر کے حبشہ جا رہے تھے۔ حبشہ سمندر پار میرے اجداد کا وطن تھا جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اُس ملک پر ایک عیسائی بادشاہ نجاشی کی حکومت تھی۔ نجاشی کے عدل کا دُور دُور شہرہ تھا۔ یہ چھوٹا سا قافلہ

جانے پہچانے راستوں سے ہٹ کر سفر کر رہا تھا کیونکہ قدم قدم پر دشمنوں سے خطرہ تھا۔ جو راستہ اُنھوں نے اختیار کیا تھا بڑی صعوبتوں کا راستہ تھا۔ اس پر نہ کنویں تھے نہ کوئی آبادی خالد بن حزامؓ تو راستے ہی میں انتقال کر گئے۔ ان مہاجروں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اُن کے سروں پر گِدھوں کے پروں کے علاوہ کسی چیز کا سایہ نہ تھا۔ یہ گدھ راستے بھر اُن کے سروں پر منڈلاتے رہے، اس آس پر کہ کب ان میں سے کوئی نڈھال ہو کر گرے اور اُن کا لقمہ بنے۔

ایسی بات چھپی کہاں رہ سکتی تھی۔ دن چڑھتے ہی خبر پھیل گئی۔ ابو جہل کے تن بدن میں آگ لگ گئی، اُس نے فوراً دارالندوہ میں اپنے حلیفوں کو اکٹھا کیا، انہیں غیرت دلائی اور بالآخر سب سے یہ طے کرا لیا کہ ولید بن عُتبہ کی قیادت میں گھڑ سواروں کا ایک دستہ اُن کے پیچھے بھیجا جائے جو انہیں گرفتار کر کے واپس مکّے لائے یا وہیں صحرا میں ختم کر دے۔
اس سے چند ماہ قبل بھی سترہ مسلمان ہجرت کر کے حبشہ جا چکے تھے۔ ان میں عثمانؓ، حضورؐ کی صاحب زادی رقیہؓ، ابو سلمہؓ، مصعب بن عمیرؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور زبیر بن العوام شامل تھے۔ اُس مرتبہ قریش نے اس مسئلے پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی بلکہ اسے ایک طرح سے اپنی کامیابی تصوّر کیا تھا۔ اب پورے ایک سو مسلمانوں کا یک بارگی اُن کے چنگل سے یوں نکل جانا اُن کی صریح شکست کے مترادف تھا۔

ولید اور اس کے گھڑ سواروں نے صحرا کا راستہ لیا اور کچھ دُور جانے کے بعد انہیں اُن کے قدموں کے نشان مل گئے بلکہ ایک میل تک تو وہ اُن کے متوازی چلتے رہے لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں تھا کہ اس کی راہ میں گھر بار چھوڑنے والے ایک سو نفوس موذیوں کے ہتھے چڑھ جائیں۔ ہوُا یہ کہ دشمنوں کے گھوڑے تک اُن کی خوشبو نہ پا سکے اور جعفرؓ اپنے چھوٹے سے قافلے کو دشمنوں کی تلواروں اور گھوڑوں کے سُموں سے محفوظ حفاظت کے ساتھ صحرا سے نکال لے گئے۔ اسے اگر معجزہ کہنا چاہیں تو کہہ لیجئے۔ میں تو اتنا

ہی کہوں گا کہ جعفرؓ صحرا کے چپّے چپّے سے واقف تھے۔ وہ صحرا کی ہر رمز جانتے تھے۔ اُس کی چندھیا دینے والی دھوپ کو، اُس کے چھوٹے بڑے، بنتے بگڑتے ریت کے ٹیلوں کو، ان ٹیلوں کے سایوں کو۔ جعفرؓ کا علم ہی اُن کا معجزہ تھا۔ اُن کے بارے میں مشہور تھا کہ صحرا میں جعفرؓ اپنے آپ کو اپنے سائے میں چھپا سکتے تھے۔ اس میں کلام نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جعفرؓ کو بڑی توفیق عطا کی تھی۔

بالآخر ولید اور اُس کے تھکے ہارے گھڑ سوار بے نیل و مرام مکّے واپس آگئے۔ اُن کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں اور سب اپنی ناکامی پر بے حد شرمسار تھے۔ اُن کی ناکامی سے ہماری ہمت بڑھی اور ہجرت کو ہم نے باقاعدہ اپنی حکمت عملی بنا لیا۔ دو دو چار چار کر کے قافلے صحراؤں کے نادیدہ راستوں پر چلتے چلتے حبشہ پہنچتے جاتے تھے، یہاں تک کہ ہمارے بہت سے ساتھی سمندر پار کر گئے۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ حبشہ میں بھی بہت محفوظ نہیں تھے۔

ابو جہل برابر اُن کے خلاف منصوبے بنا رہا تھا۔ سردارانِ قریش کے ساتھ مباحثے کرتا تھا۔ انہیں اکساتا تھا، غیرت دلاتا تھا۔ ابو جہل اور اس کے حلیفوں کو ہماری چھوٹی چھوٹی کامیابیاں گھُن کی طرح اندر ہی اندر سے کھائے جا رہی تھیں۔ ابو سفیان کا لہجہ اتنا دھیما پڑ گیا تھا کہ اُن دنوں اس کی گفتگو مشکل سے سنائی دیتی تھی لیکن جو کچھ سنائی دیتا تھا اس میں لفظوں کا وہی خوبصورت انتخاب، فقروں کی وہی چستی اور روزمرہ کا وہی دروبست ہوتا تھا جو اُس کی گفتگو کا خاصہ تھا۔ اُدھر ابو جہل تو غصے میں دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ اُس کے وقار کو دھچکا لگا تھا۔ مسلمانوں کی کامیاب ہجرتیں اُس کے لئے انا کا مسئلہ بن گئی تھیں۔ مسلمانوں کا اس طرح مکّے سے فرار ہو کر کسی ہمسایہ ملک میں جا بسنا اور وہاں کھلے بندوں دندناتے پھرنا مکّے کی تجارتی ساکھ کے لئے بھی اچھا نہیں تھا۔ چنانچہ ابو جہل نے ایک بار پھر دارالندوہ میں قریش کے سرداروں کو بلوایا اور یہ فیصلہ کروایا کہ اگر مسلمان صحرا اور سمندر میں گرفت سے بچ نکلے ہیں تو انہیں حبشہ جا کر پکڑا جائے جہاں وہ شاہ نجاشی کی پشت پناہی میں چین سے بیٹھے ہیں۔

نجاشی کا دربار

سردارانِ قریش نے یہ منصوبہ بنایا کہ شاہ نجاشی کے پاس ایک سفارتی وفد بھیجا جائے جو مسلمانوں کو واپس لائے۔ اِس وفد کی قیادت کے لئے انہوں نے قبیلہ سہم کے عمرو بن العاص کا انتخاب کیا کیونکہ وہ پہلے حبشہ ہو آیا تھا اور شاہ نجاشی اور اس کے چند جرنیلوں اور درباری عہدہ داروں سے اُس کے نجی مراسم تھے۔ چمڑے کی مصنوعات کی حبشہ میں بڑی پذیرائی تھی۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ عمرو رؤسائے مکّہ کی طرف سے نجاشی اور اس کے منصب داروں کے لئے چمڑے کے بیش بہا تحفے لے کر جائے۔ تمام شہر سے چمڑے کی بہترین مصنوعات خرید کر عمرو کے حوالے کی گئیں اور عمرو حبشہ روانہ ہو گیا۔

حبشہ پہنچتے ہی عمرو بن العاص نے ایک ایک کر کے سب منصب داروں سے ملاقات کی۔ ہر ایک کو بیش قیمت تحفے پیش کئے اور تحفہ دیتے وقت ہر ایک سے کہا:

"ہمارے شہر کے چند نادان نوجوانوں نے یہاں حبشہ میں پناہ لے لی

ہے۔ اُن میں مرد بھی ہیں عورتیں بھی ہیں۔ انہوں نے اپنا آبائی مذہب بھی چھوڑ دیا ہے، آپ لوگوں کا مذہب بھی اختیار نہیں کیا بلکہ اپنا ہی ایک الٹا سیدھا مذہب ایجاد کر لیا ہے جسے نہ آپ جانتے ہیں نہ ہم۔ مکے کے شرفا نے اس سلسلے میں مجھے آپ کے پاس بادشاہ سلامت سے یہ درخواست کرنے کے لئے بھیجا ہے کہ وہ انہیں واپس مکے بھجوا دیں۔ آپ سے میری اتنی التجا ہے کہ جب میں بادشاہ سلامت سے اُن کے بارے میں عرض کروں تو آپ بھی انہیں یہ مشورہ دیں کہ وہ انہیں ہمارے حوالے کر دیں اور اُن سے کوئی بات نہ کریں۔ ہم اُن کے عزیز ہیں۔ خود ہی انہیں سمجھا بجھا لیں گے"۔

سب نے عمرو کی درخواست مان لی۔ اب عمرو شاہ نجاشی کے تحائف لے کر دربار میں پہنچا۔ یہ تحائف منصب داروں کے تحائف سے کہیں زیادہ گراں قدر تھے۔ تحائف پیش کرنے کے بعد عمرو نے کچھ عرض گزارنے کی درخواست کی۔ اجازت ملنے پر اُس نے اپنا سلسلۂ کلام شروع کیا۔ اسی انداز سے جیسے اُس نے جرنیلوں اور درباری منصب داروں سے بات کی تھی:

"آپ کی سلطنت میں مکے سے آئے ہوئے مہاجرین کے قریبی عزیزوں نے، جو ہمارے شہر کے سربرآوردہ لوگ ہیں، آپ سے التجا کی ہے کہ حضور اُن کے عزیزوں کو اُن کے پاس واپس بھجوا دیں"۔

سب منصب داروں نے یک زباں ہو کر نجاشی کو مشورہ دیا کہ عمرو کی درخواست مناسب ہے، منظور فرمائی جائے کیونکہ یہ مسئلہ مہاجروں اور اُن کے قریبی عزیزوں کے درمیان ہے اور اُن کے اعزا ہی اس کی نزاکت کو سمجھ سکتے ہیں۔ بادشاہ نے اُن کا مشورہ پسند

نہیں کیا اور کہا:

"وہ ہماری پناہ میں ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ اُن کے اعتماد کو ٹھیس پہنچے۔ اگر اُن کے خلاف کوئی الزامات ہیں تو ہم چاہیں گے کہ انہیں بلوا لیا جائے تاکہ وہ اُن کا جواب دے سکیں۔ اگر الزام درست ثابت ہوئے تو انہیں واپس بھیج دیا جائے گا۔ اگر نہیں تو انہیں اجازت ہو گی کہ وہ جب تک چاہیں ہماری پناہ میں رہیں"۔

مسلمانوں کو دربار میں بلوانے کے احکامات دے دیئے گئے۔ مذہب کا معاملہ تھا اس لئے نجاشی نے اپنے بشپوں کو بھی بلوا لیا جو اپنی مذہبی کتابیں لے کر دربار میں پہنچ گئے۔ عمرو ہر قیمت پر یہ ملاقات رکوانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نجاشی کے اہلِ مکہ سے تجارتی اور سیاسی تعلقات ضرور تھے لیکن دل ہی دل میں وہ انہیں کفار اور بت پرستوں کے زمرے میں سمجھتا تھا۔ وہ ایک خدا کو ماننے والا تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کے تصورِ وحدانیت کی وجہ سے اُسے اُن سے ہمدردی پیدا ہو جائے۔

آج عمرو بن العاص کو ہم فاتحِ مصر کے لقب سے جانتے ہیں، اور اُن کے نام کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی کہتے ہیں۔ اُن دنوں میں وہ ایک ہوشیار، چرب زبان نوجوان تھا اور شاید یہی ضرورت سے زیادہ ہوشیاری اور چرب زبانی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اُس کی چالاکی اُس کے گلے کا ہار نہ بن جاتی تو سارے کے سارے مسلمان زنجیروں میں جکڑے مکے کے راستے پر ہوتے اور وہ خود دوزخ کا کندہ بنا ہوتا۔ ربِ کریم نے عمرو کو ناکام بنا کر اُس پر بڑی رحمت فرمائی۔

مہاجرین دربار میں داخل ہوئے تو پہلی ہی نظر میں وہ نجاشی کو اچھے لگے۔ اُن کے لباس کی سادگی، آداب کی شائستگی، چہروں پر نور، بردباری دیکھ کر پاکیزگی اور تقدس کا احساس

ہوتا تھا۔ اُن کے مقابلے میں عمرو کا انداز نجاشی کو کرخت، غیر مہذب بلکہ چھچھورا معلوم ہوا۔ عیسائی علماء کا بھی مسلمانوں کے بارے میں پہلا ردِ عمل یہی تھا۔ انہیں وہ اپنے جیسے لگے۔ صاحبِ ایمان اور تمام اہلِ قریش سے مختلف جن سے وقتاً فوقتاً ان کا سابقہ پڑتا رہتا تھا۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے تو نجاشی نے عمرو کو اشارہ کیا کہ وہ اپنے نکتہء نظر کی وضاحت کرے۔

عمرو بن العاص نے اپنے دلائل شروع کئے۔ اس کا بیان ختم ہوا تو نجاشی نے مسلمانوں سے سوال کیا کہ اس تقریر کے بعد کیوں نہ انہیں واپس مکےّ بھجوا دیا جائے۔ جعفرؓ کی اُس وقت وہ حالت تھی جو دانیال علیہ السّلام کی تھی جب اُنھیں شیروں کے پنجرے میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ بات کرنے لگے تو پہلے اُن کی زبان لڑکھڑائی، پھر لفظ ٹوٹنے لگے۔ سلسلہء کلام جاری رکھتے ہوئے ذرا آگے بڑھے تو ٹھوکر لگ گئی۔ یوں لگتا تھا کہ حالات اُن کا ساتھ نہیں دے رہے۔

اُدھر عمرو تھا کہ ہر بات کی تردید کر رہا تھا۔ دلائل پر دلائل دیے جا رہا تھا۔ غصےّ سے اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ اُس نے جعفرؓ کو بھگوڑا اور غدار کہا۔ اُن پر الزام لگایا کہ اُنھوں نے نعوذ باللہ ایک جھوٹے نبی کا بہانہ تراش کے مکےّ کے سماجی نظام کو درہم برہم کر دیا ہے اور تان یہاں توڑی کہ یہ مسلمان جس مذہب کی پیروی کرتے ہیں وہ شروع سے آخر تک ایک لایعنی اور نامعقول مذہب ہے۔ عمرو تھا تو بُت پرست مگر اُس نے انجیل کا سبق بہت اچھا یاد کر رکھا تھا۔ عیسائی مذہب سے واقفیت اور اپنے طنز و استہزا کی صلاحیت سے اُس نے سماں باندھ دیا۔ اس کے ہر دوسرے تیسرے فقرے پر دربار قہقہوں سے گونج اٹھتا تھا۔

ہوشیاری اور حماقت دونوں اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں اور کبھی کبھی یہ دونوں باتیں ایک ہی انسان میں بھی مل جاتی ہیں۔ عمرو کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اُس کی فتح ہی اُس کی

شکست ثابت ہوئی مگر آج جادۂ تاریخ کے دوسرے سرے پر بیٹھے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُس کی شکست ہی اُس کی فتح ثابت ہوئی۔

ہوا یوں کہ جعفرؓ نے عیسیٰ علیہ السلام کا بیان شروع کیا۔ بالکل اُس انداز سے جیسے ہم مسلمانوں کی تعلیم ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام نبیوں کے سلسلے کے ایک نبی تھے جو خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰؐ سے پہلے تشریف لائے تھے۔ اُن کے پیروکار اُن سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اتنی محبت کہ اُنھوں نے غلطی سے اُنھیں اپنا معبود بنا لیا اور اُن کی عبادت کرنے لگے۔

حبشہ میں بھی عیسیٰ علیہ السّلام کے لئے دلوں میں اتنی محبت تھی کہ اُن کا نام آتے ہی نجاشی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ عمرو نے بھی یہ آنسو دیکھے لیکن اُن کو محض آنکھوں کی چمک سے تعبیر کیا۔ جعفرؓ نے مجھے بتایا کہ اُن کا بیان سنتے ہی عمرو نے اپنی عبا کو ایک جھٹکے سے درست کیا اور اس طرح قدم گاڑ کر کھڑا ہو گیا جیسے کوئی لکڑہارا کلہاڑی کے وار سے پہلے پینترا جماتا ہے۔ یہ موقع تھا عمرو کو اپنی آخری حجت پیش کرنے کا جو اُس نے نہایت حتمی اور فیصلہ کن انداز میں پیش کی:

"یہ لوگ آپ کے پیغمبر کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ وہ دوسرے پیغمبروں کی طرح کے ایک پیغمبر تھے۔ یہ لوگ انھیں خدا کا بیٹا بھی تسلیم نہیں کرتے۔ آپ نے خود سُنا ہے کہ یہ اُن کی معبودیت سے منکر ہیں اور یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ شہید نہیں ہوئے تھے۔"

کتنی مہارت رکھتا تھا بتوں کا یہ پجاری! کتنا عبور تھا اُسے دونوں مذاہب کے عقائد پر اور کتنی چابک دستی سے اُس نے عیسیٰ علیہ السّلام کے بارے میں اختلافات اور تضادات کو

سامنے لا کھڑا کیا اور انہیں ہوا دے کر فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ بادشاہ نے جعفرؓ کی طرف دیکھا اور کہا:

"بتاؤ، حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے بارے میں تمہارا کیا عقیدہ ہے؟"

یہ کہتے ہوئے اُس نے ہاتھ کے اشارے سے محافظوں کو کہا کہ وہ جعفر کو آگے لے آئیں لیکن جعفرؓ اشارہ دیکھتے ہی خود محافظوں کے درمیان سے نکل کر آگے آ گئے۔

"قرآنِ حکیم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو تحریر ہے وہ میں پیش کر دیتا ہوں اس کے علاوہ مجھے کچھ علم نہیں"۔

جعفرؓ نے جب بادشاہ کو ہمہ تن گوش دیکھا تو ان کی آواز مزید بلند ہوئی۔ اُن کی واحد امید یہ تھی کہ وہ حاکمِ وقت کو، اُس کے وزیروں، حواریوں، درباریوں کو، عمرو بن العاصؓ کو، بادشاہ کے عالی شان تخت کے دونوں طرف پتھر کے بنے ہوئے چار دھاڑتے ہوئے شیروں کے مجسموں کو، سب کو سنائیں کہ اللہ تعالیٰ اس بارے میں کیا ارشاد فرماتا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جعفرؓ نے آیاتِ قرآنی اس خوب صورتی سے ادا کیں کہ بلال یاد آ گیا۔ یہ مجھے اس واقعے کے دس سال بعد خود عمرو بن العاص نے کہا تھا۔ بہر کیف میں اس تقابل کی معافی چاہتا ہوں۔ بلال تو محض ایک نقارہ ہے، اہلِ ایمان کو نماز کے لئے بلانے والا مؤذن جسے اپنی آواز دور تک پہنچانے کے لئے ایک بلند جگہ مہیا کی جاتی ہے۔ ویسے عمرو کی گفتگو اب تک ویسی ہی لچھے دار ہے۔

میں نے اور لوگوں سے بھی سُنا کہ اُس روز جعفرؓ کی آواز بڑی اثر انگیز تھی۔ انہوں نے سورۂ مریم کی آیات کی تلاوت کی تو محفل پر سحر چھا گیا۔ دربار کا ہر فرد حیرت زدہ، مبہوت، جعفرؓ کے مُنہ سے نکلتے ہوئے ایک ایک لفظ کو غور سے سُن رہا تھا۔ عیسائی علماء کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ انہوں نے ہر لفظ کو اُس کے معنی اور سیاق و سباق کے لحاظ سے اس حسن اور اعتماد

سے ادا کیا کہ واقعی محسوس ہونے لگا یہ اللہ جل شانہٗ کے الفاظ ہیں۔ وہ جو وحدہٗ، لاشریک ہے!

اور کتاب میں مریم کا بھی ذکر کرو،
جب وہ اپنے خاندان سے الگ ہو کر
ایک مشرقی مکان میں چلی گئیں
اور اپنے لوگوں سے پردہ کر لیا
تو ہم نے اُن کے پاس
انسان کی شکل میں ایک فرشتہ بھیجا۔
جب مریم نے اُسے دیکھا
تو بولیں اگر تو خدا ترس ہے
تو میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔
فرشتے نے کہا:
میں اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ہوں
کہ تمہیں ایک پاکیزہ بیٹا دوں۔
مریم نے کہا:
میرے یہاں بیٹا کیسے ہو سکتا ہے،
مجھے تو آج تک کسی انسان نے چھوا بھی نہیں
اور میں بدکار بھی نہیں ہوں۔
فرشتے نے کہا:
یوں ہی ہو گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے
اُس کے لئے سب کچھ آسان ہے

اور وہ بچے کو اسی صورت میں پیدا کرے گا۔
تاکہ اُسے لوگوں کے لئے
اپنی نشانی اور رحمت بنائے
اور یہ سب طے ہو چکا ہے۔

ہر آنکھ سے آنسو رواں تھے اور خاموشی ایسی کہ دلوں کی دھڑکنیں سنائی دے رہی تھیں۔ جب ان آیات کا ترجمہ سنایا گیا تو سب پر دوبارہ رقت طاری ہو گئی۔ نجاشی اپنے تخت سے اٹھا اور اُس نے جعفرؓ کو گلے لگالیا۔

بادشاہِ وقت کے بازو اُن کے گرد حمائل تھے۔ اور عمرو تھا کہ انہیں زنجیریں پہنانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

"ہم سونے کے پہاڑ کے عوض بھی تمہیں اہلِ مکہ کے حوالے نہیں کریں گے"

یہ کہہ کر نجاشی نے اپنی چھڑی کی نوک سے فرش پر ایک لکیر کھینچی اور اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"قرآن اور انجیل کا فرق اتنا ہی باریک ہے، آپ لوگ جب تک چاہیں یہاں رہیں"۔ یہ کہہ کر بادشاہ نے عمرو کے تحائف اُسے لوٹا دئے۔

عمرو آخر عمرو تھا۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی اُس نے ہار نہیں مانی۔ ڈھٹائی کے ساتھ بادشاہ کی طرف مسکرا کر دیکھتا رہا گویا یہ سب کچھ محض ایک کھیل تھا، ایک جوُا تھا جس میں اُس کا پانسہ ذرا غلط پڑ گیا تھا۔

یہ تھا حبشہ، شیروں کا مسکن، شہد کا منبع اور انصاف کا گھر، میرے اجداد کا وطن لیکن مکہ قافلوں اور تاجروں کا شہر تھا۔ یہاں کی ترازوؤں میں انصاف نہیں ریشم، مصالحے اور خوشبوئیں تلتی تھیں۔ آیاتِ الٰہی اُن کے پاس بھی پہنچی تھیں لیکن اُن کے ذہنوں نے انہیں قبول نہیں کیا۔ اُن کے کان اُنھیں سنتے تھے مگر اُن کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے تھے۔

معاشرتی مقاطعہ

اب اذیتوں کا ایک نیا دور شروع ہوا جو کوڑوں سے کہیں زیادہ اذیت ناک تھا۔ یہ ایک اجتماعی سزا تھی۔ محمدؐ کے سارے خاندان یعنی بنو ہاشم کے سب افراد کو شہری زندگی سے خارج کر دیا گیا۔ یہ محض ایک معاشرتی مقاطعہ نہیں تھا، اللہ کی زمین پر ایذا رسانی کی ایک انتہائی ہولناک صورت، انسان پر انسان کے ظلم کی ایک بدترین مثال تھی۔ بنو ہاشم سے ہر قسم کا لین دین، شادی بیاہ ممنوع کر دیا گیا۔ کوئی ان کو مہمان نہیں ٹھہرا سکتا تھا، کسی صورت میں ان کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ نہ روپے پیسے کی صورت میں، نہ جنس اجناس کی صورت میں، نمک اور شکر کی چٹکی بھی اُنہیں نہیں دی جا سکتی تھی۔ یہاں تک کہ کوئی انہیں سایہ تک مہیا نہیں کر سکتا تھا۔ غرض یہ کہ انہیں ذات، قبیلہ، برداری، تجارت، دوستی، مروت، رواداری ہر تعلق سے خارج کر کے بے یارو مددگار سپردِ صحرا کر دیا گیا تھا۔ انہیں صرف اتنی رسد لے جانے کی اجازت تھی جو وہ اپنی پیٹھ پر لاد کر لے جا سکیں۔ اس فیصلے کا اطلاق بنو ہاشم

کے ہر فرد پر ہوتا تھا۔ اس کے لئے محمدؐ کے پیغام پر اعتقاد رکھنا یا نہ رکھنا، اُن کی باتیں سننا یا نہ سننا، اُن کو پسند کرنا یا نہ کرنا ضروری نہیں تھا۔ حضورؐ کے ساتھ سب کو سزا دی گئی تھی اور سزا کے لئے اتنا ہی جُرم کافی تھا کہ وہ اُن کے اہلِ خاندان ہیں۔ یہاں تک کہ عم زاد کا عم زاد بھی مستثنیٰ نہیں تھا۔ سب کو یوں صحرا میں دھکیل دیا گیا تھا جیسے وہ چھوت کے کسی خوف ناک مرض میں مبتلا ہوں۔ بنو مطلّب نے اس اقدام کی مخالفت کی تو اُنہیں بھی اس مقاطعے میں شامل کر دیا گیا۔ صرف ابو لہب، بنو ہاشم ہونے کے باوجود اس سے مستثنیٰ تھا کیونکہ وہ علی الاعلان پیغامِ رسالت کا منکر تھا۔ مقاطعے کے اعلان کے فوراً بعد جب محمدؐ اور خدیجہؓ بنو اسد کا خاندانی مکان چھوڑ کر بنو ہاشم کے محلے میں اُٹھ آئے تو ابو لہب کو اُن کی ہمسائیگی اس درجہ ناگوار گزری کہ اُس نے اپنی بیوی امِ جمیل سمیت مکے کے کسی اور محلے میں رہائش اختیار کر لی جہاں اُس نے پہلے ہی سے ایک گھر خرید رکھا تھا۔

مقاطعے کے ختم ہونے کی شرط یہ تھی کہ یا بنو ہاشم خود محمدؐ کا مقاطعہ کریں یا محمدؐ رسالت کے دعوے سے باز آجائیں۔

مشرکین کی سوچ یہ تھی کہ اسلام کو صحرا کے حوالے کر دیا جائے جہاں وہ اپنی تمام جزئیات سمیت سورج کی ہولناک تپش میں جل بھن کر اپنی موت خود مر جائے۔ اس حکمتِ عملی کی ایجاد کا سہرا ابو جہل جیسے سازشی دشمن کے علاوہ کس کے سر ہو سکتا تھا۔ اُسی نے یہ منصوبہ بنایا، اُسی نے قریش کے سرداروں کا اجتماع کیا، اُسی نے اس کے حق میں دلائل دے کر سب کو قائل کیا اور آخر کار چالیس سرداروں کے دستخط سے یہ معاہدہ طے پا گیا۔ سب سردار اس کے حق میں نہیں تھے مگر ابو جہل کے جوش و خروش کے آگے سب نے اپنے اپنے اعتراض واپس لے لئے، سوائے بنو مطلّب کے جن کو بنو ہاشم کے ساتھ ہی شاملِ سزا کر دیا گیا۔ یہ تھا سفارتِ حبشہ کی ناکامی پر ابو جہل کا ردِ عمل!

اس دو سال سے زیادہ کے عرصے میں ہم پر جو گزری وہ ہم جانتے ہیں یا ہمارا اللہ۔ ہم نے بھوک اور صحرا کی پیاس برداشت کی۔ خاردار جھاڑیوں کے پیچھے عارضی پناہ گاہوں میں وقت گزارا۔ دن کی تپش سے بچے ہلاک ہوئے تو رات کی سردی میں کئی ضعیفوں نے جان دے دی۔ قدم قدم پر مشکلات کا سامنا تھا۔ آسمانوں سے ہم پر موسیٰ علیہ السلام کی امت کی طرح کوئی من و سلویٰ نہیں اترتا تھا لیکن ہم نے حوصلہ نہ ہارا اور ہر اذیت برداشت کرتے رہے۔ اس برداشت میں بھی ہمارے لئے سبق تھا کہ اگر صعوبتیں بالکل ہی انسان کی کمر نہ توڑ دیں تو وہ آزمائش سے مضبوط تر ہو کر اُبھرتا ہے۔ ہمارے لئے یہ سبق شاید من و سلویٰ سے بھی بہتر تھا۔

حمزہؓ

جب ہم شہری زندگی سے کٹ کر وقت گزار رہے تھے تو ہمیں مکے کی بہت کم خبریں ملتی تھیں۔ چھپے چوری کسی سے مل لیتے تھے تو پتہ چلتا تھا کہ مکے میں جہاں ہمارے خلاف کئی محاذ قائم تھے، وہاں اکا دکا آوازیں ہمارے حق میں بھی ابھرتی رہتی تھیں۔ بہت نحیف، بہت کمزور مگر اُن کا وجود ضرور تھا۔ کسی گلی کے موڑ پر، کسی بازار کوچے میں، کوئی نہ کوئی ہماری بے بسی کا رونا بھی رو لیتا تھا۔ کہیں کہیں لوگ دبی زبان میں اس مقاطعے پر نکتہ چینی بھی کر لیتے تھے۔ تھوڑی دیر کو ڈھارس بندھ جاتی تھی مگر ابھی ہم پر بہت عذاب آنا تھے۔ سختیوں کی انتہا ابھی باقی تھی۔ نئے حادثات، نئی مشکلات ہماری منتظر تھیں لیکن اس عرصے مین ہمیں حمزہؓ اور عمرؓ کی وجہ سے بڑی تقویت رہی۔ دونوں مقاطعے سے چند روز پہلے اسلام لے آئے تھے۔ ایک اور جھونکا تھا ٹھنڈی ہوا کا جو آتا تھا تو ہمارے دل و دماغ کا ایک ایک گوشہ کھِل اٹھتا تھا۔ یہ وحیِ الٰہی تھی جو ہمارے نبیؐ پر وقتاً فوقتاً نازل ہوتی رہتی تھی اور ہمیں احساس

دلاتی رہتی تھی کہ وہ جو ساری قدرت، ساری طاقت، سارے اختیار کا مالک ہے ہمارے ساتھ ہے۔ وہ جب ہماری اِس التفات سے نشوونما کر رہا ہے تو پھر ہمیں کیا غم۔ کوئی انسانی طاقت، کوئی بشری سازش ہمارے راستے کی دیوار نہیں بن سکتی۔ جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ اگر اُس نے کرۂ ارض پر اپنی مشیّت کے مطابق نظام قائم کرنے کے لئے ہم کو منتخب کر ہی لیا ہے تو اُس کے فیصلے پر عمل ہو کر رہے گا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ حمزہؓ اور عمرؓ دونوں کے اسلام لانے کے موقع پر بات غصے سے شروع ہوئی اور دونوں مرتبہ خون بھی بہا۔ حمزہؓ نے پہل کی۔ حمزہؓ رسالت مآبؐ کے چچا بھی تھے اور دودھ شریک بھائی بھی۔ بہت لحیم شحیم، قوی الجثّہ۔ سارے عربستان میں شیروں کے شکاری کی حیثیت سے اُن کا ڈنکا بجتا تھا۔ شجاعت اور علم حرب میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ کوئی تلوار اُن کی تلوار سے زیادہ وزنی نہیں تھی، نہ کوئی نیزہ اُن کے نیزے سے زیادہ تیز رفتار۔ اُن کی کمان سے نکلا ہوا ہر تیر، تیر قضا تھا۔

شکار میں کوئی اس شیروں کے شکاری سے زیادہ شجیع اور تیز نظر رکھنے والا نہیں تھا۔ قوتِ شامہ کا یہ عالم تھا کہ ہوا کو سونگھ کر جانور کا محلّ وقوع بتا دیا کرتے تھے۔ زمین پر پاؤں اتنے ہلکے پڑتے تھے کہ چاپ نہیں سنائی دیتی تھی۔ شجاعت اور قوت کے اس عظیم پیکر کی زندگی کا ایک اور رُخ بھی تھا۔ وہ نہایت مرنجاں مرنج، خوش مزاج، نرم خو اور حساس طبیعت تھے۔ گھوڑے پر جاتے جاتے سامنے کسی جھاڑی پر کوئی پھول کھلا دیکھتے تو اس خیال سے کہ وہ روندا نہ جائے، گھوڑا اس کے گرد گھما کر لے جاتے۔ کبھی کبھی رزمیہ شاعری بھی کرتے تھے جو اُن کی شخصیت سے بہت مناسبت رکھتی تھی۔

لیکن اُس دن جب ابو جہل نے کوہِ صفا کے دامن میں محمدؐ کو جھوٹا، دغاباز اور جانے کیا کیا کہا تھا، خوش مزاج حمزہؓ سے کوسوں دور تھی۔ حمزہؓ صحرا سے شیر کا شکار کر کے لوٹ

رہے تھے۔ ایک مُردہ شیر اُن کے گھوڑے پر بندھا ہوا تھا۔ مکّے میں داخل ہوتے ہی انہیں ابو جہل کی ہرزہ سرائی کی خبر ملی۔ اُسی حالت میں گھوڑے پر سوار ابو جہل کے پاس پہنچے۔ جو اب حطیم میں اپنے حواریوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ابو جہل اُن کے تیور دیکھ کر بھی صورتِ حال کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکا۔ جب حمزہؓ نے اُسے للکارا اور پوچھا کہ تم کیا کہہ رہے تھے محمدؐ کو، تو اُس نے جو کچھ کہا تھا من و عن دہرا دیا۔ بس پھر ایک آواز آئی۔ حمزہؓ کی کمان کی جو انہوں نے ابو جہل کے سر پر ماری تھی۔ ابو جہل کا چہرہ خون سے لت پت ہو گیا اور وہ ضرب کی تاب نہ لاتے ہوئے تیورا کر زمین پر گر پڑا۔ حمزہؓ سے بدلہ لینے کی اُس میں جرأت نہ تھی۔ صرف دانت پیس کر رہ گیا۔ حمزہؓ شاعر ضرور تھے مگر بحث مباحثے میں پڑنا اُن کی عادت نہیں تھی۔ بہت مختصربات کرتے تھے۔ انہوں نے کعبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"جب میں راتوں کو کھلے آسمان تلے، صحرا کی وسعتوں میں شکار کی تلاش میں پھرتا ہوں تو میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اللہ کسی کمرے میں بند نہیں ہے"۔

یہ کہہ کر وہ گھوڑے سے نیچے اُتر آئے اور زمین پر پاؤں گاڑ کر سب کے چہروں پر نظر دوڑائی جو یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے:

"میرے بھتیجے کا مذہب میرا مذہب ہے، اُس کا اللہ میرا اللہ ہے۔ کسی میں ہمت ہے تو مجھ پر ہاتھ اٹھائے"۔

کس میں جرأت تھی کہ اُس بپھرے ہوئے شیر کے مقابلے پہ آتا۔ ہجوم میں حرکت ضرور ہوئی لیکن اس لئے کہ ہر شخص جلد از جلد حمزہؓ کے راستے سے ہٹ جانا چاہتا تھا۔ حمزہؓ وہاں سے سیدھے رسولِ کریمؐ کے پاس گئے اور اسلام لے آئے۔

ابو جہل کی بدبختی کا ایسا ہی ایک منظر کچھ دنوں بعد دوبارہ دیکھنے میں آیا۔ بنو ہاشم کے معاشرتی

مقاطعے کے ابتدائی ایام تھے۔ مقاطعے پر عمل شروع ہو چکا تھا لیکن مقاطعے کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ اس پر پوری طرح عمل درآمد ممکن نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ بنو ہاشم کے یہاں بیاہی ہوئی خواتین اپنے آبائی خاندانوں کی افراد بھی تھیں اور اس حیثیت میں اُن پر اصولاً بنو ہاشم کے معاشرتی مقاطعے کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک دن بنو اسد کے حکیم بن حزام جو مولودِ کعبہ تھے ایک غلام سے آٹے کی بوری اُٹھوائے محلہ بنو ہاشم کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں ابو جہل نے اُنہیں دیکھ لیا اور لگا واہی تباہی بکنے۔

"یہ اناج ہمارے دشمنوں کے گھر نہیں جا سکتا" وہ غصے سے بولا

اسی موقعے پر بنو اسد کا ایک اور فرد ابوالبختری اُدھر آنکلا۔ گو وہ بھی مسلمان نہیں تھا لیکن معاملے کی نوعیت جاننے کے بعد اُس نے ابو جہل سے کہا:

"ابن ہشام، حکیم بنو اسد کا فرد ہے اور اپنی پھوپھی کا سامان لے کر جا رہا ہے۔ تم کون ہوتے ہو اُسے روکنے والے"۔

بات اصول کی تھی مگر ابو جہل کی خردماغی کو پسند نہ آئی۔ تلخ کلامی بڑھی تو بات ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ ابو جہل نے پہل کی۔ ابوالبختری نے سڑک کے کنارے پڑی اونٹ کی ایک بڑی ہڈی اُٹھا کر ابو جہل کے سر پر دے ماری۔ ابو جہل چکرا کر گر پڑا۔ اُس کے گرتے ہی ابوالبختری نے اُسے پے در پے ٹھوکریں مارنی شروع کر دیں۔ میں یہ سارا تماشا گلی کی نکڑ سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ دیکھتی آنکھوں سے نہ دیکھنے والے یہ کیسے لوگ ہیں جو اپنے اعتقادات کی کم مائیگی اور بے بضاعتی کو جانتے ہوئے بھی راہِ فلاح اختیار نہیں کرتے اور محض چند ذاتی مفادات کی خاطر ایک ایسے شخص کی زندگی اجیرن کئے ہوئے ہیں جس کی شرافت، نجابت، دیانت اور امانت کے وہ قائل بھی ہیں۔ انہیں خیالات میں غلطاں تھا تو دیکھا حمزہؓ چلے آرہے ہیں۔ اُنہوں نے شاید مجھے نہیں دیکھا اور سیدھے اُدھر کا رُخ کیا جہاں ابو جہل،

ابوالبختری کے مکوں اور ٹھوکروں کی زد میں زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ حمزہؓ کو دیکھ کر ابوالبختری نے ہاتھ روک لیا اور بغیر مزید کچھ کہے سُنے وہاں سے چل دیا۔ حمزہؓ نے ابو جہل پر ایک نظر ڈالی۔ میں بھی پہنچ گیا اور میں نے غلام کو آٹے کی بوری اُٹھوائی۔ حمزہؓ اور حکیم دونوں ابو جہل کو اُسی حالت میں چھوڑ کر چل دیئے اور میں اور غلام دونوں اُن کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ کچھ فاصلے پر جا کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ابو جہل ایک بڑے سے پتھر کے سہارے آہستہ آہستہ اُٹھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور انتہائی بے بسی کے عالم میں ہماری سمت تکے جا رہا تھا۔ اُس دن بھی کم وبیش وہی منظر حمزہؓ کے سامنے تھا جو اپنے قبولِ اسلام کے دن اُنہوں نے حطیم میں دیکھا تھا۔

ابنِ خطّاب

حمزہؓ کے اسلام لانے کے بعد ابو جہل، ابو لہب، اُمیہ، عتبہ سب لوگ سناٹے میں آ گئے تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب مسلمانوں سے کیسے نمٹا جائے۔ بازار میں بھی جہاں دو آدمی کھڑے ہوتے گفتگو کا موضوع یہی ہوتا کبھی بآوازِ بلند، کبھی سرگوشیوں کے انداز میں۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ حمزہؓ سے ٹکر لے۔ تین روز ہو چکے تھے حمزہؓ کو اسلام لائے۔ ہمارے لئے یہ سکون کے دن تھے۔ یہ تو ہمیں پتہ تھا کہ یہ دور رہے گا نہیں۔ ہمارے دشمن ضرور کوئی نہ کوئی چال سوچ رہے ہوں گے مگر فی الوقت طوفان تھم گیا تھا۔ اگر کوئی رلہ میں مل بھی جاتا تو طرح دے جاتا، منہ پھیر لیتا، ناک بھوں چڑھا لیتا مگر کہتا کچھ نہیں۔

غموں پر غم سہنے کی تو ہمیں عادت سی ہو گئی تھی مگر خوشی پر خوشی ہمارے لئے نئی بات تھی۔ ابھی ہم حمزہؓ کے قبولِ اسلام پر اللہ تعالیٰ کا شکر ہی ادا کر رہے تھے کہ مکّے کی گلیوں میں ایک شخص نظر آیا۔ آنکھوں میں خون اُترا ہوا، ہاتھ میں ننگی تلوار لہراتا، اسلام اور

رسول اسلامؐ کے خلاف زہر اگلتا۔ وہ اعلان کر کے آیا تھا کہ آج وہ ایک ہی ضرب میں قریش مکہ کی ساری پریشانیاں دور کر دے گا۔ یہ مہم جو نوجوان اتنا طویل القامت تھا کہ کھڑے کھڑے اُچھل کر گھوڑے پر سوار ہو جاتا تھا۔ مزاج سنجیدہ مگر غصیلا۔ پیشہ باز نطین سے پتھروں اور مصالحوں کی تجارت، عمر چھبیس سال، نام عمر ابن خطاب۔

جس وقت یہ نوجوان مکے کی گلیوں سے گزر رہا تھا، رسول اللہؐ دارِ ارقم میں تھے۔ ابو قُبیس کی پہاڑی کے دامن میں، حرمِ کعبہ کے نزدیک، ارقمؓ کا گھر کچھ عرصے سے ہماری مسجد بھی تھا، ہماری پناہ گاہ بھی۔ چند صحابہ حضورؐ کے ساتھ بیٹھے تھے۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا کہ مجھے وہ نظر آیا۔ اُس کی اسلام دشمنی کے تو ہم پہلے ہی کئی وار سہہ چکے تھے۔ اس وقت اُس کے یہ تیور دیکھے تو میں نے فوراً رسول اللہؐ کو مطلع کیا۔ میرا خیال تھا وہ یہ خبر سنتے ہی فوراً کچھ حفاظتی انتظامات کا حکم دیں گے مگر انھوں نے نہایت دھیرج سے جواب دیا:

"عمر کے مجھ تک پہنچنے کے وقت کا انتخاب اللہ تعالیٰ کرے گا"۔

میں پھر دوڑ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ وہ تلوار لئے چلا آرہا تھا، سیدھا ہماری طرف۔ میں نے عرض کی:

"یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے وقت کا انتخاب کر دیا ہے۔ عمر آگیا ہے"۔

یہ سن کر حمزہؓ نے کہا:

"آنے دو۔ اگر نیک نیتی سے آیا ہے تو خیر ورنہ اُسی کی تلوار سے اُس کا سر قلم کر دیا جائے گا"۔

سب لوگ چوکنے ہو کر بیٹھ گئے۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ چولہے پر ایک دیگچا رکھا تھا جس میں پانی کھول رہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اگر خدانخواستہ ضرورت پڑی تو شاید یہ بھی کام آجائے۔ ویسے مجھے ہی نہیں ہم سب کو حمزہؓ کی موجودگی سے بڑا حوصلہ تھا۔

میں پھر کھڑکی کے پاس جا کہ کھڑا ہو گیا۔ وہ لمبا تڑنگا نوجوان اب ہمارے دروازے سے کوئی پچاس قدم کے فاصلے پر ہو گا۔ اُس کے اپنے حساب سے زیادہ سے زیادہ چالیس قدم۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ ایک ضعیف آدمی جس کی پشت ہماری جانب تھی، اُس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ مجھے لگا کوئی بھکاری ہے۔ یہ بھکاری بھی بھیک مانگتے وقت کوئی موقع محل نہیں دیکھتے۔ یہ شمشیر بکف نوجوان اپنی غصیلی طبیعت کے باوجود ایک مخیّر انسان تھا لیکن اُس نے اس بوڑھے کو کچھ دینے کی بجائے، اُسے جھنجھوڑ کر راستے سے ہٹا دیا۔ پھر پتہ نہیں کیسی کیسی قسمیں کھا کر چلایا:

"میں اُس بدنصیب عورت کے ٹکڑے کر ڈالوں گا"۔

اس فقرے میں تانیث کا صیغہ سُن کر مجھے گونہ اطمینان ہوا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ یکایک مڑا اور الٹے پاؤں اسی راستے پر چلا گیا جدھر سے آیا تھا۔ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا لگتا تھا جیسے اُس کے اندر کوئی عفریت داخل ہو گیا ہے۔

بظاہر خطرہ ٹل گیا تھا مگر میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ آج بات یہیں ختم نہیں ہو گی۔ میں اُس نوجوان سے واقف تھا۔ سارا مکہ اُسے جانتا تھا۔ وہ اُن لوگوں میں سے نہیں تھا جو کسی کام کا عزم کرنے کے بعد اُسے اُدھورا چھوڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ میں کھڑکی کے پاس انتظار کرتا رہا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ وہی بزرگ چلے آرہے ہیں جنھوں نے عمر کا راستہ روکا تھا اور جنھیں میں دُور سے بھکاری سمجھا تھا۔ یہ مکے کے ایک درمیانے درجے کے تاجر تھے۔ نُعیم بن عبداللہؓ جو کچھ عرصہ پہلے مسلمان ہو چکے تھے۔ مگر ابھی اس کا اعلان نہیں کیا تھا۔ وہ دروازے سے داخل ہوتے ہی سیدھے حضورؐ کے پاس جا کر بیٹھ گئے اور اُنہیں عمر سے اپنی ملاقات کا سارا ماجرا سُنایا۔ کہنے لگے:

"میں نے باہر گلی میں عمر کو ہاتھ میں تلوار لئے ادھر آتے دیکھا تو پوچھا

کہ تلوار کیوں میان سے نکال رکھی ہے۔ اُس نے جواب دیا اُس کو قتل کرنے کے لئے جس نے قریش میں تفرقہ ڈال رکھا ہے۔ میں نے کہا پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ اس پر وہ نہایت غضب ناک ہو کر پوچھنے لگا۔ کون سے گھر کی۔ ؟ میں اپنے مسلمان ساتھیوں کا راز فاش نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اس صورتِ حال میں مجھے اور کچھ نہ سوجھا۔ میں نے کہہ دیا اپنی ہمشیرہ اور بہنوئی کی جو محمدؐ کی رسالت پر ایمان لا چکے ہیں۔ یہ سنتے ہی اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس نے مجھے جھنجھوڑ کر پرے کیا اور اپنی ہمشیرہ کے گھر کی طرف مڑ گیا۔ شدید اشتعال کے عالم میں چیختا چلاّتا اور اپنی ہمشیرہ کے قتل کی دھمکیاں دیتا۔ اللہ ان دونوں میاں بیوی کو اپنے حفظ و اماں میں رکھے!"

عمر کے اسی اشتعال کا مظاہرہ میں نے دُور سے دیکھا تھا۔ نُعیمؓ کی روداد سُن کر ہم سب دل ہی دل میں اپنے ساتھیوں کی خیریت کی دعائیں مانگ رہے تھے کہ اتنے میں میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ عمر دوبارہ چلا آرہا ہے۔ کھنچی ہوئی تلوار اب بھی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے فوراً بھاگ کر دروازہ بند کر دیا اور چٹخنی لگا دی۔ رسول اللہؐ نے صورتِ حال کا اندازہ لگا لیا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے کہنے لگے:

"دروازہ کیوں بند کر دیا بلال؟"

میں نے کہا:

"عمر پھر آرہا ہے تلوار لہراتا ہوا"۔

انہوں نے ایک لمحے کے لئے مجھے خاموش نگاہوں سے دیکھا اور فرمایا:

"پیغمبر کا دروازہ کسی کے لئے بند نہیں ہوتا۔ اللہ سے ڈرو بلال اور دروازہ کھول دو"۔

یہ کہہ کر وہ کمرے کے وسط میں جا کر کھڑے ہو گئے، سارے صحابی بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں حسبِ حکم دروازہ کھولنے کے لئے پہنچا ہی تھا کہ باہر سے دستک سنائی دی۔ عمر تلوار کے دستے سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ میں نے فوراً چٹخنی اتار کر دروازہ کھول دیا۔ اب جو میں نے دیکھا اس پر مجھے آج تک یقین نہیں آتا۔ وہ جھک کر دروازے سے داخل ہوا۔ اُس کے اندر قدم رکھتے ہی رسول اللہؐ خود آگے بڑھے اور اس کا دامن جھٹک کر اُس سے پوچھا:

"کیوں عمر، کس ارادے سے آئے ہو؟"

ساری کائنات کی قوت سمٹ آئی تھی اس مختصر سے سوال میں۔ عمر سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ اُس نے رسالت مآبؐ کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہا۔ پھر پیچھے کھڑے حاضرین کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہا۔ اُس کے بعد اُس نے نظریں نیچی کر لیں اور اپنی تلوار کو دیکھتا رہا۔ اُس کے اندر ایک ہیجان برپا تھا، ایک لاوا تھا جو پھٹ پڑنے کو تیار تھا۔ ہم سب کی نظریں اُس پر جمی تھیں۔ یکایک اُس نے تلوار ہاتھ سے گرا دی اور کہنے لگا:

"میں اعلان کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے رسول ہیں"۔

یہ سنتے ہی رسولِ کریمؐ نے اور اُن کے ساتھ مل کر ہم سب نے اتنے زور سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا کہ ابو قبیس کی چٹانیں گونج اٹھیں۔

عمرؓ عورتوں مردوں میں اسلام لانے والے چالیسویں فرد تھے۔

عمرؓ کے قبولِ اسلام کا تو میں چشم دید گواہ ہوں لیکن اُن کے پہلی مرتبہ آنے اور دوسری مرتبہ آنے کے درمیان ایک گھنٹے میں کیا معجزہ رونما ہوا، اس کی تفصیل مجھے بعد میں خبابؓ نے بتائی۔

خبابؓ بن ارتؓ لوہار تھے اور اپنے فولاد کی طرح سچے اور قابلِ اعتماد۔ جس وقت عمرؓ اپنی ہمشیرہ کے گھر پہنچے تو خبابؓ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ وہ اکثر ان میاں بیوی کو

قرآن سنانے جایا کرتے تھے۔ عمرؓ دروازے پر ہی اُن کی آواز سُن کر ٹھٹکے۔ عجیب و غریب قسم کے الفاظ اُن کے کانوں میں پڑے تو اُن کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ سمجھ گئے کہ نُعیم کی اطلاع ٹھیک تھی۔ جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئے، خبابؓ اُن کی آہٹ سُن کر گھر میں کہیں چھپ گئے اور جاتے جاتے قرآنی آیات کا مسوّدہ فاطمہ بنتِ خطابؓ کو دے گئے۔ فاطمہؓ نے فوراً وہ تحریر اپنے کپڑوں میں چھپالی اور سہم کر اپنے شوہر سعید بن زیدؓ کے پیچھے کھڑی ہو گئیں۔ عمر، سعیدؓ کی طرف بڑھے تو فاطمہؓ بیچ میں آگئیں۔ عمر نے اس زور سے اُن کے منہ پر تھپڑ مارا کہ اُن کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ پھر عمر نے کہا مجھے بتاؤ یہاں کیا پڑھا جارہا تھا۔ مجھے وہ تحریر لاکر دو کہ میں خود پڑھوں، اس میں کیا لکھا ہے۔ فاطمہ نے نہایت پر اعتماد لہجے میں کہا کہ آپ بتوں کے پجاری ہیں۔ مَیں یہ تحریر ناپاک ہاتھوں میں نہیں دے سکتی۔ ہمشیرہ کے مُنہ سے یہ الفاظ سُن کر عمر انہیں غور سے دیکھنے لگے۔ اُن کے چہرے سے اب بھی خون بہہ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے گئے اور غُسل کر کے واپس آگئے۔ فاطمہؓ کو بھی اندازہ ہو گیا کہ اُن کے غصےّ کی شدت کم ہو گئی ہے۔ انہوں نے وہ تحریر اُن کے حوالے کر دی اور عمر نے آہستہ آہستہ پڑھنا شروع کر دیا۔ فاطمہؓ اور سعیدؓ کی نظریں اُن پر گڑی ہوئی تھیں۔ دونوں اُن کے چہرے سے اُن کے قلبی تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ قرآنِ حکیم کی سورہ طٰہٰ کا ایک صفحہ تھا جو حال ہی میں نازل ہوئی تھی۔ حسن و رمزیت کے اس مرقعے کو انہوں نے شرح و تفسیر سے ماوراء پایا۔

اللہ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی (ک ۸ طٰہٰ ۲۰)

(وہ معبود برحق ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اُس کے سب نام اچھے ہیں)

عمر پڑھتے جاتے تھے اور ہر لفظ کے ساتھ حیرت میں ڈوبتے جاتے تھے۔ کلامِ الٰہی کا جلال، اُس کا جمال اُن کے رگ وپے میں پیوست ہو کر شمعیں روشن کرتا جاتا تھا۔ جب اس

آیت پر پہنچے۔ تو وہ سر سے پاؤں تک لرز گئے۔

اِنَّنِی اَنَا اللہ لا الٰہ الا اَنَا فَاعْبُدْنِی وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِی،

(۱۴ ک طٰہٰ ۲۰)

(بیشک میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو میری عبادت کیا کرو اور میری یاد کے لئے نماز پڑھا کرو)

عمرؓ نے خود مجھے بعد میں بتایا کہ اُنہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے قرآن کی شوکتِ الفاظ اور حکمتِ ابدی کا دریا انہیں تنکے کی طرح بہائے لیے جارہا تھا۔ انہیں اپنے اندر ایک حلاوت سی سرائیت کرتی محسوس ہوئی۔ ظاہر و باطن ایک ہو گیا تو سب کو اُن کی کیفیت کا علم ہو گیا۔ خبابؓ بھی باہر نکل آئے اور اُن سے مخاطب ہو کر کہنے لگے :

”رسول اللہ نے کل ہی دُعا کی تھی کہ یا اللہ ابن خطاب یا ابنِ ہشام میں سے کسی ایک کے ذریعے اسلام کو تقویت پہنچا“

اور پھر جس جس طرح اللہ تعالیٰ نے عمر کے ذریعے اسلام کو تقویت بخشی اس کا حال اظہر من الشمس ہے۔

ابو جہل

غلاموں اور آزاد لوگوں کی سوچ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ آزادی اور غلامی، زندگی کے دو دھارے ہیں جو الگ الگ بہتے رہتے ہیں اور اپنے بہاؤ کی سمتیں خود متعین کرتے ہیں، ہم غلام کیا تھے، چند حشرات الارض جو آتے جاتے موسموں کے ساتھ پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں۔ ہمارا دائرۂ حیات بہت محدود تھا۔ ہماری خرید، ہماری فروخت، ہماری قیمت، ہمارا آقا، ہمارے آقا کا مزاج، اپنے غلاموں سے اُس کا سلوک اور بس۔ یہی ہماری ساری کائنات تھی، یہی ہماری زندگی کا محور۔ اس کے علاوہ ہمارے اردگرد جو بھی ہوتا رہتا تھا، اُس کے ہم خاموش تماشائی تھے۔ دوسرے غلاموں سے ہمارے میل جول کے مواقع بہت کم ہوتے تھے مگر ہم جب بھی ملتے، یہی چند موضوع ہماری گفتگو کا مرکز ہوتے۔ یہ ہم غلاموں کو بھی علم تھا کہ مکّی زندگی ایک انقلاب سے دوچار تھی۔ ایک طرف محمد ابن عبداللہؐ تھے اور دوسری طرف مکّے کے بڑے بڑے سردار، رئیس، تاجر۔ سارے کے سارے سانپوں اور

بچھوؤں کی طرح محمدؐ کی تحریک کو زک پہنچانے کے درپے تھے۔ سانپوں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ کچھ کم زہریلی، کچھ زیادہ اور کچھ اتنی بس بھری کہ اُن کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ اس آخری قسم میں اُس وقت چار لوگ تھے۔ ابوجہل، ابولہب، اُمیہ اور ابوسفیان۔ اور بھی بہتیرے سانپ تھے مگر اُن کے زہر کا توڑ ہو جاتا تھا بلکہ کبھی کبھی ایک کا زہر دوسرے کے زہر کا تریاق ہو جاتا تھا مگر ان چاروں کے کاٹے کا کوئی منتر نہیں تھا۔ ان کے علاوہ بے شمار بچھو تھے جو محض عادتاً ڈنک مارتے رہتے تھے۔ مخالف میں دم خم ہوا تو وار سہہ گیا، نہیں تو تڑپتا رہا۔ ان موذیوں میں سرِ فہرست بلکہ ان کا سرغنہ بنو مخزوم کا ابوجہل تھا۔ ان میں سے ابوسفیان پر تو بعد میں اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہوا۔

ابوجہل کا معاملہ باقی مشرکینِ مکہ سے مختلف تھا۔ وہ خود بھی اُن سب سے مختلف تھا۔ قریش کے سرداروں کی کچھ خاندانی اور قبائلی قدریں تھیں جنہیں وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ وہ عرب کی وسیع تر ثقافت کا حصہ بھی تھے۔ اور اس مناسبت سے اُن پر صحرائے عرب کی مجموعی روایات کی پاسداری کی بھی ذمے داری تھی۔ یہی نہیں، محافظِ کعبہ ہونے کی حیثیت سے قریشِ مکہ سارے عرب قبائل میں ایک مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ اُن کا سب قبائل سے براہِ راست واسطہ تھا۔ متولیانِ کعبہ ہونے کا اعزاز اور قبائل سے قریبی تعلق اس امر کے متقاضی تھے کہ وہ نہ صرف عربوں کی اجتماعی روایات کے علمبردار ہوں بلکہ اس ضمن میں وہ کردار پیش کریں جو مثالی اور قابلِ تقلید ہو۔ قریشِ مکہ کا خمیر انہی اجزائے ترکیبی سے اٹھا تھا۔ یہ ساری قدریں ابوجہل کو بھی وراثت میں ملی تھیں اور وہ بظاہر اُن پر عمل پیرا ہونے کا دعوے دار بھی تھا مگر اُس کی اپنی سوچ میں اپنے اجداد کے مذہب اور روایات کے تقدس کی بجائے ذاتی منفعت اور خود غرضی کا جذبہ مقدم تھا۔

ابوجہل تمام عمر ایک خواہش کی آگ میں جلتا رہا۔ یہ اُس کی زندگی کی واحد خواہش تھی

جو اُس کے ہر فکر و عمل کے پس منظر میں جھلکتی رہتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے ضعیف چچا، ولید کی وفات کے بعد خاندان مخزومی کا سربراہ بن جائے۔ اس منصب کا وہ اتنی شدت سے متمنی تھا کہ اِس کے لئے سب کچھ کر گزرنے کو تیار رہتا تھا۔ وہ صاحبِ ثروت تھا مگر اپنی دولت کی ایک ایک پائی اور اپنا سارا وقت اپنی ذاتی شہرت اور نیک نامی حاصل کرنے پر خرچ کرتا تھا۔ یہی اُس کی مہمان نوازی اور سخاوت کا پس منظر تھا، یہی اس کی میل ملاقات کا۔ قریش کے مذہبی عقائد کا وہ پابند ضرور تھا لیکن اُن کا تحفظ اُس کے نزدیک اتنا اہم نہیں تھا جتنا کہ اپنے تقررِ اعلیٰ کے لئے فضا ہموار کرنے کا کام۔ وہ اکثر اپنے ہم منصبوں کی ضیافت کا اہتمام کیا کرتا تھا مگر مہمان نوازی کی عظیم عرب روایت کے سلسلے میں نہیں، محض اس لئے کہ قریش کے سرداروں میں اثر رسوخ رہے۔ دوسروں کے کام آنے میں بھی اُس کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ صاحب الرائے حضرات میں اُس کی ساکھ بڑھے اور وقت آنے پر اُن کی رائے اُس کے حق میں ہو۔

ذاتی کردار اُس کا یہ تھا کہ شہر کی ہر سازش اُس کے ذہن سے شروع ہوتی تھی۔ بڑوں سے اُس کا رویہ خوشامدانہ تھا، ہم مرتبت لوگوں سے مصالحانہ اور کم حیثیت افراد سے معاندانہ بلکہ سفاکانہ۔ سارے مکے میں وہ ظلم و تشدد کی علامت بنا ہوا تھا۔ مخالفین سے نمٹنے کے لئے وہ انتہائی بیدردی کا مظاہرہ کر گزرتا تھا۔

مسلمانوں سے اُس کا بیر بھی، جو اُس کی پہچان بن چکا تھا، محض اس لئے نہیں تھا کہ وہ اُس کے خداؤں کو جھٹلاتے تھے بلکہ اس لئے کہ داعیٔ اسلام، محمدؐ، خاندانِ عبدِ مناف کے فرد تھے۔ ولید کی جانشینی کے معاملے میں عبدِ مناف کا خاندان ابوجہل کا حریف تھا۔ فیصلہ ان ہی دونوں میں ہونا تھا۔ ابوجہل نے اس ضمن میں بھرپور کوشش کر رکھی تھی اور عبدِ مناف کے اُمیدواروں کے مقابلے میں دعوتوں اور مہمان نوازیوں کی وجہ سے اُس کی ساکھ خاصی حد تک بہتر تھی مگر محمدؐ کے دعویٰ رسالت کے بعد تو اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ

سوچنے لگا کہ اگر محمدؐ کی روحانی پیشوائی کو قبولِ عام حاصل ہو گیا تو اُس کی ساری عمر کی محنت اکارت جائے گی۔ عبدِ مناف کے اُمیدواروں کے مقابلے میں وہ زیادہ خرچ کر سکتا تھا، زیادہ دعوتیں کر سکتا تھا، لوگوں سے مل جل کر اپنے بارے میں اُن کی رائے ہموار کر سکتا تھا بلکہ وہ یہ سب کچھ کر بھی چکا تھا مگر پیغمبری کے مقابلے میں وہ بالکل بے بس تھا۔ اِس کا اُس کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے یہ تہیہ کر لیا کہ جان رہے یا جائے محمدؐ کے دین کو کامیاب نہیں ہونے دینا۔ ہمارے دین کی بیخ کنی کے لئے اُس نے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی اور وہ ہمارے خلاف ہر ظلم، ہر سازش کی جڑ تھا۔ سارا دن مکّے کے مختلف چھوٹے بڑے حلقوں میں اسلام کی برائیاں کرتا پھرتا تھا۔ عوام کو بھڑکاتا تھا، خواص کو اُکساتا تھا اور رسول کریمؐ کی کردار کشی میں گھٹیا سے گھٹیا حرکت سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔

داعیِ اسلام کی مخالفت اب اس کی زندگی کا واحد مقصد بن چکی تھی کیونکہ اسلام اُس کے مقصدِ اوّلین یعنی ولید کی جانشینی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتا جا رہا تھا۔ وہ علی الاعلان کہنے لگا تھا کہ میں مکّے کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا مگر محمدؐ کی تحریک کو آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔ مکّے کے بیشتر تاجر اور سردار اُس کے حلقہء اثر میں تھے اور جہاں کہیں وہ دیکھتا کہ کسی نے محمدؐ کی یا محمدؐ کے دین کی حمایت میں کچھ کیا ہے، یا کچھ کہا ہے یا کچھ کہنے کرنے کا ارادہ کر رہا ہے تو وہ اپنی پوری طاقت سے اُن اثرات کو کچلنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ کائنات کا پہلا شخص تھا جس نے کسی مسلمان کے خون سے ہاتھ رنگے۔

سُمیّہؓ کے قتل سے لے کر جنگِ بدر تک، جہاں وہ لقمہء اجل بنا، مسلمانوں کے خلاف جو جو کچھ ہوا اُس میں ابو جہل کا ہاتھ تھا بلکہ جو کچھ ہوا اس میں سے بیشتر اُسی کی وجہ سے ہوا، خاص طور پر حضور اکرمؐ کی ذات کے خلاف جتنی کریہہ حرکتیں ہوئیں۔ خانہء کعبہ کی حدود میں اُن پر بہتان تراشی، گلیوں میں اُن کی راہ میں کانٹے بچھوانا، اُن پر کوڑا کرکٹ پھنکوانا،

سرِ عام اُن کی تذلیل کی کوششیں، گالی گلوچ، طعنہ بازی، مذاق، پھبتیاں، اُن میں سے اکثر کا ذمہ دار ابو جہل تھا۔

جس مذموم حرکت میں وہ خود شریک نہیں ہوتا تھا، اُس کے چیلے چانٹے اُس کی کمی پوری کر دیتے تھے۔ مخالف اور بھی تھے مگر کوئی اس حد تک گرا ہُوا نہیں تھا۔ ویسے تو ابو لہب اور اُس کی بیوی بھی اسلام دشمنی اور عداوتِ محمدؐ میں حد سے گزرے ہوئے تھے مگر شدت کے باوجود ابو جہل کے مقابلے میں اُن کا دائرہء کار اتنا وسیع نہیں تھا۔ رہا ابو سفیان تو اُس نے دشمنانِ اسلام کی قیادت ابو جہل کے بعد سنبھالی مگر ابو سفیان میں عربوں کی بہت سی قبائلی رواداریاں بھی تھیں۔ شائستگی، تحمل اور مثبت سوچ کے انداز بھی تھے جو بعد میں اُس کی بخشش کا سامان بنے۔

پہلی ہجرتِ حبشہ کے موقع پر ابو جہل ہی تھا جس نے قریش کے سرداروں سے سازباز کر کے مہاجروں کو گرفتار یا قتل کرنے کے لئے گھڑ سواروں کا ایک دستہ بھجوایا تھا۔ یہی تھا جس نے عمرو بن العاص کو تحفے تحائف دے کر شاہِ حبشہ کے پاس بھیجا تھا تاکہ مسلمان مہاجرین حبشہ سے پابہ زنجیر مکّہ لائے جا سکیں۔ جب اُس کا یہ حربہ ناکام ہوا تو اُس نے بنو ہاشم کے معاشرتی مقاطعے کا منصوبہ تیار کیا۔ بہت سے قریش سردار اس انتہائی اقدام کے حق میں نہیں تھے مگر ابو جہل نے اپنے مؤقف کی اتنی پُر زور وکالت کی کہ مخالفت کے باوجود یہ معاہدہ طے پا گیا۔ دو سال بعد جب اس مقاطعے کو ختم کرنے پر تقریباً سبھی رضامند تھے، ابو جہل برابر اس کی حمایت کرتا رہا مگر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ جب معاہدے کا مسودہ جو خانہء کعبہ میں رکھا تھا، منگوایا گیا تو اُسے دیمک چاٹ چکی تھی۔ صرف پہلی سطر باقی تھی اور وہ تھی "اے اللہ! تیرے نام پر"۔ رہے نام اللہ کا!

اُس وقت جب رسول اللہؐ خاندانِ نوفل کے سردار مطعم ابن عدی کی سرپرستی میں

مکے میں رہ رہے تھے، ابو جہل اندر ہی اندر سازشوں میں لگا ہوا تھا مگر بے بس تھا۔ اُس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں تھی کہ وہ خاندانِ نوفل سے مخالفت لیتا لیکن مطعم کے وفات پاتے ہی اُس نے نبیؐ کریمؐ کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ خاص طور پر قریش سرداروں کا اجتماع کیا جس میں ابو لہب جان بوجھ کر شریک نہیں ہوا تھا۔ اس منصوبے پر سب سردار راضی نہیں تھے لیکن ابو جہل نے جو دامے، درمے، قدمے، سخنے اسلام اور اہلِ اسلام کو تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا، ایک بار پھر سب کو رضامند کر لیا۔ یہ اور بات کہ اللہ تعالیٰ کو کچھ اور منظور تھا۔

یہ ابو جہل ہی تھا جس نے حضورؐ کی مکے سے ہجرت کے بعد اعلان کروایا تھا کہ جو محمدؐ کا سر لے کر آئے گا اُسے وہ ایک سو سُرخ اونٹ یا ایک ہزار اوقیہ چاندی انعام دے گا۔ حضرت عمرؓ جو اس کے بھانجے تھے، اُسی کے بھڑکانے پر تلوار میان سے نکال کر حضورؐ کو قتل کرنے نکلے تھے۔

جنگِ بدر کے موقعے پر بھی جب خاندانِ اسد کے حکیم بن حزامؓ نے جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے، عُتبہ کو جنگ نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا اور عُتبہ کچھ حد تک رضامند بھی ہو گیا تھا یہ ابو جہل ہی تھا جس نے سب کو از سرِ نو بھڑکایا تھا اور جنگ پر اصرار کیا تھا۔ عُتبہ کو اُس نے بزدلی کے طعنے دیئے تھے۔ یہ بھی کہا تھا کہ عُتبہ جنگ سے اس لئے بھاگنا چاہتا ہے کہ اُس کا بیٹا ابو حذیفہؓ مسلمانوں کی طرف سے صف آرا ہے۔ ابو جہل کو کیا خبر تھی کہ اس جنگ میں خود اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ جنگ کی شہ دینے کے باوجود جہاں نبرد آزمائی کے لئے عتبہ، شیبہ اور ولید صفوں سے نکل کر باہر آئے، ابو جہل نے ایسی کسی شخصی شجاعت کا مظاہرہ نہیں کیا۔

مردم آزادی اور ایذا رسانی کو ابو جہل نے ایک فن بنا رکھا تھا۔ اگر کوئی نو مسلم کسی طاقت ور قبیلے یا مقتدر خاندان کی پشت پناہی میں ہے تو وہ صرف اس پر اکتفا کرتا تھا کہ اُس کی توہین کرے، اس پر آوازے کسے، اُسے بُرے نتائج کی دھمکیاں دے اور اُس کا مذاق اُڑائے۔

اگر کوئی کھاتا پیتا تاجر اسلام لے آتا تو ابو جہل فوراً سارے شہر کو اکٹھا کر کے اُس کے ساتھ لین دین بند کرا دیتا، یہاں تک کہ وہ اقتصادی طور پر برباد ہو جاتا۔ اگر دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والا کوئی غریب، بے نوا ہوتا جسے کسی کی سرپرستی حاصل نہ ہوتی یا وہ اُس کے اپنے خاندانِ مخزومی کا کوئی کمزور فرد ہوتا تو ابو جہل اُس پر ایسے ایسے مظالم ڈھاتا کہ روح کانپ کانپ اٹھتی۔ خود تو جو کرتا تھا، کرتا تھا، اپنے تعلقات کی بنا پر دوسرے سرداروں کو بھی اُکساتا تھا کہ وہ بھی اپنے اپنے حلقۂ اختیار میں یہی حکمتِ عملی اختیار کریں۔

مجھ ضعیف آدمی سے اگر کوئی کہے کہ ابو جہل کی شخصیت کا چار الفاظ میں احاطہ کرو تو میں کہوں گا۔ تکبر، سازش، خود غرضی اور شقاوت۔ اُس کی فکر میں شر تھا، اُس کی زبان میں زہر بھرا تھا، اس کے لہجے میں کمینگی تھی، اُس کے طنز سے آگ برستی تھی، بات کرتا تھا تو لگتا تھا تیزاب کے چھینٹے اڑ رہے ہیں۔

میری اپنی پرورش تو ایک غلام بچے کی طرح ہوئی تھی لیکن ان بوڑھی آنکھوں نے دنیا دیکھی ہے۔ اگر ہم ابو جہل کو، عربوں اور خصوصاً قریشِ مکہ کی روایات اور اقدار کی کسوٹی پر پرکھیں تب بھی اُس کی شخصیت میں بہت سے جھول ملیں گے۔

اشرافِ مکہ غیرت کے پتلے تھے، حمیت پر جان دیتے تھے مگر ابو جہل کی وجہِ شہرت یہ نہیں تھی۔ ایک دن محمدؐ خانہ کعبہ کا طواف کرنے گئے۔ ابو جہل اپنے حواریوں سمیت حطیم کے پاس بیٹھا تھا۔ محمدؐ نے حجرِ اسود کو بوسہ دیا اور طواف کا پہلا چکر شروع کیا۔ جب وہ حطیم کے پاس سے گزرے تو ابو جہل نے اُن پر پھبتی کسی جس پر اُس کے سارے حواری کھِلکھِلا کر ہنس پڑے۔ رسالتمآبؐ کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ انہوں نے اُس کی ہرزہ سرائی سن لی ہے مگر وہ اپنے طواف میں مشغول رہے۔ دوسرے چکر میں جب وہ پھر حطیم کے پاس سے گزرے تو ابو جہل نے پہلے سے بھی زیادہ بدتمیزی کی۔ اس بار پہلے سے بھی زیادہ زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

اس بار بھی نبیؐ کریمؐ خاموشی سے گزر گئے اور اپنا طواف جاری رکھا لیکن جب سرورِ دو عالمؐ تیسرے چکر میں حطیم کے پاس سے گزرے اور ابو جہل نے ویسے ہی تضحیک آمیز الفاظ کہے تو رسول اللہؐ رک گئے اور ابو جہل کی ٹولی سے مخاطب ہو کے کہا:

"سنو قریش کے لوگو! میں اُس ذاتِ باری کے نام پر جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ تم کو کشت و خون کی وعید سُناتا ہوں"۔

ان الفاظ نے اور جس لہجے میں وہ کہے گئے، ابو جہل اور اُس کے حواریوں کو سحر زدہ کر دیا۔ نہ کوئی اپنی جگہ سے ہلا اور نہ کسی کو بولنے کی جرأت ہوئی۔ یہ تو تھا غیرت اور حمیّت کا معاملہ۔ رہی شجاعت تو اس کا مظاہرہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ حمزہؓ کی کمان کی ضرب کھا کر ابو جہل کس قدر خوف زدہ ہوا تھا اور جب حمزہؓ نے اُسے مقابلے کی دعوت دی تو اُس نے آنکھ تک اوپر نہیں اٹھائی۔ ابو جہل لڑتا کم، لڑواتا زیادہ تھا۔ وہ جوڑ توڑ کا ماہر تھا۔ اُس کی اصل طاقت اس کا سازشی ذہن تھا اور سازش اور شجاعت کا کبھی میل نہیں ہوتا۔ ابو جہل کے بارے میں، میں اور میرے جیسے زخم خوردہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ اُس میں منافقت کے علاوہ ہر برائی موجود تھی۔

مصیبت پر مصیبت

ویسے تو ہماری زندگی تھی ہی غموں سے عبارت لیکن ایک سال ہمارے لئے ایسا چڑھا تھا جو ہمارے لئے بڑی تکلیفیں لے کر آیا تھا۔ اذیتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ یہ عام الحزن کہلاتا ہے۔ غم و اندوہ کا سال۔ اس سال ہماری پریشانیاں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ ہمارا دین تک اُس کی زد میں آگیا تھا۔ ہم آسمانوں کی طرف نظریں اٹھا اٹھا کر دیکھتے تھے اور پوچھتے تھے یا اللہ ہمیں کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ نبوّت کے چھ سال میں ہماری تعداد بڑھتے بڑھتے سو تک پہنچ گئی تھی۔ دنیا کی آبادی میں ایک سو کی کیا حیثیت ہے لیکن ایک وقت ایسا بھی تھا جب ہم صرف دس تھے۔ آج دمشق میں میرے عہدِ ضعیفی کی سب سے بڑی خوشی یہ ہے کہ میں اپنے برآمدے میں بیٹھا، اپنی چھڑی کی مٹھی پر ٹھوڑی ٹکائے باہر سڑک پر مسلمانوں کے آتے جاتے ہجوم دیکھتا رہتا ہوں، تیس سال پہلے ہماری تعداد اتنی تھی کہ ہم ایک چراغ کے گرد جمع ہو سکتے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ نے ہم میں سے ہر ایک کو دس دس لاکھ

سے ضرب دے دی ہے۔ میں رب العزت کا شکر گزار ہوں کہ ابھی تک اُس کی زمین پر چل پھر رہا ہوں لیکن عام الحزن میں کئی بار میرا جی چاہا کہ میں اس زمین میں دفن ہو جاؤں۔

پہلے اُم المومنین حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوا۔ پچیس سال تک وہ رسولؐ اللہ کی رفیقہ حیات رہیں اور اُن کی مشیر، اُن کے بچوں کی ماں، علیؓ اور زیدؓ سمیت، اور جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں ایک وقت وہ تھا جب اوّل المسلمون یعنی رسول اللہؐ کے علاوہ دنیا میں صرف ایک مسلمان تھا اور وہ حضرت خدیجہؓ تھیں۔ اوّلیں نزولِ وحی کی رات جب رسول کریمؐ انتہائی کرب و تذبذب کے عالم میں تھے، حضرت خدیجہؓ ہی تھیں جنہوں نے اُنہیں دلاسا دیا تھا۔ بعثت سے پہلے انہوں نے اپنی ساری دولت حضورؐ کے قدموں میں ڈال دی تھی کہ وہ اُسے جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ خود اپنی ذات میں وہ اُم المومنین تھیں۔

حضرت خدیجہؓ اچانک بیمار پڑیں اور اُسی دن انتقال کر گئیں۔ رات سے پہلے پہلے انہیں دفن بھی کر دیا گیا۔ عالمِ اسلام سے اسلام کی اوّلین شہادت ایک دن میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اس کے بعد ابو طالب کا انتقال ہو گیا۔ اُن کی ساری زندگی کا احاطہ کیا جائے تو دو لفظ اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ محبّت اور ناکامی۔ انہیں نبیؐ اکرمؐ سے بے حد پیار تھا لیکن پھر بھی اُن کی وفات حالتِ ایمان میں نہیں ہوئی۔ وہ اپنے مُردہ اجداد کے مُردہ مذہب کا طوق کبھی گلے سے اتار کر نہ پھینک سکے۔ اُن کی تربیت ہی ایسی پختہ ہوئی تھی۔ اس کے باوجود وہ رسول اللہ کا بہت بڑا سہارا تھے۔ میں سمجھتا ہوں ربِ حکیم نے خود انہیں اس حالت میں رکھنا مناسب سمجھا تا کہ وہ ظلمت کے پردے میں رہ کر نور کی بہتر خدمت انجام دے سکیں۔ اگر ابو طالب ہم میں شامل ہو جاتے تو کفار انہیں بھی ہمارے زمرے میں شمار کر لیتے اور اُن کے کسی مشورے کو قابلِ اعتنا نہ سمجھتے۔ اُن کی نظروں میں شاید اُن کی غیر جانب دار حیثیت ختم ہو

جاتی اور وہ اسلام اور مسلمانوں کی کسی اعانت کے قابل نہ رہتے۔ اُن میں سے ایک ہونے کی حیثیت سے وہ ہمارے لئے دو کے برابر تھے۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ میں الحاد کی باتیں کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے!

ابو طالب کی شدید علالت کی خبر ملی تو قریش کے سردار عیادت کے لئے پہنچے۔ ابو جہل، عُتبہ، اُس کا بھائی شیبہ، اُبوسفیان وغیرہ۔ انہوں نے بسترِ مرگ پر لیٹے ابو طالب سے کہا:

"ابو طالب تمہیں معلوم ہے ہم تمہارا کتنا احترام کرتے ہیں۔ تمہاری علالت کی وجہ سے ہم سب بہت فکر مند ہیں۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے بھتیجے سے ہمارے مراسم کیسے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم اُسے بلواؤ۔ ایک تحفہ تم ہم سے لو اُس کے لئے اور ایک تحفہ اُس سے لے کر ہمیں دو تا کہ وہ اپنی جگہ خوش رہے، ہم اپنی جگہ خوش"۔

ابو طالب نے کسی کو کہا کہ وہ محمدؐ کو بلا لائے۔ جو ساتھ ہی کے کمرے میں تھے وہ آ گئے اور چچا کے پلنگ کے ساتھ کھڑے ہو گئے، یوں کہ پلنگ کے اک طرف وہ تھے اور دوسری طرف اُن کے سامنے سردارانِ قریش۔

ابو طالب نے نہایت نقاہت بھری آواز میں کہا:

"قریش کے سردار تمہیں کچھ دینے اور تم سے کچھ لینے آئے ہیں"۔

رسولِ کریمؐ نے کہا:

"ضرور۔ یہ لوگ صرف ایک لفظ کہہ دیں جس کے بعد عرب و عجم دونوں ان کے زیرِ نگیں ہوں گے"۔

ابو جہل بولا:

"یہ بات ہے تو ہم دس لفظ کہے دیتے ہیں۔ بتاؤ کیا کہنا ہے"۔

حضورؐ نے فرمایا:

"صرف اتنا کہ اللہ ایک ہے اور اُس کا کوئی شریک نہیں"۔

ابوسفیان نے کہا:

"محمدؐ عقل سے کام لو۔ اتنے سارے خداؤں کا ایک خُدا بناتے رہتے ہو"۔

اللہ کے رسولؐ کے لئے بُت پرستی سے مصالحت ممکن نہ تھی۔ کم وبیش یہی صورتِ حال مخالفینِ اسلام کی تھی۔ وہ بھی اپنے خداؤں کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہ تھے۔ محمدؐ نے جیسے ہی دوبارہ بات شروع کی، سب نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور بڑبڑاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

اسی شور شرابے میں ابوطالب نے دم دے دیا اور وہ اپنے دل پر اس آخری کوشش کی ناکامی کا داغ لے کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ابوطالب کی وفات کے بعد حضورؐ کا نہایت کمینہ دشمن ابولہب خاندانِ بنوہاشم کا سردار بن گیا۔ اہلِ مکہ کی اسلام دشمنی میں مزید شدت آگئی۔ سردار بنوہاشم کی حیثیت سے اُس نے رسول اللہؐ کی پشت پناہی تو برقرار رکھی لیکن محض برائے نام۔ وہ سارا دن مکے میں دندناتا پھرتا تھا۔ صبح وشام، موقع بے موقع لات، منات اور عزیٰ کی تعریفیں کرتے اُس کا منہ نہیں تھکتا تھا۔ اُس کی اسلام دشمنی میں ذرا بھی کمی آتی تو ابوجہل اُسے اُکساتا اور نفرت کے بخار کو کم نہ ہونے دیتا۔

بدبخت ابولہب! لات ومنات کی عبادت اُس کے کسی کام نہ آئی اور بالآخر وہ اپنے ہی غصے کی آگ میں جل کر بھسم ہو گیا۔ موت کے وقت وہ ایسی بیماری میں مبتلا تھا جس سے اُس کا چہرہ پھول کر پہلے سے بھی زیادہ سُرخ ہو گیا تھا اور آج اُس کی روح جہنم کی آگ میں سب کے لئے عبرت کا سامان بنی ہوئی ہے۔ اُس نے اپنی زندگی ہی میں اللہ کی طرف سے اپنے

جہنمی ہونے کی وعید سُن لی تھی۔ سورۂ لہب میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے

اور وہ برباد ہو گیا۔

نہ اُس کا مال اُس کے کام آیا، نہ اُس کی کمائی۔

وہ ایک شعلہ زن آگ میں پڑے گا،

وہ بھی اور اُس کی بیوی بھی،

لکڑیاں لاد کر لانے والی۔

اُس کی گردن میں رسّی پڑی ہو گی،

خوب بٹی ہوئی۔

ابولہب کی بیوی اُمِ جمیل بھی اُسی کی طرح بد تھی۔ مجھے یاد ہے میں بچہ تھا اور اُمِ جمیل چھتری لے کر غلاموں کی سزائیں دیکھنے آیا کرتی تھی۔ یہ وہ ہولناک مناظر تھے جن کو دیکھنے کا حوصلہ مردوں میں بھی نہیں ہوتا تھا۔ مجھے اُس سے خوف آتا تھا۔ بعد میں وہ خاردار جھاڑیوں کی گٹھریاں باندھ باندھ کر حضورؐ کے گھر کے سامنے جلایا کرتی تھی۔ اسلام دشمنی کی قدرِ مشترک ہی کی مناسبت سے باری تعالیٰ نے میاں بیوی کو جہنم میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ رکھا۔

مجھے اُن پر افسوس ہے۔ اُن بدنصیبوں کی واحد فضیلت یہ تھی کہ انہوں نے رسول اللہؐ کا زمانہ دیکھا۔ آج میں سوچتا ہوں کہ ابولہب اپنے بارے میں قرآنِ کریم کے واضح ارشاد کے بعد اگر چاہتا تو اس صحیفۂ آسمانی کو باطل ثابت کرنے کے لئے منافقت ہی میں اسلام لے آتا۔ وہ اس آیت کے بعد کئی سال زندہ رہا مگر اس سارے عرصے میں اُسے ایک لمحے کے لئے بھی یہ نکتہ نہ سوجھا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کر لیتا تو اس سے قرآنِ حکیم کی آیاتِ مقدسہ کی بدرجۂ اتم نفی ہو جاتی اور

اس سے بڑی اس کی خواہش کیا ہو سکتی تھی۔ مگر اس کو جو اسلام دشمنی میں سب کچھ کر گزرنے پر تیار رہتا تھا یہ توفیق نہ ہوئی اور قرآنِ حکیم کی ازلی سچائی قائم و دائم رہی۔

ابوبکرؓ کی آزمائش

مکے میں زندگی گزارنا اب پہلے سے بہت زیادہ مشکل ہو گیا تھا اور اُن کے لئے تو تقریباً ناممکن جن کا کوئی والی وارث نہیں تھا۔ محمدؐ خود جن سختیوں سے دوچار ہو رہے تھے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے۔ ہر روز اُن کو ایذا پہنچانے کے لئے نئے ستم ایجاد کئے جاتے۔ ایک دن ایک راہ گیر نے اُن کے گھر کے دروازے سے ہاتھ بڑھا کر اُن کے کھانا پکانے کے برتن میں نہایت بدبودار، سڑے ہوئے گوشت کا لوتھڑا پھینک دیا۔ ایک دن وہ اپنے گھر میں عبادت کر رہے تھے کہ عبدِ شمس کے عُقبہ نے جو عثمانؓ بن عفان کا سوتیلا باپ تھا، خون اور غلاظت سے آلودہ بھیڑ کی اوجھڑی اُن پر پھینک دی۔ وہ اُسی حالت میں اُس غلیظ اوجھڑی کو ایک چھڑی کے سرے پر لٹکا کر باہر لائے اور اپنے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر زور زور سے پکارا:

"اے عبدِ مناف کے بیٹو دیکھو، کیا اسی کو پشت پناہی کہتے ہیں؟"

ایک دن وہ کعبے سے گھر آ رہے تھے کہ کسی شخص نے زمین سے خاک اٹھا کر اُن کے

چہرے پر پھینک دی۔ منہ، سر، آنکھیں سب مٹی میں اٹ گئیں۔ وہ اُس ناہنجار کو دیکھ بھی نہ پائے۔ کئی بار گلیوں میں اُن پر اُوپر کی منزلوں سے کوڑا پھینکا گیا۔ میرے محسن ابو بکرؓ کا حال بھی حد درجہ ناگفتنی تھا۔ اسلام لانے سے پہلے وہ مکّے کی ایک نہایت بااثر اور بارسوخ شخصیت تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حمزہؓ اور عمرؓ کی طرح لوگ اُن سے خائف نہیں تھے لیکن اُن کے روحانی مرتبے اور خوش اخلاقی کی وجہ سے سارے شہر میں اُن کا بڑا احترام تھا۔ اسلام لانے کی دیر تھی کہ شہر کا شہر اُن کا دشمن ہو گیا۔ اور لوگ بھی مسلمان ہوئے تھے اور وہ سب دشمن ہی شمار کئے جاتے تھے لیکن ابو بکرؓ سے انہیں زیادہ کد اس لئے تھی کہ وہ نہ صرف خود مسلمان ہو گئے تھے بلکہ انہوں نے بقولِ قریش اور بھی بہت سے لوگوں کو ورغلایا تھا۔ اسود بن نوفلؓ کے اسلام لے آنے کے بعد تو ابو بکرؓ کے خلاف نفرت کی شدّت بہت بڑھ گئی تھی۔ ایک دن خود نوفل نے جو خدیجہؓ کے سوتیلے بھائی تھے۔ ابو بکرؓ اور طلحہؓ پر حملہ کروادیا۔ کچھ لوگوں نے ان دونوں کو پکڑا اور سر سے پیر تک رسیّوں سے جکڑ کر بازار میں پھنکوادیا۔ یہ سب کچھ سب کے سامنے سربازار ہوتا رہا مگر ابو بکرؓ کے اپنے قبیلے تیم کے کسی فرد نے اسد قبیلے والوں سے مزاحمت نہیں کی اور کھڑے کھڑے تماشہ دیکھتے رہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے بھی اپنے قبیلے کے ان دو سربرآوردہ لوگوں کو اسلام لانے کی بنا پر اپنی حمایت سے خارج کر دیا تھا۔

ایسے اور بھی کئی حادثے ہوئے۔ میرا سابقہ آقا اُمیہ تو ابو بکرؓ پر اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ بنوجمح کے محلّے میں ابو بکرؓ کا گھر اُس کے گھر کے پاس ہی تھا۔ آئے دن آتے جاتے کوئی نہ کوئی شرارت کرتا رہتا تھا۔ آخر ایک دن ابو بکرؓ نے بھی حضورؐ کی اجازت سے حبشہ ہجرت کر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ابو بکرؓ حیرۂ احمر کے سفر کے لئے مکّے سے روانہ ہوئے تو راستے میں اُن کی ملاقات ابن الدُغنہ سے ہوئی جو مکّے سے تھوڑی دُور صحرا میں چند چھوٹے چھوٹے قبیلوں کا مشترکہ

سردار تھا۔ اور ابو بکرؓ سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُس نے مکّے میں اُن کی بڑی شان، شوکت دیکھی تھی۔ انہیں اس طرح حال سے بے حال دیکھ کر اُس سے نہ رہا گیا۔ اُس کے متعدد سوالوں کے جواب میں ابو بکرؓ نے صرف یہی کہا کہ مجھ پر میرے شہر والوں نے بہت ستم ڈھائے ہیں اور میں مجبور ہو کر مکّے سے نکل آیا ہوں۔ اب میری یہی تمنّا ہے کہ میں زندگی کے باقی دن کہیں یادِ الٰہی میں گزار دوں۔

ابن الدُغنہ نے حیران ہو کر پوچھا:

"ایسا کیسے ہو گیا ابنِ ابو قحافہ! تم تو اپنے قبیلے کے سر کا تاج ہو۔ راست باز، بے بسوں کے مددگار، غریبوں، مسکینوں کے غم گسار۔ تمہارے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ تم واپس مکّے چلو۔ میرے ساتھ، میری پشت پناہی میں"۔

مکّے والوں کو اس بدوی سردار کا بڑا لحاظ تھا۔ انہوں نے اُس کی پشت پناہی کو تسلیم تو کر لیا لیکن ساتھ ہی ایک شرط بھی رکھ دی۔ وہ یہ کہ ابو بکرؓ اپنا اسلام اور اپنی عبادتیں اپنے گھر ہی میں رکھیں۔ شہر کے بچّوں بچیّوں کو گمراہ نہ کریں۔ ابن الدُغنہ نے بھی اسی بات پر زور دیا تو ابو بکرؓ نے اُس کی پناہ واپس کر دی۔

سب سے بُرا دن

رسول کریمؐ کی تبلیغ پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ انہیں کسی اجتماع سے خطاب کرنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ مشرکینِ مکہ کے سرداروں کا فیصلہ تھا۔ اس صورتِ حال میں وہ خود بھی مکے سے ہجرت کر کے کسی اور شہر جا بسنے کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ کوئی ایسا شہر جہاں کے لوگوں کے دل اتنے سخت نہ ہوں، نفرتیں اتنی گہری نہ ہوں۔ غصے میں اتنی شدت نہ ہو۔ وہ جو خالقِ کائنات کے اتنے پیارے تھے، مکے کے گلی کوچوں میں ایک پل کے لئے بھی محفوظ نہیں تھے۔ وہ اکثر سوچا کرتے تھے کہ وہ طائف چلے جائیں، مکے سے جنوب میں ایک سرسبز، پُر فضا شہر جو ایک پہاڑی پر آباد تھا۔ صحرا کی جھلسا دینے والی حدت سے دُور، پھلوں، باغوں، شہد کی مکھیوں اور تتلیوں کا شہر۔ اس شہر میں لات کی پرستش ہوتی تھی۔

آخر ایک دن انہوں نے طائف کے لئے رختِ سفر باندھ لیا۔ طائف مکے سے ستر میل دور تھا اور حضورؐ، زیدؓ کو ساتھ لے کر پاپیادہ وہاں کے لئے روانہ ہو گئے۔ مکے کا یہ تاجر

جوایک زمانے میں کئی تیز رفتار اونٹوں کا مالک تھا، آج اللہ کی راہ میں خرچ کر کر کے اتنا مفلس ہو گیا تھا کہ اُس کے پاس سفر کے لئے کوئی سواری نہیں تھی۔ اُس کرتے پر جو اُس نے پہن رکھا تھا، جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے تھے، ایک رومال تھا جو چہرے کو، اُڑ اُڑ کر پڑنے والی گرم ریت سے بچانے کے کام آتا تھا۔ اس لباس میں وہ اتنے حسین لگ رہے تھے کہ میں نے کسی کو، کسی لباس میں اُن سے خوب صورت نہیں پایا۔ یہ پھٹے پرانے کپڑے اُن کے بدن پر زرتار پوشاک کی طرح سجے ہوئے تھے۔

جب وہ اس بے سروسامانی میں رخصت ہو گئے تو ہم نے سوچا کہ اُن کا اس طرح جانا مناسب نہیں ہے۔ اُن کے ساتھ کچھ اور لوگ ہونے چاہئیں۔ چنانچہ ہم اُن کے پیچھے پیچھے گئے اور تھوڑی دیر میں انہیں جالیا۔ انہوں نے ہمیں دیکھا تو واپس بھیج دیا۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھتے تھے۔ سفر کے لئے صحرائے عرب کی روایتی ناسازگاری اور ناموافقت، دھوپ کی جھلسا دینے والی تپش، بادِ سُموم راستے کے کئی ناگہانی خطرات۔ کبھی راستے میں کنویں بھی سوکھے ملتے تھے اور پھر سب سے زیادہ دشمنوں کا خوف۔ ہزار باتیں تھیں جن کا رہ رہ کر خیال آتا تھا۔

ہمارے خدشات درست ثابت ہوئے۔ دو ہفتے بعد جب وہ واپس آئے تو پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ کمزور، نحیف، سارے بدن پر رِستے ہوئے زخم۔ بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہے تھے۔ آتے ہی ہاتھ کے اشارے سے پانی مانگا۔ پانی پی کر خاموشی سے اندر چلے گئے اور جا کر بستر پر لیٹ گئے۔ نہ انہوں نے کچھ کہنا مناسب سمجھا، نہ ہمیں ہی کسی سوال کی جرأت ہوئی۔ زیدؓ نے ہمیں تمام ماجرا سُنایا۔

وہ خیر و عافیت سے طائف پہنچ گئے تھے۔ راستے میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ وہاں پہنچ کر وہ سیدھے عمرو بن اُمیہ کے بیٹوں سے ملاقات کے لئے اُن کے گھر گئے۔ عمرو

کے تین بیٹے طائف کے سب سے بااثر سردار تھے۔ وہ اُن کے یہاں پہنچے تو دربار سا لگا ہوا تھا۔ تینوں بھائی گدّوں پر بیٹھے تھے۔ سامنے انواع و اقسام کی اشیائے خوردنی رکھی تھیں۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ انہوں نے رسالت مآبؐ کو نہایت حقارت سے دیکھا، اس انداز سے گویا کوئی کھیل ہاتھ آگیا ہے اور اب تفریح رہے گی۔

محمدؐ نے انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تو ایک بھائی بولا :

"اگر اللہ نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا ہے تو میں کعبے کے معلقات نوچ کر پھینک دوں گا"

دوسرا کہنے لگا :

"اللہ کو تم سے بہتر کوئی نہیں ملا تھا؟"

تیسرے بھائی نے تو بات ہی ختم کر دی :

"اگر تم اللہ کے رسول ہو تو ہمارا منصب نہیں ہے کہ ہم تم جیسے فرشتوں سے بات کر سکیں اور اگر تم رسول نہیں ہو تو تم جھوٹے اور فریبی ہو۔ اُس صورت میں بھی ہمیں تم سے بات نہیں کرنا چاہئے"۔

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کنکر پتھر جو ہاتھ میں آیا اُٹھا اُٹھا کر رسول اللہؐ پر پھینکنے لگے۔ اُن کے حواری بھی اس شغل میں اُن کے شریک تھے۔ محلّے کے بچّے بھی شامل ہو گئے۔ چیختے چلاتے، طوفان برپا کرتے بچّے جنہیں کچھ ہوش نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں، بہت بڑی تفریح سمجھ کر اُن پر پتھروں کے وار پر وار کئے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ زخموں سے نڈھال، وہاں سے جان بچا کر نکلے اور صحرا کی راہ لی۔ اُس دن کے بارے میں وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ وہ اُن کی زندگی کا بدترین دن تھا۔

اُس دن اُن پر صرف ایک کرم ہوا۔ جب وہ شہر سے باہر صحرا کی طرف جا رہے تھے تو فصیلِ شہر سے باہر ایک باغ میں عداس نامی ایک عیسائی غلام کام کر رہا تھا۔ اُس نے اُن کی یہ حالت دیکھی تو انگوروں کا ایک خوشہ انہیں لا کر دیا۔ کیا خوش نصیب انسان تھا عداس جس نے انگوروں کے ایک خوشے کے عوض جنّت کا سودا کر لیا۔ زندگی کتنا بڑا جُوا ہے اور حادثات کسی کسی کے لئے کتنے خوش آئند ہو سکتے ہیں۔ سوچا جائے تو جنّت کا راستہ طویل بھی ہے، مختصر بھی۔ مجھے پتہ نہیں عداس کا راستہ کون سا ہے لیکن میرے دل میں اُس کے لئے بڑا پیار ہے۔

عقبہ کی گھاٹی میں

ایک رات جب چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، ہم لوگ عقبہ کی ایک گھاٹی میں بیٹھے تھے۔ رسولِ کریمؐ بھی تشریف فرما تھے۔ یہ جگہ ہماری خفیہ آماجگاہ تھی جہاں ہم اپنے دشمنوں کی نظروں سے دور آپس کے مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ مگر اُس رات وہاں ہمارے کچھ مہمان بھی تھے۔ یہ بارہ آدمیوں کا ایک وفد تھا جو مدینے سے آیا تھا۔ مدینے کا نام اُن دنوں یثرب تھا۔ میں نے ان میں سے کسی کو بھی پہلے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اُن کے آنے کوئی اطلاع نہیں تھی لیکن اُن کے آنے کی ایک خاص وجہ تھی۔ وہ اللہ کے رسولؐ کو مدینے میں قیام کی دعوت دینے آئے تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ حضورؐ اُن کے شہر میں رہنے بسنے لگیں اور اہلِ یثرب کے درمیان، جو مستقل طور پر باہمی عناد اور نزاع کا شکار رہتے تھے، مصالحت کرا دیں۔ یثرب میں دو قبیلے آباد تھے اَوس اور خزرج۔ ہر اَوس کے دل میں خزرج کا لگایا ہوا کوئی نہ کوئی زخم تھا اور ہر خزرج کے دل میں کوئی نہ کوئی صدمہ تھا جو اُسے اَوس سے

پہنچا تھا۔ انہوں نے یثرب میں کسی سے سُنا تھا کہ مکّے میں ایک پیغمبر ہے جو اُخوت کا سبق دیتا ہے۔ اسی شہرت کی بنا پر وہ رسالت مآبؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور اس اُمید پر کہ شاید اُن کی توجہ سے یہ فساد ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے اور اہلِ مدینہ چین سے زندگی گزارنے لگیں۔ انہیں اس تعلق کا بھی علم تھا کہ محمدؐ کے والد اور والدہ دونوں مدینے میں دفن ہیں۔

رسول اللہؐ نے اُن کی گفتگو نہایت اطمینان سے سنی۔ وہ لوگ اُن کو اس چیز کی پیش کش کرنے آئے تھے جس کی تلاش میں انہوں نے طائف کا انتہائی اذیت ناک سفر گوارا فرمایا تھا، یعنی مکّے کے علاوہ کوئی اور شہر جہاں وہ سکونت اختیار کر سکیں اور بلا خوف و خطر اپنے دین کی تبلیغ کر سکیں لیکن یہ اُن کے شایانِ شان نہیں تھا کہ وہ فوراً ہی حامی بھر لیتے گویا وہ اس انتظار ہی میں تھے کہ کہیں سے کوئی پیش کش ہو اور وہ فوراً اُسے قبول کر لیں۔ اُنہیں ہزار باتیں سوچنا تھیں۔ انہوں نے مدینے والوں سے کہا اس سے بیشتر کہ میں ہاں کہوں، آپ کے لئے ضروری ہے کہ آپ میرے مؤقف کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ حتمی فیصلہ آپ سوچ بچار کے بعد کیجئے گا۔ فی الحال آپ میرے ایک نمائندے کو ایک سال کے لئے اپنے ساتھ لے جائیے۔ یہ آپ کو دینِ اسلام سے آگاہ کرے گا۔ ایک سال بعد بھی اگر آپ کا خیال یہی ہو کہ میں آپ کے شہر میں آباد ہوں تو مجھے آکر بتا دیجئے گا۔

اُن کے ساتھ روانہ کرنے کے لئے اللہ کے رسولؐ نے مصعب بن عمیرؓ کا انتخاب کیا جو عبدالدار کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جسے کلید بردارِ کعبہ ہونے کا شرف حاصل تھا۔ مصعبؓ کا ایک ذاتی شرف یہ بھی تھا کہ وہ ہم شکلِ رسولؐ تھے۔ اتنی مشابہت تھی کہ جب وہ اُحد میں شہید ہو کر گرے تو شور مچ گیا کہ نبیِ اکرمؐ شہید ہو گئے ہیں۔ مصعبؓ نہایت جامہ زیب تھے۔ مکّے میں وہ سب سے زیادہ خوش پوش تسلیم کئے جاتے تھے مگر یہ ان کے دائرۂ اسلام میں آنے سے پہلے کی بات ہے۔ بعد میں ایک دن مدینے میں جب وہ رسالت مآبؐ

کے سامنے آئے تو بہت موٹے اور کھردرے کپڑے کا لباس پہنا ہوا تھا، اُس پر بھی بے شمار پیوند لگے تھے۔ حضورؐ نے جو ہمیشہ اُن سے بہت شفقت فرمایا کرتے تھے، اُن کی طرف دیکھا اور اپنے آنسو پیتے ہوئے نہایت دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا:

"مصعب تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسے کپڑے پہننے لگے ہو!"

یہ کہہ کر آنسو پونچھتے ہوئے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔

حضورؐ نے مصعبؓ کے ساتھ ابنِ امّ کلثومؓ کو بھی مدینے روانہ کیا۔

اُس ایک سال میں ہم نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ وہ کٹھن تھی کہ اللہ کی پناہ اور سال تھا کہ ختم ہی ہونے پر نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی تو ہم سوچتے تھے کہ مدینے سے ہمیں کوئی دعوت آئی بھی تھی یا محض ایک خواب تھا۔ ہماری حالت قابلِ رحم تھی۔ ابولہب کا اب بھی یہ خیال تھا کہ اپنے خداؤں کی عظمت منوانے کے لئے اُس کا کوڑا کافی ہے۔ ہم سب اپنے اپنے گھروں میں محصور تھے۔ اللہ اللہ کر کے ایک سال پورا ہوا مگر ہمیں یوں لگا جیسے ایک نہیں پانچ سال گزر گئے ہوں۔

مدینے والے واپس آئے۔ ٹھیک ایک سال کے بعد۔ ایک دن، ایک گھنٹہ بھی آگے پیچھے نہیں، ایک تہائی رات گزر جانے کے بعد، وہیں عقبہ کے خُفیہ مقام پر جہاں وہ گزشتہ سال آئے تھے مگر اس بار وہ بارہ نہیں پچھتر تھے۔ مصعبؓ بھی اُن کے ساتھ تھے۔ براء بن معرورؓ اُن کی قیادت کر رہے تھے۔

یہ سنِ نبوت کا تیرھواں سال تھا۔

ہم سارے ڈرے سہمے لوگ تھے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ ہمارے لئے کوئی جال بچھایا گیا ہے۔ آخر اتنے بہت سارے لوگ کیوں آئے ہیں۔ دن رات خوف میں زندگی گزارتے گزارتے میں ہوا سے بھی ڈرنے لگا تھا۔ اتنے میں زیوروں کی جھنکار میرے کانوں

میں پڑی۔ آگے بڑھ کر دیکھا تو اُن کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔ اس سے ذرا حوصلہ ہوا۔ عورتوں کی موجودگی میں عام طور پر لوگ جھگڑا فساد نہیں کرتے۔

مدینے سے آئے ہوئے وفد نے وہی پیش کش دہرائی کہ وہ اُن کے شہر میں آکر رہیں اور اُن کے باہمی تنازعے چکائیں۔ ایک لمحے کے لئے محفل پر خاموشی طاری ہو گئی۔ ہر فرد کی نگاہیں رسالت مآبؐ کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ اس ایک لمحے کے توقف کے بعد حضورؐ نے اپنے سر کی ہلکی سی جنبش سے اُن کی درخواست منظور کرلی۔ اُس وقت ہم وہ نہیں جانتے تھے جو ہم نے بعد میں جانا۔ اُس ایک لمحے نے جس میں آنحضرتؐ نے اُن کی پیش کش پر غور فرمایا، دنیا کی تاریخ بدل کر رکھ دی۔ یہ ایک لمحہ صدیوں پر محیط تھا۔ اقوامِ عالم کا مستقبل، انسان کی دینی و دنیوی نشوونما، عالمِ انسانیت کا فکری ارتقا، تہذیب و تمدّن کے آفاقی معیار کا فروغ، کیا کچھ اپنے اندر لئے ہوئے تھا وہ ایک لمحہ جو بظاہر آنحضرتؐ کے سر کی ایک ہلکی سی جنبش کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

سرورِ کائناتؐ نے اُن سے ایک وعدہ لیا جسے تاریخ میں بیعتِ عقبہ ثانی کہتے ہیں۔ یہ نام اتنا بھاری بھر کم ہے کہ لگتا ہے اس معاہدے میں فریقین نے بڑی کڑی کڑی شرطیں رکھی ہوں گی جو بہت مشکل سے طے پائی ہوں گی۔ شاید کچھ خون خرابہ بھی ہوا ہو۔ جو میرے سامنے ہوا، اس کی نوعیت تو ایک درخواست کی سی تھی جو رسولِ کریمؐ نے نہایت حلم سے اہلِ مدینہ کے سامنے پیش کی تھی۔ اُنہوں نے فرمایا:

"آپ لوگ وعدہ کریں کہ صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کریں گے، خواتین کے ساتھ نیک سلوک کریں گے، اپنی بیٹیوں کو قتل نہیں کریں گے، جھوٹ نہیں بولیں گے، چوری نہیں کریں گے، اللہ کے قوانین پر کاربند رہیں گے اور اُن لوگوں کو تحفظ دیں گے جو اللہ

کے رسول کے ساتھ مدینے جائیں گے"۔

آپ نے انہیں یہ بھی فرمادیا کہ اُن کے مدینے جاکر رہنے کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ وہ صرف مدینے والوں کے لئے وقف ہو گئے۔ وہ ہر قوم، ہر نسل، ہر رنگ کے لوگوں کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

اتنے انکسار سے ادا کئے گئے اتنے دوٹوک الفاظ میں نے کبھی نہیں سُنے۔ دوسرے لفظوں میں وہ فرما رہے تھے کہ اپنے خداؤں کو آگ لگادو، اُن کا وجود ختم کردو، نبیؐ کے لئے اگر جنگ بھی کرنا پڑے تو کرو۔ مصعبؓ انہیں بتاچکے تھے کہ قوانینِ الٰہی کیا ہیں۔ دوسروں کو اپنے مال و دولت میں شریک کرنا، یہاں تک کہ ایک کھجور میں سے بھی دوسرے کو حصہ دینا۔

مدینے والوں نے سوال کیا:

"اس کے عوض ہمیں کیا ملے گا؟"

آپ نے ایک لفظ میں اس کا جواب دیا:

"جنت"

براء بن معرورؓ نے آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا:

"یارسول اللہ! خدائے واحد کی قسم، ہم جان و مال سے آپ کی حفاظت کریں گے، ہم نے تلواروں کی چھاؤں میں پرورش پائی ہے اور جنگ آزمائی ہمیں ورثے میں ملی ہے"۔

اُن کی بات ابھی جاری تھی کہ ابوالہیثم بن التیہانؓ نے کہا:

"رسول اللہ! کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ آپ قوت اور اقتدار پاکر ہمیں چھوڑ دیں اور واپس اپنے قبیلے میں چلے جائیں"؟

حضورؐ نے مسکرا کر جواب دیا:

"میرا خون، تمہارا خون۔ تمہاری ذمے داری، میری ذمے داری۔ تمہارا دشمن، میرا دشمن، تمہارا دوست، میرا دوست، میں تمہارا، تم میرے"۔

یہ سُن کر سب سے پہلے کعب بن مالکؓ، ابوالہیثمؓ اور سعد بن زرارہؓ نے بیعت کی۔ پھر آپ نے ہر شخص کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا اور خواتین کی بیعت سر کے اشارے سے قبول کی۔

اس وفد میں کئی نوجوان بھی تھے۔ معاذ بن عمروؓ، شہیدِ احد عمرو بن جموحؓ کے بیٹے اور ایک اور نوجوان اُن کا نام بھی معاذؓ تھا۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر۔ کیا سجیلا نوجوان تھا۔ مجھے اُس کا وہ چہرہ آج تک یاد ہے۔ روشن سیاہ آنکھیں، سرخ و سپید رنگ، چہرہ ایسا شگفتہ جیسے کوئی پھول کھلا ہو۔ دانت اتنے چمکدار کہ نور کی شعاعیں پھوٹتی تھیں۔ یہ معاذ بن جبلؓ تھے جن سے بعد میں ہماری بڑی بڑی صحبتیں رہیں۔ وہ اسلام کے اتنے جیّد عالم بنے کہ امام الفقہا اور امام العلماء کہلائے۔ نبی کریمؐ نے ایک بار فرمایا تھا کہ معاذؓ قیامت کے دن علماء کے امام ہوں گے۔ اسی مناسبت سے انہیں امام العلماء کا لقب ملا۔ عمرؓ فاروق نے اپنے دورِ خلافت میں ایک بار کہا تھا کہ اگر معاذؓ نہ ہوں تو عمر ہلاک ہو جائے۔

سفرِ شام میں جابیہ کے مقام پر جہاں میں بھی موجود تھا، عمر فاروقؓ نے خطبہ دیتے ہوئے کہا تھا:

"جسے فقہ سیکھنا ہو وہ معاذؓ کے پاس جائے"۔

یہ تھی بیعتِ عقبہ ثانی جو عقبہ کے مقام پر پہاڑیوں کے درمیان، دریا کی ایک سوکھی گودی میں لی گئی۔ لیکن مجھ سابق غلام کا خیال ہے کہ ہم اس رات عقبہ کی کسی گھاٹی میں نہیں بلکہ ربِ ذوالجلال والاکرام کی رحمتوں کے جوار میں بیٹھے تھے۔ عقبہ کی اس بیعت کے بعد ہماری دنیا ہی بدل گئی۔ اب ہم ایک ٹولہ، ایک گروہ، ایک جماعت نہیں بلکہ ایک قوم، ایک ملت تھے۔

سوئے مدینہ

میں اُمیہ کا سیہ فام سابق غلام اب انسانوں کا ایک ذمے دار قائد تھا۔ میں جب یہ سوچتا ہوں تو دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوں۔ اللہ مجھے کبھی تکبّر نہ دے!

مکے سے ہجرت کا معاملہ تھا اُس وقت جب ہر شخص ہمارے خون کا پیاسا دکھائی دیتا تھا۔ شیر کے مُنہ سے نوالہ چھیننے والی بات تھی۔ ایک مہم کے لئے مجھے قائد چنا گیا تھا۔ چھپ چھپا کر مکے سے نکلنا تھا اور چھپتے چھپاتے مدینہ پہنچنا تھا۔ اس ذمے داری کے لئے ایک سابق غلام سے بہتر قائد اور کون ہو سکتا تھا کیونکہ غلام کے تو خون ہی میں فرار کی خواہش شامل ہوتی ہے۔ ایسی مہم کی کامیابی کا انحصار قائد کی صلاحیتوں کے علاوہ دو اور باتوں پر بھی ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ منزلِ مقصود کتنی خوش آئند اور پرکشش ہے اور دوسرے یہ کہ جس عذاب سے فرار مطلوب ہے وہ کس حد تک جان لیوا ہے۔ ہماری منزلِ مقصود مدینہ تھی۔ شمال کا ایک خوب صورت، شاداب شہر اور جس کے خوف سے ہم فرار چاہتے تھے وہ تھا

ابو جہل۔ جب مُہم کے لئے حالات اتنے سازگار ہوں تو میری کامیابی یقینی تھی۔
آگ اُگلتا ہوا، پُھنکارتا ہوا ابو جہل جیسا ابلیس پیچھے لگا ہو تو کون ہے جو جان کی بازی نہیں لگادے گا۔

مکّے سے مسلمانوں کی ہجرت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ سب کو مدینے جانا تھا۔ حکمتِ عملی یہ تھی کہ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی وقت صحرا میں نکل جائیں اور الگ الگ راستوں سے ہوتے ہوئے مدینہ پہنچ جائیں۔ ہر ٹولی کی ہجرت کی رات اور وقت رسولِ کریمؐ خود متعین فرماتے تھے۔ یہ سب کام انتہائی احتیاط اور رازداری سے کیا جارہا تھا۔ حضور مہاجرین کی ہمت بڑھاتے تھے اور اُن کے زادِ سفر کا انتظام کرتے تھے۔ اُن کو سب سے بڑا اندیشہ یہ تھا کہ دشمن کہیں صحرا میں مسلمانوں کو گھیر کر اُن کا قتلِ عام نہ کر دیں۔ ہمیں حکم تھا کہ ہماری ٹولیاں فاصلے فاصلے سے چلیں اور جب تک یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ اب دشمن کی دسترس سے باہر ہیں تب تک کسی جگہ اکٹھے نہ ہوں۔ ہر ٹولی کا ایک قائد مقرر کیا جاتا تھا۔ مجھے بھی حضورؐ نے ایک ٹولی کا قائد بنادیا۔ چھ مرد، دو عورتیں اور تین بچّے۔ رحمتِ دو عالمؐ نے خود ایک بچّے کو گود میں اٹھایا اور ایک میل تک ہمارے ساتھ مکّے سے باہر آئے اور ہمیں دُعاؤں کے ساتھ رخصت کر کے واپس لوٹ گئے۔ میں سوچتا ہوں حضورؐ نے مجھ پر بڑا اعتماد فرمایا تھا۔ خوشی کے مارے میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ مجھ میں وہ جرأت پیدا ہو گئی تھی کہ اگر شیر بھی سامنے آتا تو میں نہتا اُس سے لڑ پڑتا۔ میں غلام ابنِ غلام بلال انسانوں کا سربراہ بنادیا گیا تھا۔

مکّے سے مدینہ تقریباً دو سو پچاس میل دور ہے۔ گرمیاں ہو تو اونٹوں پر یہ سفر نو دس دن کا ہے، بچّے ساتھ ہوں تو گیارہ بارہ دن کا۔ دونوں شہروں کا درمیانی صحرا قرن ہا قرن سے قافلوں کی رہ گزر رہے، کروڑوں انسان یہاں سے گزر چکے ہیں اور ہواؤں نے سب کے نقشِ قدم ریت سے ڈھانپ دئے ہیں مگر ہوائیں ہمارے قدموں کے نشان کبھی نہ مٹا

سکیں۔ ہم اور تھے، سب سے مختلف، سب سے جُدا۔ ہم خاص لوگ تھے۔ ہم اپنے ساتھ تجارت کا سامان نہیں اللہ کی سونپی ہوئی ذمے داری لے کر جارہے تھے۔ جب تک دنیا میں گھڑیاں چلتی رہیں گی، جب تک وقت کی گردش جاری رہے گی۔ ہمارے نقشِ قدم قائم رہیں گے۔ ہواؤں کے تیز سے تیز جھکڑ بھی انہیں نہیں مٹا سکیں گے، اس لئے کہ ہم اسلامی تقویم کے پہلے سال کے نقیب تھے۔ وقت کی ابتدا ہی ہمارے قدموں کی چاپ سے ہوئی۔

سخت گرمی کا مہینہ تھا۔ صحرائی سفر کے لئے سال کے بدترین دن مگر اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے یہ سفر آسان کر دیا تھا۔ کوئی بادِ سموم کا جھونکا ہم تک نہیں پہنچا، کوئی طوفانِ باد ہم سے نہیں ٹکرایا، کسی نے ہمارا پیچھا نہیں کیا۔ مطلع صاف رہا اور ستارے ہماری رہنمائی کرتے رہے۔ پانچویں دن ہمیں دُور افق کے پاس چند بدوی نظر آئے۔ تین یا چار جو فوراً ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ ایک دن چوس نے ریت پر بیٹھے ہوئے ایک شتر مُرغ کو اٹھادیا۔ میں اُس کے پیچھے لپکا کہ شکار کر کے کھائیں گے مگر اُس کے تعاقب میں، میں ریت پر گر گیا اور وہ غائب ہو گیا۔ بچے دیر تک میری حالت پر قہقہے لگاتے رہے بس اس کے علاوہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ چھوٹی موٹی بیماریاں لگی رہیں۔ گرمی کے سفر میں کچھ نہ کچھ تو ہوتا ہی ہے۔ تینوں بچّے باری باری بیمار پڑتے رہے لیکن بیماری میں جب ہم انہیں اپنے کندھوں پر اٹھا کر چلتے تو ساری بیماری بھول جاتے۔

ہمارے ایک ساتھی کے پاؤں میں زخم تھا جو خاصا بگڑ چکا تھا۔ تین دن تک وہ پیدل چلتا رہا اور اُس نے اپنی تکلیف ہم سے چھپائے رکھی۔ چوتھے دن میں نے اُس کے پاؤں کا درد اُس کی چال میں نہیں، اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ جیسے ہی اُسے یہ احساس ہوا کہ مجھے اُس کی تکلیف کا علم ہو گیا ہے، اُس نے تیز تیز قدم اٹھانے شروع کر دئے، یہاں تک کہ وہ ہم سے بہت آگے نکل گیا۔

صبر واستقامت کے اس بے مثال مظاہرے میں اُس پر کیا گزری اللہ ہی جانتا ہے جو اپنے بندوں کے لئے ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔ ہمیں اُس کے پیچھے دوڑ کر اُس کی سماجت کرنا پڑی کہ وہ ہمارے ساتھ چلے۔ کسی میں ہمت نہیں تھی کہ اُس کے پاؤں کی تکلیف کا ذکر کرے لیکن جب ہم مدینے میں داخل ہوئے تو اُس کا ہاتھ میرے کندھے پر تھا اور وہ ایک ٹانگ سے اُچھل اُچھل کر چل رہا تھا۔

'یہ تھی مکّے سے میری رخصت، میری ہجرت!

الوداع مکّہ

ہماری ہجرت کا ایک پہلو ایسا بھی تھا جس پر ہماری نظر نہ تھی۔ مکّے سے چلے ہوئے ہمیں چھٹا دن تھا کہ صحرا میں ہماری ملاقات حمزہؓ سے ہوئی۔

انہوں نے ہمیں جو خبر سنائی، اُس کے لئے ہم بالکل تیار نہیں تھے۔ حمزہؓ نے بتایا کہ رسول اللہؐ نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک سارے مسلمان ہجرت نہیں کر جاتے، وہ مکّے ہی میں قیام فرمائیں گے۔

ہم اس سوچ میں پڑ گئے کہ کفارِ مکہ کا سارا عناد تو انہی سے ہے۔ دشمن اُن سے فارغ ہوتے تھے تو ہم کو تختۂ مشق بناتے تھے۔ جب چھتّے کی ملکہ ہی اُن کے پاس ہے تو شہد کی مکھیوں کی انھیں کیا پرواہ۔ وہ جہاں چاہیں اُڑتی پھریں۔ اب صورتِ حال کا جو نقشہ ہمارے ذہن میں اُبھرا وہ یہ تھا کہ رسول اللہؐ قاتلوں اور دشمنوں میں کھلے عام پھر رہے ہیں اور جان کا خطرہ مول لے کر تنِ تنہا مسلمانوں کی ہجرت کا بندوبست کر رہے ہیں۔ یہ بے خوفی یقیناً اللہ کی

دین تھی مگر ہم سوچتے تھے کہ اُن کو اس طرح غیر محفوظ پا کر مشرکینِ مکہ کے زرخیز ذہنوں میں کیسے کیسے منصوبے نہیں آتے ہوں گے۔ اُن کے سرپرست مطعم بن عدی کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ جب تک وہ زندہ تھے، ہزار مخالفت کے باوجود کسی کو اُن کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں تھی۔

مکے میں جو کچھ ہوا اس کا علم تو ہمیں بعد میں ہوا لیکن اس کا ذکر یہیں برمحل ہو گا۔ مکے کے اُمراء نے ابو جہل کے ایما پر واقعی اللہ کے رسولؐ کو شہید کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ایک نہایت جامع منصوبہ جس میں ابو جہل کی تمام مکاری، تمام چابک دستی، تمام فطانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یہ ایسا منصوبہ تھا جسے ابو جہل کے شر پسند اور فتنہ پرور ذہن کا شاہکار کہا جاسکتا ہے۔ آنحضرتؐ بھی راستے سے ہٹ جاتے تھے، اور الزام بھی کسی پر نہیں آتا تھا۔

تجویز یہ تھی کہ سات قبیلوں کے سات آدمی، اپنے اپنے قبیلے سے ایک ایک نیزہ لے کر جائیں اور رسول اللہؐ کے جسم میں پیوست کر دیں۔ اس طرح قتل کی ذمے داری نہ کسی ایک قبیلے پر آئے گی اور نہ کسی فردِ واحد پر۔ مکے کے قانون کے مطابق قاتل کو ڈھونڈ کر اُسے قتل کرنا لازم تھا لیکن اس تجویز میں کسی کے قاتل ٹھہرائے جانے کا امکان ہی نہیں تھا۔ سات قبیلوں کے آدمی اگر مل کر کسی کو قتل کر دیں تو محمدؐ کا خون کئی قبیلوں پر تقسیم ہو جائے گا اور اُن سب سے بدلہ لینا ناممکن ہو گا۔ یہ ایسا منصوبہ تھا گویا خود ابلیس نے مرتب کیا ہو۔

لیکن ہوا یہ کہ اُس رات سات نیزے بلند ضرور ہوئے مگر اُٹھے کے اُٹھے رہ گئے، کسی کو مارے نہیں جاسکے۔ حضورؐ کے بستر پر علیؓ سو رہے تھے اور وہ خود ہجرت فرما چکے تھے۔ مکہ چھوڑنے سے قبل وہ سب کی امانتیں واپس کرنا چاہتے تھے، اس لئے کہ وہ الامین تھے۔ ان

میں سے کئی امانتیں کفار کی بھی تھیں جو تمام اختلافات کے باوجود اب بھی انہیں امین سمجھتے تھے۔ الامین نے ساری امانتیں علیؓ کے سپرد کر دیں کہ اُن کی روانگی کے بعد لوگوں کو واپس کر دیں۔ وہ خود واپس کرتے تو سارے مکے کو اُن کے جانے کی خبر ہو جاتی اور وہ انہیں ہرگز زندہ نہ چھوڑتے۔ نہ واپس کرنے کا تو مکے کے امین کے یہاں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ یہ تھا پس منظر اُس رات کا جب علیؓ اُن کے بستر پر سوتے ہوئے پائے گئے تھے۔

جس وقت اُن کے گھر میں نیزے لہرا رہے تھے، وہ خود مکے سے باہر جا چکے تھے مگر ابھی خطرے سے باہر نہیں تھے۔ ابو جہل کو اُن کی ہجرت کی اطلاع ملی تو اُس نے قریش کے سرداروں کو بھڑکا کر اُن سب کی طرف سے یہ اعلان کروادیا کہ جو محمدؐ کو زندہ یا مُردہ مکہ لے کر آئے گا اُسے سو اونٹ انعام میں دئے جائیں گے۔ ایک سو اُونٹ بہت بڑا انعام تھا۔ مکے کے سارے گھڑ سوار محمدؐ کی کھوج میں صحرا میں پھیل گئے۔ انعام کے علاوہ کفار کی مردم آزار طبیعت کے لئے محمدؐ کو ان حالات میں ڈھونڈ نکالنا بڑی دلچسپ مہم بھی تھی۔ میں غلام رہ چکا ہوں۔ مجھے علم ہے کہ انسان جب انسان کا شکار کرنے کی ٹھان لیتا ہے تو بڑی بے رحمی اور خوں خواری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جانور جب شکار کرتے ہیں تو اس سنگدلی کا عشرِ عشیر بھی نہیں نظر آتا لیکن ہوتا یہ ہے کہ نمرود کی طرح آخر میں وہ خود ہی شکار ہو جاتا ہے۔

محمدؐ، ابو بکرؓ اور اُن کے بیٹے عبداللہؓ کے ساتھ مکے سے روانہ ہوئے تو مدینے جانے کے لئے انہوں نے کھلے صحرا کا انتخاب نہیں کیا۔ قریش کے پھیلائے ہوئے جال میں وہ راستہ اختیار کرنا قطعی نامناسب تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے شمال کی طرف جانے کی بجائے پہلے جنوب کی طرف گئے اور غارِ ثور میں پناہ لے لی۔ بے شک اللہ بڑا حکمت والا ہے! عبداللہؓ انہیں غار تک پہنچا کر واپس مکہ آگئے۔ وہ ہر روز رات کے وقت غارِ ثور جاتے، انہیں کھانا پہنچاتے اور شہر کی خبریں سناتے۔

سو اونٹ بہر حال سو اونٹ ہوتے ہیں۔ یہ انعام چھوڑنے والا نہیں تھا۔ ویسے تو ہر صحرا نورد ریت پر نشان دیکھ کر صورتِ حال کا جائزہ لینے کا پیدائشی ماہر ہوتا ہے مگر اُن دنوں اتفاق سے مکّے میں ایک نہایت ماہر کھوجی آیا ہوا تھا۔ میری طرح حبشہ کا رہنے والا سیاہ فام۔ صحرائے عرب میں اُس کی صلاحیتوں کا بڑا شہرہ تھا۔ کہتے ہیں وہ ہوا کو سونگھ کر اڑتے ہوئے پرندوں کی خبر دے دیا کرتا تھا۔ پتھروں پر قدموں کے نشان دیکھ لیتا تھا۔ اُس کے دوست تو کہا کرتے تھے کہ وہ ہوا کو دیکھ بھی سکتا ہے۔ جب سب لوگ شمال کی طرف نکل پڑے تو یہ کھوجی واحد شخص تھا جو مخالف سمت میں جنوب کی طرف گیا۔ ابو جہل، اُمیہ اور اُن کے ساتھی جنھوں نے اُس کی خدمات حاصل کی تھیں، اُسے حیرت سے دیکھ رہے تھے مگر وہ ایک ہی فقرہ کہے جاتا تھا:

"میں خود نہیں جارہا۔ کسی کے قدموں کے نشان مجھے اُدھر لئے جارہے ہیں"۔

ابو بکرؓ نے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ ہر روز اُن کے آزاد کردہ غلام عامر بن فہیرہؓ اُن کی بھیڑیں لے کر غارِ ثور تک جاتے اور واپس مکّے آجاتے۔ اس طرح بھیڑوں کے ریوڑ سے عبداللہؓ کی آمد و رفت کے نشان مٹ جاتے۔ ہجرت کی شب بھی عامرؓ اپنی بھیڑوں کا گلّہ پیچھے پیچھے لے کر گئے تھے مگر کھوجی نے بھیڑوں کے چھوٹے چھوٹے نشانوں میں اونٹوں کے کچھ بڑے بڑے نشان بھی دیکھ لئے تھے۔

کھوجی چلتے چلتے غارِ ثور تک پہنچ گیا اور وہاں پہنچ کر بیٹھ گیا۔ اُس کا کام ختم ہو چکا تھا۔ کشت و خون کسی اور کا کام تھا۔

ابو جہل، میرا سابقہ آقا اُمیہ اور دیگر کفار جو اُن کے ساتھ تھے، غارِ ثور کے باہر کھڑے صورتِ حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے بات کرتے تھے مگر پھر بھی ابو بکرؓ کے کانوں میں اُن کی آہٹ پہنچ گئی۔ انہوں نے غار کے اندر سے جھانک

کر دیکھا اور بولے :

"بس اب خاتمہ ہے یا رسول اللہ! باہر آٹھ دس آدمی کھڑے ہیں اور ہم صرف دو ہیں"۔

حضورؐ نے سرگوشی میں جواب دیا:

"تم غلطی کرتے ہو ابو بکر! اللہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔ ہم تین ہیں"۔

یہ وہ وقت تھا جب ایک مکڑی نے غارِ ثور کے تنگ دہانے پر جالا تن دیا اور دو سفید کبوتر کہیں سے اپنی چونچوں میں تنکے پکڑے آئے اور غار کے دہانے پر گھونسلا بنا کر بیٹھ گئے۔ محمدؐ اور ابو بکرؓ غار کی تاریکی میں دبکے بیٹھے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی ننھی مخلوق کو جو غار کے دہانے پر مصروفِ کار تھی، اُن سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

ابو جہل اور اُمیہ پتھروں پر چڑھتے ہوئے غار کے مُنہ تک پہنچ گئے۔ آہٹ سُن کر کبوتر گھبرا کر اُڑے اور مکڑی پتھروں کی کسی درز میں جا چھپی۔ ابو جہل ذرا اور آگے بڑھا تو اُس نے غار کے مُنہ پر تنا ہوا مکڑی کا جالا اور ایک گھونسلا دیکھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ بغیر جالا توڑے کون اندر داخل ہو سکتا ہے! اور جالا پورا تنا ہوا ہے۔ اور پھر یہ گھونسلا۔ پرندے انسانوں کے نزدیک گھونسلے بنا کر بسیرا نہیں کرتے۔ اُس نے وہیں کھڑے کھڑے کھوجی کو بے نقط سنائیں، بڑبڑاتا ہوا نیچے اُترا اور اپنے ساتھیوں سمیت گھوڑوں پر بیٹھ کر واپس مکّہ روانہ ہو گیا۔ کھوجی بھی واپس چلا گیا۔ میں نے سُنا ہے اس واقعے کے بعد اُس نے قسم کھائی تھی کہ آئندہ کسی انسان کا کھوج نہیں لگائے گا۔

مکڑیوں اور کبوتروں کے لئے شاید یہ کوئی غیر معمولی بات نہ ہو۔ مکڑیاں جالے بُنتی ہی رہتی ہیں اور کبوتر گھونسلے بناتے ہی رہتے ہیں لیکن اُس روز پیغمبرِ اسلامؐ اور دینِ اسلام، دونوں کی زندگی کیسے نازک رشتوں پر قائم تھی۔ خسِ آشیاں اور تارِ عنکبوت!

ثور سے قُبا

غارِ ثور میں آپ کا تیسرا دن تھا۔ اُس رات جب عبداللہؓ آئے تو ان کے ساتھ اُن کی ہمشیرہ اسماءؓ بھی تھیں۔ اسماءؓ نے کھانے پینے کا بہت سا سامان ایک تھیلے میں بھرا ہوا تھا۔ عامرؓ بھی اُن کے ساتھ تھے مگر آج وہ اپنی بھیڑیں ساتھ نہیں لائے تھے۔ مکڑی کا جالا آہستہ سے ہٹا کر حضورؐ اور ابو بکرؓ غار سے باہر آئے۔ ماہِ صفر کی آخری تاریخیں تھیں اور ستاروں کی روشنی کے علاوہ کوئی اُجالا نہیں تھا۔ چاروں، رات کی تاریکی میں آہستہ آہستہ پہاڑی سے نیچے اُترے۔ نیچے پہاڑی کے دامن میں اریقط نامی ایک کافر بدوی تین اونٹنیاں لئے کھڑا تھا۔ ان میں دو اونٹنیاں وہ تھیں جو ابو بکرؓ نے سفرِ ہجرت کے لئے بطورِ خاص خرید کر اریقط کے پاس رکھوائی ہوئی تھیں۔ اریقط، صحرا کے چپّے چپّے سے واقف تھا اور مسلمان نہ ہونے کے باوجود بے حد قابلِ اعتماد تھا۔ ابو بکرؓ نے رسولِ کریم کو جو اُونٹنی پیش کی اُس کا نام قصواء تھا۔ حضورؐ نے کہا:

"میں اس اُونٹنی پر سواری نہیں کروں گا جو میری نہیں ہے"۔

ابو بکرؓ نے عرض کی:

"یا رسول اللہ یہ آپ ہی کی ہے"۔

حضورؐ نے کہا:

"نہیں ابو بکر! تم نے اس کی کیا قیمت ادا کی ہے؟"

ابو بکرؓ نے رقم بتائی تو اللہ کے رسولؐ نے کہا:

"میں اسے اس قیمت پر خریدتا ہوں"۔

اس سے پہلے حضورؐ نے ابو بکرؓ کی طرف سے کئی تحفے قبول فرمائے تھے مگر اُس رات ہجرت کے اُس تاریخی لمحے میں اُن کا لہجہ اتنا حتمی تھا کہ ابو بکرؓ نے اصرار مناسب نہ سمجھا۔ یہ ایک پیغمبر کی ہجرت کا لمحہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب اللہ کا رسولؐ اپنے وطن، اپنے آبائی شہر سے اللہ کے نام پر، اللہ کی خاطر، رخصت ہو رہا تھا۔ اپنا سارا بچپن، ساری جوانی، ساری زندگی تج کر وہ ایک قربانی پیش کر رہا تھا۔ یہ اُس کی ذاتی قربانی تھی جو وہ خالصتاً اپنے وسائل سے دینا چاہتا تھا۔ اس کے بعد آپ قصواء پر سوار ہو گئے۔ ابو بکرؓ اور عامرؓ دوسری اونٹنی پر اور اریقط تیسری اونٹنی پر جو وہ اپنے لئے لایا تھا۔ اسماءؓ اور عبداللہؓ نے سامان کا تھیلا اریقط کے حوالے کیا اور پھر تینوں کو اللہ کی امان میں سونپ کر واپس مکہّ چلے گئے۔ تینوں سواروں نے مغرب کا راستہ لیا۔ اب بھی اُن کا رُخ مدینے کی طرف نہیں تھا، بلکہ وہ بحیرۂ احمر کی طرف جا رہے تھے۔ دو دن میں تقریباً پچاس میل کی مسافت طے کر کے وہ ساحلِ سمندر پر پہنچ گئے۔ یہاں سے وہ ساحل کے ساتھ ساتھ شمال مغرب کی طرف مُڑے اور تمام جانے پہچانے راستوں سے بچتے، کتراتے سفر کرتے رہے۔ ان راہوں میں بھی ایک پیچھا کرنے والے نے انہیں تلاش کر لیا۔ وہ اُن کے پیچھے لپکا لیکن اللہ کی قدرت سے اُس کا گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔

وہ پھر سوار ہو کر آگے بڑھا تو اس کے گھوڑے کے سامنے کے دونوں پاؤں ریت میں دھنس گئے۔ یہ عربستان کا مشہور سوار سراقہ بن مالک تھا اور اُس کا مرکب سارے عربستان کا مشہور گھوڑا تھا۔ اُسے اپنے آپ پر اور اپنے گھوڑے پر بہت ناز تھا۔ جب یہ انہونا واقعہ پیش آیا تو سراقہ نے وہیں بڑھ کر حضورؐ کی بیعت کر لی بلکہ اُس نے اُن سے امان کی ایک تحریر کی بھی درخواست کی جو عامر بن فہیرہؓ نے تحریر کی اور جو فتحِ مکہّ کے موقع پر اُس کے کام آئی۔ اُس دن رسول اللہؐ نے اُسے یہ بشارت بھی سنائی کہ ایک دن کسریٰ کے کنگن اُس کے ہاتھوں میں ہوں گے۔ پتہ نہیں اللہ مجھے وہ دن دیکھنے کے لئے زندہ رکھے گا یا نہیں۔ اسی راستے پر ایک شام انہیں بحیرۂ احمر پر ربیع الاول کا نیا چاند نظر آیا جسے دیکھ کر اللہ کے نبیؐ نے فرمایا:

"اے رحمتوں اور برکتوں کے چاند! میرا ایمان اُس پر ہے جس نے تجھے بنایا ہے"۔

وہ ہمیشہ نئے چاند کو دیکھ کر یہی فرمایا کرتے تھے۔ یہ ساری تفصیل میں نے عامرؓ سے سنی جو اس عظیم ہجرت کے تاریخی سفر کے ایک ایک قدم کے عینی شاہد تھے۔ ایک صبح انہوں نے دیکھا کہ سامنے سے ایک چھوٹا سا قافلہ چلا آرہا ہے۔ سب پریشانی میں مبتلا ہو گئے کیونکہ اگر وہ کسی دشمن کا قافلہ تھا تو فرار ہونے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ مگر جلد ہی اُن کی پریشانی خوشی میں تبدیل ہو گئی جب انہوں نے دیکھا کہ وہ ابو بکرؓ کے عم زاد طلحہ بن عبید اللہؓ کا تجارتی قافلہ ہے۔ طلحہؓ شام سے کپڑا اور دیگر سامان مکےّ میں فروخت کرنے کے لئے لا رہے تھے۔ راستے میں انہوں نے مدینے میں بھی قیام کیا تھا۔ طلحہؓ نے انہیں بتایا کہ مدینے میں رسول اللہؐ کی آمد کا نہایت شدت سے انتظار ہو رہا ہے اور یہ کہ وہ خود بھی اپنا سامان فروخت کر کے مدینے ہجرت کر جائیں گے۔ رخصت سے پہلے طلحہؓ نے حضورؐ اور ان کے ساتھیوں کو شام کا نہایت نفیس سفید کپڑا پیش کیا تاکہ وہ لباس تبدیل کر سکیں۔ طلحہؓ کے رخصت ہونے کے تھوڑی دیر بعد اریقط نے شمال مغرب کی بجائے شمال کی طرف رُخ کر لیا۔ اور یہ چھوٹا سا قافلہ

اب آہستہ آہستہ ساحلِ سمندر سے دُور ہوتا گیا۔ کچھ دُور شمال کی طرف چلنے کے بعد اب وہ شمال مشرق کی طرف چلنے لگے۔ یہ مدینے کی سمت تھی۔ اسی راستے میں سورۂ القصص کی وہ آیت نازل ہوئی تھی جس میں اللہ تعالیٰ نے نبیؐ کریمؐ کو مکہّ واپس آنے کی بشارت دی تھی۔

جس نے آپ پر قرآن فرض کیا ہے، وہ آپ کو آپ کے وطن پہنچا کر رہے گا۔

بارہویں دن فجر سے کچھ دیر پہلے وہ وادیٔ عقیق میں داخل ہو گئے۔ اُسے پار کر کے انہوں نے سامنے کے سیاہ پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔ چڑھائی ختم ہوتے ہوتے سورج نصف النہار پر آچکا تھا اور گرمی کی وہ شدت کہ اللہ کی پناہ! عام حالات میں وہ کچھ دیر کسی چٹان کے سائے میں آرام کرتے اور سورج ڈھلے دوبارہ سفر کا آغاز کرتے لیکن یہ عام دن نہیں تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ چلتے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے پہاڑ کی چوٹی سے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ سفر کرنے کے بعد انہیں دُور سے یثرب کے باغات اور کھجوروں کے جھنڈ دکھائی دینے لگے۔ اب تو قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اُن کے خوابوں کی تعبیر، اُن کی امیدوں کا مرکز اُن کے سامنے تھا۔ سخت تھکن اور حدّت کے باوجود وہ آہستہ آہستہ چلتے گئے، قُبا کی طرف جو اس سرسبز وادی کی نزدیک ترین آبادی تھی۔

اِدھر مدینے میں ہم لوگ سخت بے چین تھے۔ اتنی خبر ہمیں مل چکی تھی کہ وہ مکےّ سے نکل چکے ہیں۔ ہر صبح ہماری ٹولیاں اُن کی تلاش میں مدینے آنے والے راستوں پر صحرا میں نکل جاتیں اور چند گھنٹوں بعد جب دھوپ کی شدت برداشت سے باہر ہو جاتی تو واپس لوٹ آتیں۔ طلحہ بن عبید اللہؓ مدینے سے ہو گزرے تھے۔ اُن سے بھی ہم اپنی فکر مندی ہی کا اظہار کر سکے تھے۔ اُن سے ختمی مرتبتؐ کی کوئی خیر خبر نہیں مل سکی تھی۔

اس موسم میں کسی جان دار کا دیر تک دھوپ میں رہنا ممکن نہیں تھا۔ مسافر بھی

سفر روک دیتے تھے اور کسی چھاؤں میں یا اوپر کپڑے تان کر اُن کے نیچے قیام کرتے تھے اور پھر سورج ڈھلنے پر دوبارہ سفر شروع کرتے تھے۔ بچےّ بچےّ کی زبان پر تھا کہ اللہ کا رسولؐ آرہا ہے۔ مسلمان خوش تھے، منافق پریشان تھے اور اہلِ یہود محتاط۔ دو روز سے ہماری پریشانی بہت بڑھ گئی تھی۔ اُن کو مکےّ سے چلے تیرہ دن ہو گئے تھے اور خطرات کا ہمیں پورا پورا اندازہ تھا۔ قریش سے کوئی بات بعید نہیں تھی۔

پھر ایک دن اچانک دوپہر کے کچھ دیر بعد جب ہم سب تھک ہار کر صحرا سے واپس آگئے تھے، مدینے میں ایک شور بلند ہوا۔ گلی کوچوں میں، میدانوں میں، باغات میں ہر شخص دوڑا جا رہا تھا۔ سب سے پہلے قُبا کے ایک یہودی نے انہیں اپنی چھت سے دیکھا تھا۔ دور اُفق کے پاس تین چھوٹے چھوٹے سائے اونٹنیوں کی چال کے زیروبم کے ساتھ اونچے نیچے ہوتے ہوئے مدینے کی سمت بڑھ رہے تھے۔ گرمی کی شدّت کی وجہ سے اونٹنیوں کی رفتار بہت آہستہ تھی۔ تیز دھوپ میں سواروں کے نہایت اُجلے سفید کپڑے چمک رہے تھے۔ تھوڑی سی تشویش بھی تھی کہ اتنے دنوں کے طویل سفر کے بعد سواروں کے یہ صاف شفاف کپڑے۔ کہیں یہ کوئی اور لوگ ہی نہ ہوں۔ بہر کیف ہم لوگ دیوانہ وار، اُن کے خیر مقدم کو تپتے ہوئے صحرا میں دوڑ پڑے، گرتے پڑتے، سنبھلتے، لڑکھڑاتے، ایک دوسرے سے ٹکراتے، کھجوروں کی شاخیں لہراتے، خوشی کے مارے چیختے چلاّتے، اپنی کامیابی پر شاداں، اللہ اکبر کے نعرے لگاتے، اپنے رسولؐ کی سلامتی پر خدا کا شکر ادا کرتے! یہ ربیع الاول کی آٹھ تاریخ تھی اور پیر کا دن۔

مذہب کی تاریخ میں دو عظیم ہجرتیں ہیں۔ مصر سے یہودیوں کی اور مکےّ سے ہماری۔ عیسائی تقویم کے مطابق سن ۶۲۲ تھا، یہودی تقویم کے حساب سے ۴۳۸۲ اور ہم مسلمانوں کی تقویم کی تو ابتدا ہی ہجرت سے ہوتی ہے۔ یہ ہمارا پہلا سال تھا۔

قُبا

قبامیں اللہ کے رسولؐ نے وہاں کے ایک بزرگ کلثوم بن ہدمؓ کے گھر تین دن قیام کیا۔ یہ وہی کلثوم تھے جنھوں نے اس سے پہلے حضرت حمزہؓ اور زیدؓ کی میزبانی کی تھی۔ قبا سے مدینہ کچھ دور نہیں تھا۔ میں تو حضورؐ کی خدمت ہی میں رہتا تھا لیکن مدینے سے آنے والے اوس اور خزرج کے لوگوں کا تانتابندھا رہتا۔ اسی قیام کے دور کی ایک نہایت حسین یاد ایک ایسے شخص کی آمد تھی جو نہ اوس کا تھا، نہ خزرج کا، نہ یہودی، نہ عرب کے کسی اور قبیلے کا۔ یہ ایک عجمی تھا جو بنو قُریظہ کے ایک یہودی عثمان بن الاشہل القرظی کے کھجوروں کے باغ میں کام کرتا تھا۔ یہ باغ قبا ہی میں تھا۔ حضورؐ کی جائے قیام سے تھوڑے ہی فاصلے پر۔ وہ آیا تو اُس کی شکل و شباہت، لب و لہجہ ہمیں بڑا غیر مانوس سا معلوم ہوا۔ اُس کی مٹھی میں چند کھجوریں تھیں۔ بڑی بے ساختگی تھی اُس کے مزاج میں۔ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی

اُس نے بغیر کسی تمہید کے حضورؐ کو کھجوریں پیش کیں اور ساتھ ہی کہا یہ صدقہ ہے۔ آپ نے نووارد کو مسکرا کر دیکھا اور اس کے ہاتھ سے کھجوریں لے لیں۔ میں اُس کی طرف دیکھ رہا تھا اور مجھے اُس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ بات یہیں ختم نہیں ہو گی۔ وہ ٹکٹکی باندھے حضورؐ کو دیکھے جا رہا تھا جیسے اُسے کسی بات کا انتظار ہو۔ آپ نے چند لمحے کھجوریں اپنے پاس رکھیں اور پھر ایک ایک کر کے حاضرین میں تقسیم کر دیں۔ جب سب ختم ہو گئیں اور نووارد نے دیکھا کہ اُنہوں نے اُن میں سے ایک بھی خود نہیں کھائی تو اس کے چہرے پر ایک عجیب و غریب چمک پیدا ہوئی۔ اس کا تن بدن روشن ہو گیا جیسے اندر سے کوئی جوالا پھوٹ رہی ہو۔ مُنہ سے ایک لفظ نہیں کہا اور دل ہی دل میں نہ جانے ایمان کی کتنی منزلیں طے کر گیا۔ ویسے تو ہمارے لئے یہ معمول کی بات تھی، لوگ آتے رہتے تھے اور فرداً فرداً یا گروہوں کی شکل میں اسلام قبول کرتے جاتے تھے لیکن اُس شخص کا بلا استفسار یوں اسلام لے آنا مجھے عجیب سا معلوم ہوا۔ پھر اُس کے تیور بھی ایسے تھے کہ دل میں کئی سوال بیدار ہوئے۔ عجیب شان تھی اس قبولِ اسلام کی۔ ابوذر غفاریؓ کا قبولِ اسلام یاد آ گیا جو اسلام کے اوّلین دنوں میں مکے میں کسی رسول کی آمد کی خبر سُن کر، آپ کے پاس تشریف لائے اور دین کے بارے میں محض دو تین سامنے کے سوال کر کے کلمہ پڑھ لیا۔ اور نہ صرف خود مسلمان ہوئے بلکہ اپنے سارے قبیلے کو مشرف بہ اسلام کرانے کا شرف حاصل کیا۔ اللہ جلّ شانہ، جسے توفیق دے۔

ایک دوسرا واقعہ ایسا ہی بے ساختہ اسلام لانے کا مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جو دل پر نقش ہو جاتے ہیں۔ مدینے میں آئے ہوئے ہمیں نو دس سال ہو چکے تھے۔ ایک سہ پہر ہم مسجدِ نبوی میں حلقہ جمائے بیٹھے تھے۔ حضرت عمرؓ، طلحہ بن عبیداللہؓ، انس بن مالکؓ اور کئی دیگر صحابہء کرام حضورؐ کی بارگاہ میں حاضر تھے۔ دینی مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک شخص اونٹنی کی مہار تھامے خالص بدویانہ انداز

میں بڑی شانِ استغنا کے ساتھ مسجد میں داخل ہوا۔ گٹھا ہوا جسم، بلند قامت، سرخ و سفید رنگت، سر پر گھنے سیاہ بال۔ لٹیں کانوں کے پیچھے سے یوں نکلی ہوئی کہ رخساروں پر ہلال بن گئے تھے۔ اونٹنی کو مسجد کے ایک گوشے میں بٹھا کر نزدیک آیا اور بلند آواز سے پوچھا آپ میں سے محمد کون ہے۔

حضورؐ نے جواب دیا:

"میں ہُوں"۔

بدوی نے کہا:

"آپ کا ایک قاصد ہمارے قبیلے بنو سعد بن بکر میں آیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ آپ کو اللہ نے اپنا رسول بنایا ہے"۔

حضورؐ نے کہا:

"اُس نے سچ کہا"۔

بدوی نے پوچھا:

"آسمان اور زمین کس نے بنائے ہیں؟"

آپ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے"

پھر وہ بولا:

"پہاڑ اور ان میں طرح طرح کی چیزیں کس نے بنائی ہیں؟"

آپ نے جواب دیا:

"اللہ تعالیٰ نے"۔

پھر اس نے پوچھا:

"آپ کو اُسی اللہ کی قسم ہے جس نے یہ سب کچھ بنایا ہے کیا واقعی اُس نے آپ کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے؟"

حضورؐ نے اثبات میں جواب دیا۔

پھر اُس اعرابی نے پوچھا کہ کیا واقعی پانچ نمازیں پڑھنا، سال میں ایک مرتبہ زکوٰۃ دینا، رمضان کے مہینے میں روزے رکھنا اور استطاعت ہو تو حج کرنا اُسی اللہ کا حکم ہے جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔

حضورؐ نے جیسے ہی اثبات میں جواب دیا۔ اس نے بر ملا کلمۂ شہادت پڑھا اور کہا کہ اُس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ میں یہ پیغام قبیلے کے ہر فرد کو سناؤں گا اور اس میں کمی کروں گا نہ بیشی۔ پھر اُس نے نہایت ادب سے سلام کیا اور رخصت چاہی۔ یہ شخص تھا ضمام بن ثعلبہؓ۔ ہم سب اُس طرح دار اعرابی کو رخصت ہوتے دیکھتے رہے۔ وہ اپنی اونٹنی کے پاس گیا۔ اس کی مہار پکڑ کر اُسے اٹھایا اور روانہ ہو گیا۔ جونہی وہ مسجد کی حدود سے باہر نکل کر آنکھوں سے اوجھل ہوا، اللہ کے رسولؐ نے فرمایا اگر یہ گیسوؤں والا سچا ہے تو ضرور جنّت میں داخل ہو گا۔ ایک مرتبہ میں نے عبداللہ بن عباسؓ کو یہ کہتے سُنا تھا کہ میں نے کسی قوم میں ضمامؓ سے بہتر کوئی شخص نہیں دیکھا۔

اُن ہی دنوں نویں ہجری میں فتح مکہؔ سے کچھ عرصہ پہلے بحرین سے تیرہ چودہ آدمیوں کا ایک وفد رسالت مآبؐ سے ملنے مدینے حاضر ہوا تھا۔ اشج عبدالقیس نامی ایک چاق و چوبند نوجوان اُس وفد میں شامل تھا۔ مسجد نبوی کے پاس آکر اُس نے اپنے قافلے کے اونٹ ایک طرف بٹھائے۔ اور سب اونٹوں سے سامان اُتروا کر نہایت سلیقے سے ایک جگہ رکھوا دیا۔ پھر نہایت اطمینان سے اپنا بقچہ کھولا اور دو سفید دُھلے ہوئے کپڑوں کا جوڑا نکالا۔ منہ ہاتھ دھو کر راستے کی گرد دور کی اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر اپنے ساتھیوں سمیت

رسول پاکؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مہمانوں کی آمد پر مَیں حسبِ دستور حضورؐ کے احکامات کے انتظار میں ایک طرف کھڑا تھا۔ اشج آگے بڑھا، نہایت مودبانہ انداز میں حضورؐ سے مصافحہ کیا اور آپ کے دستِ مبارک کو بوسہ دیا۔ اس کے بعد اُس نے اپنا اور اپنے وفد کا تعارف کرایا اور اسلام سے اپنی رغبت کا اظہار کیا۔ کئی اور صحابہ بھی موجود تھے۔ سرورِ کائناتؐ نے اس کی باتیں سن کر مسرت کا اظہار فرمایا اور پھر اُس نوجوان کو غور سے دیکھتے ہوئے فرمایا:

"تمہاری دو خصلتیں ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہیں۔ ایک حلم اور دوسری وقار اور تمکنت"۔

اشج نے کلمات تشکر ادا کرتے ہوئے ان سے پوچھا:

"یہ دونوں خصلتیں مجھ میں بطور تصنع ہیں یا فطری اور جبلی"

رسول اللہؐ مسکرائے اور فرمایا:

"نہیں، عبدالقیس نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا ہی ان خصلتوں پر کیا ہے"۔

اشج عبدالقیس نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اپنے قافلے سمیت اسلام کے دائرے میں داخل ہو کر اہلِ مجلس کے دلوں میں ہمیشہ کے لئے اپنا نقش چھوڑ گیا۔

حضورؐ کے حکم کے مطابق میں نے فرداً فرداً وفد کے تمام اراکین کو تحفے تحائف دے کر رخصت کیا۔

اس کے چند ہی دنوں بعد ایک اور عجیب و غریب وفد مدینے پہنچا۔ یہ بنو تمیم کے لوگ تھے۔ مختصر وفد، تقریباً دس آدمیوں پر مشتمل، نہایت غیر روایتی انداز میں مسجد نبوی کے قریب حضورؐ کے حجرۂ مبارک کے پیچھے کھڑے ہو کر باآوازِ بلند حضورؐ سے مخاطب ہوئے:

"اے محمد باہر آؤ تاکہ ہم آپ سے مفاخرہ اور شاعری میں مقابلہ کریں۔ ہم وہ ہیں

کہ ہماری مدح زینت ہے اور ہماری مذمت عیب"

شور سن کر میں باہر نکلا اور حضورؐ کے حجرے میں جا کر اُنہیں اس وفد کی آمد سے مطلع کیا۔ حضورؐ ایک لمحہ خاموش رہے اور مجھے ظہر کی اذان کا حکم دیا۔ اذان ہوتے ہوتے وفد مسجد میں داخل ہو چکا تھا۔ حضورؐ بھی نماز کے لئے تشریف لے آئے۔ نماز ظہر کے بعد وفد کی طرف سے اُن کے خطیب عطارد بن حاجب نے نہایت فصیح و بلیغ انداز میں اپنے قبیلے کے مناقب و محاسن بیان کئے۔ نبی کریمؐ نے جوابی خطبے کے لئے ثابت بن قیس انصاریؓ کو فرمایا۔ جواب ہو چکا تو بنو تمیم کا شاعر زبرقان کھڑا ہو گیا اور اپنی قبائلی مفاخرت کا قصیدہ پڑھا۔ تمام حاضرین اس صورتِ حال سے لطف اٹھا رہے تھے کہ آخر یہ فصاحت اور زور بیاں کا مقابلہ تھا جس پر عرب جان دیتے تھے۔ قصیدہ ختم ہوا تو حضورؐ کے اشارے پر حسان بن ثابتؓ تشریف لائے اور جواباً ایک نہایت مرصع قصیدہ فی البدیہہ پیش کیا۔ قصیدہ کیا تھا، ایک تخلیقی معجزہ تھا۔ سب حاضرین بے حد متاثر ہوئے۔ یہاں تک کہ مقابلے پر اُترے ہوئے بنو تمیم کے شعراء اور خطیب بھی منصف ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اُن کی طرف سے اقرع بن حابس نے کھڑے ہو کر اعلان کیا:

"اللہ کی قسم آپ کا خطیب ہمارے خطیب سے اور آپ کا شاعر ہمارے شاعر سے بہتر ہے"۔ یہ کہتے ہی باقی لوگ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور سب رسول اللہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے مسلمان ہو گئے۔

بات کہیں سے کہیں نکل گئی۔ اُس دن قبا میں مشرف بہ اسلام ہونے والے جلیل القدر صحابی اور اسلام کے بہت مقتدر فرزند سلمان فارسیؓ تھے۔ حضور نے سلمانؓ سے بہت پیار کیا۔ اُن کو ہمیشہ اپنے گھر کا فرد سمجھا۔ اُن کو آزاد کرانے کی خاطر رقم کا بندوبست کیا اور اُن کے یہودی آقا کے باغ میں صحابہء کرام کے ساتھ مل کر اپنے ہاتھ سے کھجوروں کے پودے

لگائے۔ کلمہ شہادت پڑھنے کے بعد سلمانؓ نے نبی اکرمؐ کو اپنی داستان سنائی کہ وہ ایک زرتشتی خاندان میں پیدا ہوئے جو اصفہان کے قریب ایک گاؤں میں رہتا تھا اور پھر کس طرح وہ تلاشِ حق میں عیسائی راہبوں کی صحبت میں شہروں شہروں، ملکوں ملکوں، پھرتے رہے، کبھی شام، کبھی موصل، کبھی عراق کے شمالی علاقوں میں، اور کس طرح اُن کے آخری مرشد نے اپنی وفات سے پہلے اُنھیں بتایا کہ مزید ہدایت وہ ایک نبیٔ برحق سے پائیں گے جن کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ اُس راہب نے بتایا کہ یہ نبی عرب قبائل سے اُٹھے گا اور دینِ ابراہیم کی دعوت دے گا۔ پھر وہ اپنے وطن سے ہجرت کر کے ایک نخلستان میں آباد ہو گا جس کے دونوں طرف منجمد لاوے کی پتھریلی زمین ہو گی۔ اس کی پہچان یہ ہو گی کہ وہ ہدیہ قبول کرے گا مگر صدقہ نہیں اور اس کے شانوں کے درمیان مہرِ نبوت ہو گی۔ جب سلمانؓ نے یہ سنا تو اُنھوں نے بنو کلب کے ایک قافلے میں شامل ہو کر عربستان کا رُخ کیا۔ اُن کی کچھ بکریاں بھی اُن کے ساتھ تھیں۔ پہلے تو بنو کلب کے قافلے نے ایک ایک کر کے اُن کی ساری بکریاں کھالیں، پھر جب قافلہ خلیج عقبہ کے نزدیک وادی القریٰ میں پہنچا تو اُنھوں نے سلمانؓ سے مزید بد عہدی کی اور اُنھیں ایک یہودی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ وادی القریٰ کے سرسبز علاقے کو دیکھ کر سلمانؓ کو اکثر یہ خیال آتا کہ کہیں یہی وہ جگہ نہ ہو جہاں اللہ کے نبی کو آنا ہے۔ لیکن یہاں پتھریلے لاوے کے نشان نہیں تھے۔ کچھ ہی عرصے بعد اُن کے یہودی آقا نے اُنھیں اپنے ایک عزیز عثمان بن الاشہل کے ہاتھ بیچ دیا جو بنو قریظہ کا فرد تھا اور مدینے میں رہتا تھا۔ وہ انہیں لے کر مدینہ آ گیا جسے دیکھتے ہی اُنھیں یقین ہو گیا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں اللہ کے رسول کی آمد ہو گی۔ سرسبز و شاداب نخلستان اور شہر کے دونوں طرف لاوے کے پتھروں کے پھیلے ہوئے سلسلے۔ اور پھر واقعی کچھ دنوں بعد شہر میں ایک نبی کی آمد کا چرچا شروع ہو گیا۔ اُس دن جب اُنھیں اُن کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ کھجوریں لے کر اُن کی

خدمت میں حاضر ہوئے۔ مگر جب آنے والے معزز مہمان نے صدقے کی کھجوریں خود نہیں کھائیں لور دائیں بائیں بیٹھے ہوئے لوگوں میں تقسیم کر دیں تو وہ بے ساختہ ایمان لے آئے کہ اُنھیں اُن کے مرشد نے یہی نشانی بتائی تھی۔ حضورؐ نے سلمانؓ کی یہ داستان نہایت انہماک سے سنی لور خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنی کہانی لوروں کو بھی سنائیں۔

مدینے کی اسی جنوبی نواحی نگری میں تین دن کے قیام میں ہم سب نے مل کر ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کی۔ یہ اُس مختصر قیام کی دوسری حسین یاد ہے جو دل میں یوں جاگزیں ہے جیسے کل کی بات ہو۔ مسجد کے نام سے آج کل ایک باقاعدہ بنی ہوئی عمارت ذہن میں آتی ہے۔ اسلام کی یہ پہلی مسجد جو اللہ کے رسولؐ کے فرمان پر ہم نے قُبا میں تعمیر کی ایک کھُلا صحن تھی۔ تقریباً سو نمازیوں کے لئے کلثومؓ کے گھر سے کوئی سو قدم کے فاصلے پر ایک قطعۂ زمین ہموار کر لیا گیا۔ اُس پر پڑے ہوئے پتھر اُٹھا دئے گئے۔ جھاڑیاں کاٹ دی گئیں اور اس قطعے کو ایک احاطے کی شکل دے دی گئی۔ یہ تھی اسلام کی پہلی مسجد جہاں مسلمانوں نے، جو اپنے ہادیٔ برحق کی امامت کے لئے ترسے ہوئے تھے، ایک عرصے بعد اُن کی اقتداء میں نماز ادا کی۔ اسی مسجد میں مدینے کے نو مسلموں کو پہلی مرتبہ اللہ کے رسولؐ کے ساتھ نماز ادا کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

جانبِ بطحا

رسول اللہؐ نے قُبا میں تین دن قیام کیا۔ چوتھے روز بارہ ربیع الاوّل کو جمعہ کے دن وہ مدینے کے لئے روانہ ہوئے۔ مدینہ والوں کے وفد پر وفد آ رہے تھے۔ سارے شہر میں اُن کا نہایت بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ مدینے کے راستے میں رانونہ کے مقام پر اُنھوں نے خزرج قبیلے کی ایک شاخ بنو سالم کے لوگوں کے ساتھ نماز جمعہ ادا فرمائی۔ بنو عمرو کے کچھ لوگ قُبا سے اُن کے ساتھ ہو لئے تھے، بنو نجار کے کچھ لوگ جو حضورؐ کے عزیز ہوتے تھے، مدینے سے اُنھیں لینے آئے تھے۔ یوں نماز میں تقریباً ایک سو آدمی تھے۔ نماز کے بعد حضورؐ قصواء پر سوار ہو کر مدینے کی طرف چل پڑے۔ ابو بکرؓ اور کئی دیگر لوگ بھی اونٹنیوں پر سوار تھے۔ قصواء آگے آگے چل رہی تھی۔ اس قافلے کے دائیں بائیں اوس اور خزرج کے گھڑ سوار زرہ بکتر پہنے ہوئے، ہاتھوں میں ننگی تلواریں لئے جلوس کے ساتھ ساتھ چل رہے

تھے۔ راستے میں دونوں طرف مردوں، عورتوں اور بچوں کے ہجوم تھے جو خوشی سے نعرے لگا رہے تھے۔ بنو نجار کی بچیاں دف بجا بجا کر خوش آمدید اور استقبال کے گیت گا رہی تھیں۔ جوں جوں شہر نزدیک آ رہا تھا، ہجوم میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مدینے میں اتنی خوشی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ پھر چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں :

"حضور میرے یہاں قیام فرمائیے"

"مجھے سعادت بخشئے حضور!"

"میرے یہاں رہئے یا رسول اللہ!"

"مجھے خدمت کا موقع دیجئے"

"میرا گھر بہت وسیع ہے، اُس میں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی"

"میرے مہمان بنئے حضور!"

"میں اور میرے اہلِ خانہ ہمہ وقت آپ کی خدمت بجالائیں گے"

"مجھ پر کرم فرمائیے، یا رسول اللہ!"

"میرا غریب خانہ حاضر ہے یا نبی!"

"یا رسول اللہ! مجھے مایوس نہ کیجئے گا"۔

رسالت مآبؐ نے محسوس فرمایا کہ اگر اُنھوں نے کسی ایک کے حق میں فیصلہ دے دیا تو باقی لوگوں کی دل شکنی ہوگی، شہر میں چہ مہ گوئیاں شروع ہو جائیں گی، لوگ سوچ میں پڑ جائیں گے اور شہر ذہنی اعتبار سے منقسم ہو جائے گا۔ دعوت دینے والوں میں سب کے سب محبّت اور عقیدت سے سرشار نہیں تھے۔ ان میں جہاں عبداللہ بن رواحہؓ جیسے سرفروش شامل تھے، وہاں چند منافق بھی تھے۔ سب سے زیادہ زور تو عبداللہ بن اُبَی دے رہا تھا، مدینے کا مانا ہوا ریاکار بلکہ رئیس المنافقین۔ اُس نے بڑھ کر قصواء کی مہار تھام لی، گویا وہ اللہ کے رسولؐ

کو اپنی مرضی کے راستے پر لے جا سکتا تھا۔ کہنے لگا :

"مدینے میں میرا گھر سب سے خوب صورت ہے، یا رسول اللہؐ۔ اُس میں باغ بھی ہیں۔ شہر میں میرے یہاں سے اچھا کھانا کہیں نہیں پکتا"

نبی کریمؐ کسی کی دلآزاری نہیں چاہتے تھے مگر فیصلہ کیسے ہو۔ میں نے اکثر دیکھا کہ وہ الجھے ہوئے معاملات کا بڑا آسان حل نکال کیا کرتے تھے۔ میں اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ اُنھوں نے ہلکا سا تبسّم فرمایا اور قصواء کی گردن پر تھپکی دیتے ہوئے فرمانے لگے :

'میزبانوں کی تعداد اتنی بڑی ہے کہ میں کسی ایک کے حق میں فیصلہ نہیں کر سکتا۔ قصواء نے میرے سفرِ ہجرت میں مجھ سے اتنی وفاداری کی ہے کہ میں فیصلہ اسی پر چھوڑتا ہوں،،۔

پھر اُنھوں نے اپنی چھڑی ہوا میں بلند کی اور فرمایا :

" قصواء جہاں جا کر رُکے گی، میں وہیں قیام کروں گا اور وہیں اپنی مسجد تعمیر کروں گا"۔

ہم سب اپنے نبیؐ کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ قصواء جدھر جاتی ہم بھی جاتے۔ وہ جدھر مڑتی، ہم بھی مڑ جاتے۔ باغوں، کھجوروں کے جھنڈوں، گلیوں میں سے گزرتی ہوئی قصواء، بنو نجار کے محلے سے بھی گزر گئی، جہاں حضورؐ نے بچپن میں چند سال بسر کئے تھے۔ چلتے چلتے ایک جگہ پہنچ کر قصواء رک گئی۔ میں نے فوراً چاروں طرف نظر دوڑائی، حضورؐ کے قیام اور مسجد کی مناسبت سے جگہ کا جائزہ لینے لگا۔ قصواء کچھ دیر وہاں کھڑی رہی۔ زمین پر پڑا ایک پتہ کھایا۔ اِدھر اُدھر دیکھا، کچھ سونگھا، اپنی ٹانگ کو کھجلایا۔ ایک قدم پیچھے ہٹی، پھر بیٹھنے کے لئے اپنی ٹانگیں دہری کیں مگر حضورؐ نیچے نہیں اُترے۔ بیٹھتے بیٹھتے وہ اچانک کھڑی ہو گئی اور پھر آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ ہم سب بھی چل پڑے۔ اتنے میں پیچھے سے میرے کان میں

آواز آئی۔ مڑ کے دیکھا تو عبداللہ بن اُبّی تھا جو کہہ رہا تھا:

"وہ میری توقع سے زیادہ ہوشیار نکلے۔ اونٹنی کے فیصلے سے کس کی دلآزاری ہو سکتی ہے"۔

قصواء دو قدم چلتی تھی تو میں چار۔ جب تک دُنیا قائم ہے قصواء زندہ رہے گی۔ اُس وقت بھی جب لوگ سکندرِ اعظم کے گھوڑے (Bucephalus) کو بھول چکے ہوں گے، جب کسی کو یاد بھی نہیں ہوگا کہ ایک (Incitatus) نامی گھوڑا بھی تھا جسے (Caligua) نے روم کا سینیٹر بنادیا تھا۔ اس لئے کہ قصواء محمدؐ کی اونٹنی تھی جس پر اُنھوں نے ہجرت فرمائی تھی۔ سفید رنگ، سوچتی ہوئی آنکھیں، بڑے بڑے نتھنے، سُتا ہوا جسم، قصواء اپنی جنس میں خوب صورتی کا مرقع تھی لیکن اس میں بھی ایک نقص تھا۔ اُس کے بائیں کان کا سرا ذرا سا کترا ہوا تھا۔ بہت دن پہلے اونٹوں کی لڑائی میں ایک اونٹ نے اُس کا کان چبا ڈالا تھا۔ باقی اُس کا سارا جسم بے داغ تھا۔

تھوڑی دور چل کر قصواء واپس مڑی اور وہیں آگئی جہاں اُس نے پہلے بیٹھنے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا میدان تھا جس کے کناروں پر کھجوروں کے پانچ درخت تھے۔ ہم بہت غور سے قصواء کی ہر حرکت کو دیکھ رہے تھے۔ آخر اُسے ایک عظیم فیصلہ کرنا تھا۔ ہم سوچ رہے تھے کہ پتہ نہیں یہاں بھی وہ رکے گی یا نہیں۔ اتنے میں اُس نے نہایت ڈرامائی انداز میں آہستہ آہستہ اپنے گھٹنے دوہرے کیے۔ ذرا آگے کو جھکی، پھر گردن اوپر اُٹھائی، ایک طرف کو مڑی زمین کو کچھ دیر سونگھتی رہی، دم ہلا کر مکھیاں اڑائیں، ہلکی سی آواز میں بلبلائی، شمال کو یروشلم کی سمت دیکھا، پھر جھکی مگر اس دفعہ اُس نے اپنا سارا بوجھ زمین پر ڈال دیا۔ اس بار حضورؐ نیچے اُتر آئے اور اُنھوں نے بآوازِ بلند اعلان فرمایا:

"میں یہاں رہوں گا، یہیں میری مسجد بنے گی اور یہیں میں دفن ہوں گا"۔

قصواء جس جگہ بیٹھی تھی وہ بونجار کے محلے کا ایک احاطہ تھا۔ بونجار محمدؐ کے ننھیالی عزیز تھے۔ حضورؐ کے دادا عبدالمطلب کی والدہ اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ رشتہ قائم رہا۔ آپؐ کے چچا عباسؓ جب کبھی تجارت کے سلسلے میں شمال کا سفر کرتے تو مدینے میں اپنے خاندان کے ساتھ چند روز ضرور قیام کرتے تھے۔

سیدُالانبیاؐ قصواء سے اُترتے ہی اُس احاطے کے طول و عرض کو نہایت غور سے دیکھنے لگے۔ اُن کے ساتھ اُنھیں مدینے میں خوش آمدید کہنے والے مسلمانوں کا ایک ہجوم تھا مگر یوں لگتا تھا کہ اس وقت وہ سب کی موجودگی سے بے نیاز، بالکل تنہا ہیں۔ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے چاروں طرف نظریں دوڑا رہے تھے۔ اس احاطے میں ایک طرف ایک پُرانے ٹوٹے پھوٹے گھر کا ملبہ پڑا تھا۔ اس کے سامنے ایک کھلا ہموار میدان تھا جہاں کھجوریں سکھائی جاتی تھیں۔ اس میدان کے دوسری طرف ایک گوشے میں چند پرانی قبریں تھیں اور اس طرف جہاں قصواء بیٹھی تھی ایک چھوٹا سا احاطہ تھا جو بونجار کے محلے کی مسجد کے طور پر کام آتا تھا۔ اس میں بیس پچیس نمازیوں کی گنجائش تھی۔ جگہ جگہ کھجوروں کے درخت لگے ہوئے تھے، کہیں کہیں خاردار جنگلی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ سب کی نظریں حضورؐ کے روئے مبارک پر جمی ہوئی تھیں۔ ہر شخص خاموش تھا۔ وہ احاطے کا جائزہ لے چکے تو انھوں نے ہجوم سے نظریں ملائیں۔ ایسے محسوس ہوا جیسے یکایک وہ کسی خواب سے چونک کر بیدار ہوئے ہیں۔ حاضرین نے اُنھیں اپنی طرف متوجہ دیکھا تو سب ایک ایک دو دو قدم ان کے قریب آگئے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ جگہ کس کی ہے۔ ایک شخص نے جواب دیا کہ رافع بن عمروؓ کے بیٹوں سہلؓ اور سہیلؓ کی ملکیت ہے۔ رافعؓ وفات پا چکے ہیں اور یہ دونوں یتیم بھائی خزرج کے سعد بن زرارہؓ کی سرپرستی میں ہیں۔ یہاں یہ نماز کی جگہ سعدؓ نے بنا رکھی ہے۔ سعدؓ کچھ فاصلے پر کھڑے تھے اپنا نام سُن کر آگے بڑھے تو آپ نے اُنھیں اپنے پاس بلالیا اور فرمایا کہ اس احاطے

کے وارثوں سے اس کی قیمت طے کروادیں۔ سہلؓ اور سہیلؓ بھی وہیں موجود تھے۔ فوراً مجمع سے نکل کر رحمتِ عالمؐ کے سامنے آکھڑے ہوئے اور نہایت ادب سے کہا:

"اے اللہ کے رسولؐ۔ یہ جگہ ہم آپ کی نذر کرتے ہیں۔ ہمیں کوئی معاوضہ نہیں چاہئے"۔

حضورؐ نے یہ سُن کر خوشی کا اظہار فرمایا مگر اُن کے نزدیک مسجد نبوی اور نبی کی مستقل جائے سکونت، جسے پہلی مملکتِ اسلامیہ کا مرکز و محور بننا تھا، کسی کا عطیہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ ہجرت وہ سنجیدہ اور تاریخ ساز واقعہ تھا کہ آپ نے ابو بکرؓ کی بے حد مخلصانہ اور مؤدبانہ درخواست کے باوجود قصواء کی قیمت ادا کرنے پر اصرار فرمایا تھا۔ چنانچہ سعدؓ کی مدد سے احاطے کی قیمت طے کر کے چکادی گئی۔ پہلی بیعتِ عقبہ کے بعد جب مصعب بن عمیرؓ کو مدینے کے نو مسلموں کو قرآن سکھانے کے لئے مدینے بھیجا گیا تھا تو سعد بن زرارہؓ نے اُنھیں مہمان رکھا تھا۔ سعدؓ اس بیعت سے ایک سال قبل مکے میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ اس وقت مدینے کے صرف چھ لوگ ایمان لائے تھے جو سب خزرج کے تھے۔

قیمت کی ادائیگی کے دوران میں ابو ایوب خالدؓ قصواء کی طرف بڑھے اور اس پر لدا ہوا حضورؐ کا سامان اُتار کر اپنے گھر لے گئے جو اس احاطے سے بالکل متصل تھا۔ یہ وہی ابو ایوبؓ تھے جنھوں نے دوسری بیعتِ عقبہ میں اپنے قبیلے والوں میں سب سے پہلے بیعت کی سعادت حاصل کی تھی۔ اس وقت بھی چند لوگوں نے رسولِ کریم کو اپنے یہاں قیام کی دعوت دی لیکن اُنھوں نے مسکرا کر فرمایا کہ انسان کو اپنے سامان کے ساتھ ہی رہنا چاہئے۔ یہ کہہ کر وہ ابو ایوبؓ کے ہمراہ اُن کے گھر تشریف لے گئے جہاں ابو ایوبؓ نے اپنے مکان کی نچلی منزل اُن کے لئے خالی کردی اور خود اوپر کی منزل میں منتقل ہو گئے۔

سعد بن زرارہؓ کا گھر بھی قریب تھا۔ وہ قصواء کو اپنے گھر کے احاطے میں لے گئے۔

تعمیرِ مسجد

دوسرے دن فجر کی نماز ختم ہوتے ہی ہم لوگوں نے کام شروع کر دیا۔ ہر شخص کا چہرہ جذبۂ ایمانی سے دمک رہا تھا۔ اللہ کے رسولؐ نے خود ایک نیزے کی نوک سے زمین پر مسجد کی حدود کھینچ دیں۔ کھجوروں کے درخت قدرتی طور پر نہایت مناسب فاصلوں پر لگے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا اللہ تعالیٰ نے اُنھیں اسی مقصد کے لئے اُگایا تھا کہ وہ ہماری مسجد کے ستونوں کا کام دے سکیں، اور ظاہر ہے اللہ تعالیٰ ہی نے قصواء کی رہبری فرمائی تھی جس کے نتیجے میں اس جگہ کا انتخاب ہوا تھا۔

حضورؐ نے اپنے دستِ مبارک سے حدودِ مسجد کا تعین فرمادیا، تو یوں لگا جیسے مسجد ہمارے ذہنوں میں تعمیر ہو گئی۔ اب صرف یہ کام باقی تھا کہ جو مسجد ہمارے ذہنوں میں بن گئی تھی اُسے زمین پر منتقل کر دیں۔ ہم لوگ دیوانہ وار کام میں جُٹ گئے۔ ہر شخص کام میں ایک

دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا تھا۔ ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی ہم نے اینٹیں بنائیں، پتھر ڈھوئے، لکڑی چیری، گارا ملایا، جھاڑ جھنکاڑ کاٹے، زمین کو ہموار کیا، بنیادیں کھودیں، سیڑھیاں بنائیں۔ اُن پر چڑھ چڑھ کر اینٹ گارا اوپر پہنچایا، رسّے باندھے، ٹھوک پیٹ کی اور سب کچھ اس خوش دلی کے ساتھ کہ ہمیں لگتا تھا ہم کام نہیں کر رہے، رقص کر رہے ہیں۔ اسی موقع پر عبداللہ بن رواحہؓ نے دو شعر کہے جنھیں ہم نے اپنے کام کا ترانہ بنالیا۔ خود نبیؐ بھی ہمارے ساتھ صدا بلند کر رہے تھے۔ وہ شعر کچھ یوں تھے۔

نیکی وہی جو روزِ قیامت کو ہو شمار
تو سب کا مددگار، مہاجر ہو کہ انصار
ہے زندگی تو اصل میں عقبیٰ کی زندگی
انصار و مہاجر تری رحمت کے طلب گار

سرورِ دو جہاںؐ اس کام میں ہمارے ساتھ برابر شریک رہے۔ خود اینٹیں اُٹھا اُٹھا کر لاتے اور سیڑھیوں پر چڑھ چڑھ کر، پتھر، اینٹیں، گارا، مسالا اوپر پہنچاتے۔ وہ جو کام بھی کرتے مدینے کے چھوٹے چھوٹے بچے اُن کی مدد کے لئے اُن کے ساتھ ساتھ ہولیتے۔ ظاہر ہے بچوں کا یہ کام نہیں تھا۔ کام میں مدد ہونے کی بجائے، کام بگڑ جاتا تھا مگر حضورؐ اُن کی دل شکنی نہیں فرماتے تھے۔ اُنھیں بچوں سے اتنا پیار تھا کہ ایک ایک کام کئی کئی بار کر لیتے مگر اُن کو منع نہیں کرتے تھے۔ میں نے اُن کے کام میں خلل پڑتے دیکھا تو میں اپنا کام چھوڑ کر گیا اور بچوں کو منع کرنے کی کوشش کی مگر حضورؐ نے الٹا اُنھیں میرے سر منڈھ دیا۔ فرمانے لگے:

"بچو دیکھو بلال بے چارہ اکیلا کام کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی نہیں۔ ذرا اُس کی مدد کر دو"۔

یہ سننا تھا کہ سارے میرے گرد ہو گئے اور مجھے اُن سے پیچھا چھڑانے کے لئے ایک

درخت پر چڑھنا پڑا۔ حضورؐ اپنا پسینہ بھی پونچھتے جاتے تھے اور میری حالت پر تبسم بھی فرماتے جاتے تھے۔

ایک دفعہ اُنھوں نے ایک چھوٹے سے بچّے کو گود میں اُٹھالیا جو ابھی ٹھیک طرح سے چل بھی نہیں سکتا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پتھر دیا اور اپنے کندھوں سے اونچا کر کے اُسے کہا کہ یہ پتھر دیوار میں لگا دو۔ بچے نے پتھر لگا دیا تو حضورؐ نے فرمایا:

"شاباش! اب تم اپنے سارے دوستوں کو بتانا کہ یہ مسجد میں نے بنائی ہے"۔

یہ کہہ کر اُنھوں نے اُسے زمین پر کھڑا کر دیا اور وہ ڈگمگاتا ہوا اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔ اس کے سارے چہرے پر، ایک کان سے دوسرے کان تک، مُسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ خوشی سے اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ مجھے وہ خوش نصیب بچہ اکثر یاد آتا ہے۔ ہنستا ہوا معصوم چہرہ، دائیں گال پر گارے کی لکیر بنی ہوئی، پتہ نہیں وہ کون تھا، کس قبیلے، کس خاندان کا تھا، بڑا ہو کر کیا بنا، آج کل کس حال میں ہو گا۔

سب نبیِ اکرمؐ کو آرام کرنے کے لئے کہتے تھے مگر وہ کسی کی نہیں سُنتے تھے، کہتے تھے مجھے بھی ثواب کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی آپ سب کو۔ حمزہؓ نے بطورِ خاص اُن سے پل بھر آرام کی درخواست کی تو اینٹیں اُٹھاتے اُٹھاتے اُنھوں نے اپنی عبا اس زور سے جھٹکی کہ اس پر پڑی ہوئی ریت اُڑ کر حمزہؓ کے چہرے پر جا پڑی اور وہ دامن سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے واپس آگئے۔ اس کے بعد اُنھوں نے اُنھیں کبھی کام سے نہیں روکا لیکن کام کرتے وقت اُن کی نظریں ہمیشہ اُنھیں کی طرف رہتی تھیں۔ اُن کی کیا ہم سب کی۔

وہ ہمیشہ سکھاتے تھے کہ کام ایک طرح کی عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ کام کرنے والے ہاتھوں سے پیار کرتا ہے۔ اُن کی ساری تعلیم یونہی چلتے جاتے، باتوں باتوں میں ہوتی تھی اور اسی لئے زندگی سے بے حد قریب تھی۔ کسی جانور پر زیادہ بوجھ لدا دیکھتے تو پیشانی پر شکن آ

جاتی۔ فوراً ناراضگی کا اظہار فرماتے۔ جانوروں پر ظلم اُن کی برداشت سے باہر تھا۔

آخر ایک دن آیا کہ ہماری مسجد تعمیر ہو گئی۔ کچھ حصے پر کھجور کے تنوں کے شہتیروں پر کھجور کی شاخوں کی چھت پڑی ہوئی، چھت کا وزن کھجوروں کے تنوں پر تھا جو ستونوں کا کام دے رہے تھے۔ زیادہ حصہ کھلا تھا، ایک بڑے صحن کی شکل میں۔ شمالی دیوار میں جائے امامت کے سامنے دونوں طرف پتھر چُن دئے گئے تھے۔ یہ یروشلم کا رُخ تھا۔ ہمارا قبلہ اوّل۔

اگلے سال رجب شعبان کے دن تھے، رسالتمآبؐ مدینے کے نواح میں انصار کے قبیلے بنو سَلِمہ کی مسجد میں ظہر کی نماز پڑھا رہے تھے، دو رکعتیں ہو چکی تھیں کہ ایک وحی نازل ہوئی جس کی تعمیل میں آنحضرتؐ نے حالتِ نماز ہی میں بیت اللہ کی سمت رُخ کر لیا اور اُن کے ساتھ ہی سب مقتدیوں نے باقی دو رکعتیں بیت اللہ کی سمت ادا فرمائیں۔ اُسی دن مسجد نبوی میں بھی عصر سے پہلے پہلے قبلے کا رُخ بدل دیا گیا۔

مواخات

مسجد کی تعمیر مکمل ہوتے ہی ہم سب کو مہاجرین کی آبادکاری کی فکر لاحق ہو گئی۔ ہجرت کرنے والوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی۔ یہ کوئی بہت بڑی تعداد نہیں تھی، لیکن مدینہ خود ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ اُس کے وسائل اس قدر محدود تھے کہ ہر مہاجر کے لئے مستقل گزر بسر کا خاطر خواہ انتظام ایک شدید مسئلہ بن گیا تھا۔ مہاجرین میں بہت تھوڑے تھے جو اللہ کے کرم سے خود کفیل تھے۔ بیشتر ایسے تھے جو مکّے سے لٹے پٹے، بے سروسامان محض تن کے کپڑوں کے ساتھ دعوتِ ہجرت پر لبیک کہتے ہوئے اپنا گھر بار، کاروبار، مال متاع چھوڑ چھاڑ اللہ تبارک و تعالیٰ کے بھروسے پر مدینے آپہنچے تھے۔ مکّے جیسے تجارتی شہر میں ساری عمر گزارنے کے بعد ایک زرعی شہر میں آبسنے کے اپنے مسائل تھے۔ پھر دونوں شہروں میں موسم اور آب و ہوا کا بڑا فرق تھا۔ مہاجرین کی معاشی، سماجی، نفسیاتی حالی شب و روز کا موضوعِ گفتگو بن گیا تھا۔ جہاں چار شخص جمع ہو جاتے گفتگو اسی بنیادی نکتے پر آ ٹھہرتی

کہ اتنے گمبھیر مسائل کیسے سلجھیں گے لیکن اللہ کے رسولؐ نے یہ ساری مشکلات اپنی پیغمبرانہ فراست سے آنِ واحد میں حل کر دیں۔

ایک روز انہوں نے مکّے سے آئے ہوئے تمام خاندانوں کے سربراہوں کو انس بن مالکؓ کی والدہ اُمِ سُلیمؓ کے گھر بلوایا اور ساتھ ہی مدینے کے چند نسبتاً خوش حال لوگوں کو بھی دعوت دی۔ وقت مقررہ پر سب اُمِ سُلیمؓ کے گھر کے وسیع و عریض احاطے میں جمع ہو گئے۔ حضورؐ تشریف لائے۔ حسبِ عادت سب کو مسکرا کر دیکھا اور انصار کو مخاطب کرتے ہوئے مہاجرین کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ سب آپ کے دینی بھائی ہیں اور اُسی دینِ برحق کے نام پر، جو آپ کا بھی دین ہے، اپنا سب کچھ تج کر یہاں آئے ہیں۔ اِن کی مدد آپ کا فرض ہے۔ پھر آپ نے تجویز پیش فرمائی کہ انصار کا ہر خاندان مکّے کے ایک خاندان کو اپنے خاندان میں شامل کر لے، اس کے دکھ سکھ میں شریک ہو جائے اور حسبِ مقدور اُس کا بوجھ بانٹ لے۔ مواخات کا یہ فیصلہ اسلام کے سبقِ اخوت کا سب سے بڑا عملی مظاہرہ تھا جسے دُنیا نے آج سے پہلے اس پیمانے پر کبھی نہیں دیکھا تھا، اور یہ شرف اُمِ سُلیمؓ کے حصے میں آیا کہ سرورِ کائناتؐ نے اس عظیم تاریخی فیصلے کے لئے اُن کے گھر کا انتخاب کیا۔ یہ کوئی جز وقتی، سطحی، عارضی مصلحت کیشی نہیں تھی۔ مہاجر و انصار دونوں نے اپنے آقاؐ کے قائم کیے ہوئے اس رشتے کی ایسی لاج نبھائی کہ مرتے دم تک یہ بندھن نہ ٹوٹا۔ اسی طرح چھوٹے پیمانے پر مساکین کی آباد کاری کے حل کے لئے مکّے میں بھی حضورؐ کے حکم پر اخوت کا ایسا ہی منصوبہ تیار ہوا تھا جہاں حمزہؓ، زیدؓ کے بھائی بنے تھے، ابوبکرؓ، عمرؓ کے، عثمانؓ، عبدالرحمان بن عوفؓ کے، زیدبن العوامؓ، عبداللہ بن مسعودؓ کے۔ مگر آج کی مواخات علی الحق اتنے بڑے پیمانے پر اور اتنے دور رس نتائج کی حامل ہوئی کہ مکّے کی مواخات کا اس سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مواخات ایک نظریاتی تعلق تھا جو رنگ، نسل

اور قبائلی عصبیت کے تمام اختلافات اور امتیازات سے بالاتر تھا اور جو صرف اور صرف رضائے رسولؐ اور دینِ حق سے وابستگی کی بنیاد پر قائم تھا۔ جب رسولِ اکرمؐ ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری خاندان کو مواخات کی تسبیح میں پرو رہے تھے، میں بھی ایک طرف کھڑا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ میں ایک حبشی جو کل تک ایک معمولی غلام تھا خود ہی اپنا خاندان تھا، خود ہی خاندان کا سربراہ۔ غلاموں کے کون سے خاندان ہوتے ہیں؟ مجھ پر نظر پڑی تو پاس بلا کر میرا ہاتھ ابو رویحہؓ انصاری کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس طرح ہم دونوں بھائی بن گئے ہم ایک دوسرے سے گلے ملے اور گلے ملتے ہی یوں لگا جیسے ہمارا رشتہ خونی رشتوں سے بھی زیادہ گہرا ہو گیا۔ ایک مستقل رشتہ جسے دم کے ساتھ نبھانا تھا۔

مواخات کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ مکّے کے مہاجر اب اپنا سارا بوجھ مدینے والوں پر ڈال کر بے فکر ہو جائیں گے اور مفت خور مہمانوں کی طرح زندگی بسر کریں گے۔ مہماں نوازی کا وقت گزر چکا تھا۔ ہادیِ برحقؐ نے اس رشتے کی وضاحت فرمائی کہ اب تک جو ایک تھا وہ دو ہو گیا۔ جو دو تھے وہ اب چار ہو گئے۔ جہاں ایک کماتا تھا، اب دو کمائیں گے۔ جہاں دو محنت کرتے تھے چار محنت کریں گے۔ کام زیادہ ہو گا تو آمدنی بھی زیادہ ہو گی اور یوں کوئی کسی پر بار نہیں بنے گا۔ اس طرح کئی سو خاندان ایک لمحے میں گزر بسر کے وسائل حاصل کرنے کے اہل ہو گئے اور پھر یہ سوال ہی نہ رہا کہ کون کس کا بوجھ اُٹھا رہا ہے، کون مہاجر ہے کون انصار۔ یہ تفریق ہی مٹ گئی۔

ارقمؓ، ابو طلحہ زید بن سہلؓ کے بھائی بنے۔ عثمان بن مظعونؓ کی مواخات ابوالہیثم بن التیہانؓ سے ہوئی۔ زبیر بن العوامؓ کا ہاتھ سَلَمہ بن سلامہؓ کے ہاتھ میں دیا گیا۔ دونوں اُس وقت جوان تھے، یہی کوئی ستائیس اٹھائیس سال کے۔ ایک اور نوجوان طلحہؓ جو اس وقت تقریباً چوبیس سال کے تھے اپنے ہم عمر ابی ابن کعبؓ کے ساتھ رشتۂ اخوت

میں پروئے گئے۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ، سعد بن الربیعؓ کے بھائی بنے۔ سعدؓ انصار میں سب سے زیادہ مالدار اور فیاض مانے جاتے تھے۔

سرورِ کائناتؐ کے اشاروں پر دونوں طرف سے ایک ایک شخص آگے بڑھتا جاتا تھا اور حضورؐ اپنے دستِ مبارک سے اُن کے ہاتھ ملواتے جاتے تھے۔ اور باقاعدہ بیعت لیتے جاتے تھے۔ ابو عبیدہ بن الجراحؓ آگے بڑھے تو ان کا ہاتھ ابن معاذؓ کے ہاتھ میں دے دیا۔ سعید بن زیدؓ، رافع بن مالکؓ کے بھائی بن گئے۔ عبداللہ بن مسعودؓ، معاذ بن جبلؓ سے منسلک ہو گئے۔ اسی طرح عمار بن یاسرؓ اور حذیفہ بن الیمانؓ، صہیب بن سنانؓ اور حارث بن السحہؓ، محرز بن نضلہؓ جنھیں سب اخرم اسدی کہتے تھے اور عمار بن حزم مواخات کے رشتوں میں پروئے گئے۔ شماس بن عثمانؓ نہایت خوبرو نوجوان تھے اُن کا رشتہ مواخات اُن کے ہم عمر نوجوان حنظلہ ابنِ ابی عامرؓ سے طے ہوا۔ عمیر بن ابی وقاصؓ اُس وقت کوئی چودہ سال کے تھے۔ رسالتمآبؐ نے ان کا ہاتھ عبدالاشہل قبیلے کے رئیس سعد بن معاذؓ کے چھوٹے بھائی عمرو بن معاذؓ کے ہاتھ میں دے دیا۔ اُن کی بھی تقریباً یہی عمر تھی۔ یہ عمیر بن ابی وقاصؓ وہی نوجوان تھے جن کو صغر سنی کی وجہ سے غزوہ بدر میں شرکت کی اجازت نہیں ملی تھی۔ لیکن اُن کی گریہ وزاری دیکھ کر حضورؐ نے نہ صرف اُنھیں اجازت مرحمت فرمائی بلکہ اپنے دستِ مبارک سے اُنھیں تلوار باندھی۔ بدر میں یہ نوجوان صحابی رتبۂ شہادت پر سرفراز ہوئے۔

اپنے لئے اور اپنے خاندان کے لئے ہادی برحقؐ نے کسی کے ساتھ مواخات نہیں فرمائی۔ کیونکہ مواخات کوئی آنی جانی چیز نہیں تھی، کوئی ایسا تعلق نہیں تھا کہ رہا رہا نہ رہا نہ رہا۔ یہ ایک مستقل رشتہ تھا۔ ایک ایسا معاملہ جس میں حضور خود کو منسلک فرما لیتے تو یا اوس کے کہلانے لگتے یا خزرج کے۔ اور ان کے منصبِ جلیلہ کی مرکزی حیثیت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ

نہ اوس کو خزرج پر ترجیح دیں نہ خزرج کو اوس پر۔ ایسے نازک اور لطیف توازن حضورؐ ہمیشہ قائم رکھتے تھے۔ قُبا کے قیام کے سلسلے میں بھی یہی لطیف توازن مدِ نظر تھا۔ آپؐ نے اوس کے بزرگ کلثوم بن ہدمؓ کو اس لئے شرفِ میزبانی بخشا تھا کہ ابوبکرؓ خزرج کے یہاں مہمان تھے اور یوں قبیلۂ خزرج میں خاصی موقر سطح پر مہاجرینِ مکہ کی نمائندگی ہو چکی تھی۔

ابو رویحہؓ، رحمٰن الرحیم اُنھیں خوش رکھے۔ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ یہیں دمشق میں میرے قریب ہی رہتے ہیں۔ بڑے کہنے سننے کے بعد مدینے سے آنے پر رضامند ہوئے۔ اُن کے لئے امیر المومنین سے باقاعدہ اجازت لی، جیسی میں نے اپنے لئے لی تھی۔ بے حد ایثار پسند۔ میرے لئے اُنھوں نے جو کچھ کیا اور جس جس طرح سے اُنھوں نے میری دلجوئی کی اور ہر موقعے پر جس طرح میرے دست و بازو بنے اس کا اجر اُنھیں اللہ تبارک و تعالیٰ سے ملے گا۔ شام کی مہم کے موقعے پر میں مدینے سے روانہ ہونے لگا تو حضرت عمرؓ نے مجھ سے پوچھا کہ بلال تم چلے جاؤ گے تو تمھارا وظیفہ کون وصول کرے گا۔ میں نے ابو رویحہؓ کا نام لیا۔ وہ ایک مدّت تک میری طرف سے یہ ذمے داری نبھاتے رہے۔

آج کل تو زیادہ وقت یادِ الٰہی میں گزارتے ہیں۔ کبھی کبھار میرے یہاں آجاتے ہیں یا میں اُن کے یہاں چلا جاتا ہوں۔ نہایت کھرے، سچے، خوش اخلاق اور نفیس مزاج انسان ہیں۔ جس دن سے رسولِ کریمؐ نے میرا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دیا ہے ہم ایسے ہو گئے ہیں جیسے ایک درخت کی دو شاخیں جو باہم ایک دوسرے میں پیوست رہتی ہیں۔ اللہ نے اس رشتے کی برکت سے ہم دونوں کو بہت نوازا۔ بڑی رحمتیں نازل فرمائیں ہم پر۔ جی چاہتا ہے جس طرح ہم دونوں کو اس دنیا میں رفاقت نصیب ہوئی ہے اُسی طرح آخرت میں بھی ربِّ رحیم ہمیں ایک دوسرے کے قریب رکھے۔ آمین۔

پہلی اذان

مدینے میں ہماری مسجد سے بہتر بنی ہوئی کئی عمارتیں تھیں مگر ہم لوگ کون سے فنِ تعمیر کے ماہر تھے۔ ہمیں تو یہ عمارت ساری دنیا کی عمارتوں سے زیادہ اچھی لگتی تھی۔ مقصد تو صرف یہ تھا کہ اپنی عبادت کے لئے ایک موزوں جگہ بنالی جائے۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ یہی مسجد ایک دن اسلامی تمدّن اور ریاست کا سرچشمہ بنے گی۔ مسجد جس دن مکمل ہوئی ہم لوگ تھک ہار کے مسجد کے فرش پر بیٹھ کر آرام کرنے لگے۔ ہلکی ہلکی دھوپ چھپّر پر پڑے ہوئے کھجوروں کے پتّوں کے درمیان سے چھن چھن کر نیچے آرہی تھی۔ سبز پتّوں کا سایہ آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہا تھا۔ ہر شخص مسجد کی تعمیر کے مختلف مراحل پر اور ساخت کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کررہا تھا۔ سب بہت خوش تھے۔ اتنے میں جہاں تک مجھے یاد ہے علیؓ نے کہا:

”میرے خیال میں مسجد میں ایک کمی ہے“۔

سب اُن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انہوں نے اُوپر چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"وہاں کچھ ہونا چاہئے۔ کچھ ایسا انتظام جس سے لوگوں کو نماز کے لئے بلایا جا سکے"۔

اس پر عمارؓ بولے:

"میرے خیال میں ہم وہاں ایک جھنڈا لگا دیں۔ نماز کے وقت لگا دیا، پھر اُتار لیا"۔

اب سب اٹھ کر بیٹھ گئے اور گفتگو میں شامل ہو گئے۔ رسولِ کریمؐ یہ سب گفتگو نہایت دلچسپی سے سنتے رہے مگر خود کچھ نہیں بولے۔ ان کا انداز ایسا تھا گویا وہ گفتگو میں شریک ہیں بھی اور نہیں بھی۔

"ہم چھت پر گھنٹیاں کیوں نہ لگا دیں"۔

"گھنٹیاں تو کلیساؤں میں لگاتے ہیں"۔

"نقارہ لگانا چاہئے"۔

"نقارہ جنگ اور خون کی یاد دلاتا ہے۔ ہمارا دین امن اور سلامتی کا دین ہے"۔

"قرنا مناسب رہے گا۔ اُس کی آواز بہت دور تک جاتی ہے"۔

"قرنے کی آواز سے مینڈھا ذہن میں آجاتا ہے جس کے سینگ سے وہ بنتا ہے"۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ جھنڈے، گھنٹیاں، نقارہ، قرنا کوئی بھی ان تجاویز سے پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ گھنٹیاں دیر تک کانوں میں جھنجھناتی رہتی ہیں، نقارہ دورانِ خون کو تیز کر دیتا ہے، جھنڈا ہوا کے رُخ پر اڑتا ہے اور مخالف سمت سے نظر ہی نہیں آتا۔ پھر جھنڈا سوتے ہوؤں کو کیسے جگائے گا۔

اتنے میں میں نے دیکھا کہ عبداللہ بن زیدؓ آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے کھسکتے ہوئے

آگے آ رہے ہیں۔ عبداللہؓ انصار کی طرف سے مسجد کی تعمیر میں شامل تھے۔ میں نے انہیں دوسری بیعتِ عقبہ کے موقع پر بھی دیکھا تھا۔ وہ اُن پچھتر آدمیوں کے وفد میں شامل تھے جو مدینے سے آیا تھا۔ شرمیلے اتنے تھے کہ ڈرتے تھے ہوا بھی اُن کی حرکت سے مرتعش نہ ہو جائے مگر خزرج کا یہ شرمیلا نوجوان اگلے ہی لمحے ساری کائنات کو مرتعش کرنے والا تھا۔ میں حضورِ اکرمؐ کے پاس بیٹھا تھا۔ جب مجھے لگا کہ عبداللہؓ حضورؐ کو کچھ کہنا چاہ رہے ہیں تو میں نے انہیں اپنی جگہ دے دی تاکہ وہ جو کہنا چاہ رہے ہیں، اطمینان سے کہہ لیں۔ انہوں نے نہایت دھیمی آواز سے کہا:

"یا رسول اللہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ سبز کپڑے پہنے ہوئے ایک شخص ہاتھ میں ناقوس لئے جا رہا تھا۔ میں نے اُس سے کہا اے اللہ کے بندے کیا تم مجھے یہ ناقوس بیچ دو گے۔ اُس سبز پوش نے پوچھا کیا کرو گے اس کا۔؟ میں نے جواب دیا، اسے بجا کر لوگوں کو نماز کے لئے بلاؤں گا۔ اس پر اس نے کہا نماز کے لئے بلانے کا میں تمہیں اس سے بہتر طریقہ بتاتا ہوں۔ تم یہ کہا کرو:

الله اكبر الله اكبر

الله اكبر الله اكبر

اشهدان لااله الا الله

اشهدان لا اله الا الله

اشهدان محمداً رسول الله

اشهدان محمداً رسول الله

حيّ على الصلوة

حیّ علی الصلوٰۃ

حی علی الفلاح

حی علی الفلاح

اللہ اکبر اللہ اکبر

لا الٰہ الا اللہ

میں نے رسول اللہؐ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس سے ایک دو روز پہلے عمرؓ نے بھی اسی قسم کا خواب حضورؐ کو سنایا تھا مگر آپ نے کوئی فیصلہ نہیں صادر فرمایا تھا۔ ابنِ زیدؓ کی زبان سے وہی خواب سُن کر حضورؐ نے اسے تائیدِ ایزدی سمجھ کر قبول فرمایا۔ کہنے لگے :

"عبداللہ ، تمہارا خواب سچا ہے۔ ایسا ہی ہو گا۔ نماز کے لئے اسی طرح بلایا جایا کرے گا۔ کوئی شخص یہ الفاظ کہا کرے گا"۔

یہ طے ہو گیا تو اب سوال یہ تھا کہ یہ الفاظ کس انداز میں، کیسے ادا کیے جائیں گے۔ میٹھے لہجے میں، نرم لہجے میں، اعلانیہ انداز میں، کتنی زور سے، مرد کی آواز میں، عورت کی آواز میں، بچے کی آواز میں، کسی نوجوان کی آواز میں، کسی بزرگ کی آواز میں یا بیک وقت کئی لوگوں کی آواز میں!

"بلال تمہاری آواز میں"۔

حضورؐ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا :

"عبداللہ تم بلال کو یہ الفاظ یاد کرادو"۔

مسجد میں بیٹھے ہوئے سارے لوگوں کی نگاہیں مجھ پر تھیں۔ وہ کچھ کہہ بھی رہے تھے مگر میں ابھی تک حضورؐ کے فیصلے کے سحر میں تھا۔ مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ یکایک

حضورؐ کے الفاظ کا مفہوم مجھ پر پوری طرح واضح ہو گیا۔ مجھ ناچیز سیاہ فام حبشی کے ذمے یہ خدمت سپرد کی گئی تھی کہ میں مسلمانوں کو نماز کی سعادت کے لئے بلایا کروں۔ یہ خود میرے لئے کتنی بڑی سعادت تھی۔ پھر حضورؐ کی آواز اُبھری :

"بلال تمہاری آواز سب سے اچھی ہے۔ اسے اللہ کی راہ میں استعمال کرو"۔

زیدؓ جو میرے پاس ہی بیٹھے تھے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے :

"کاش میرے پاس اسلام کو دینے کے لئے کوئی ایسا تحفہ ہوتا"۔

یہ زید بن حارثہؓ کے الفاظ تھے جنہوں نے اسلام کو اتنا کچھ دیا تھا۔ بعد میں اکثر جب میں اذان کے لئے کھڑا ہوتا تھا زیدؓ کے یہ الفاظ میرے ذہن میں جاگ اُٹھتے تھے۔ انہی باتوں میں نماز کا وقت ہو گیا تو اللہ کے رسولؐ نے مجھے حکم دیا۔

"جاؤ اُس چھت پر چڑھ جاؤ اور وہاں سے لوگوں کو نماز کے لئے بلاؤ"۔

جس چھت کی طرف انہوں نے اشارہ فرمایا تھا وہ مسجد سے ملحق بونجار کی ایک خاتون کے کچے گھر کی کچی چھت تھی۔ آج کل مسجدوں میں مؤذن کے لئے کیا کیا انتظام ہوتے ہیں۔ پکی سیڑھیاں بنی ہوتی ہیں اور مؤذن نہایت آرام سے اُن پر چڑھ کر اذان دیتا ہے۔ میں حسبِ حکم جوں توں کر کے اُس چھت پر چڑھ گیا مگر میں پھر بھی اطراف میں لگے ہوئے کئی کھجور کے درختوں سے نیچا تھا۔ سب سے بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ عبداللہؓ کے بتائے ہوئے الفاظ میرے ذہن میں نہیں آرہے تھے۔ سب لوگ مسجد کے صحن سے، جہاں چھت نہیں تھی، میری طرف دیکھ رہے تھے اور منتظر تھے۔ مگر وہ الفاظ، پہلے کیا تھا؟ اللہ کی توصیف، پیغمبرِ اسلامؐ کی شہادت، نماز کی دعوت سب کچھ گڈمڈ ہو گیا تھا۔ سب مجھے دیکھے جا رہے تھے۔ رسالت مآبؐ تیسرے ستون کے پاس کھڑے تھے۔ اُن کی نظریں بھی مجھ پر تھیں۔ ابو بکرؓ اور عمرؓ اُن کے قریب کھڑے تھے۔ عمرؓ تو یوں لگتا تھا کہ

آدھے ستون تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اُن کے ساتھ سعد بن خثیمہؓ تھے جنہوں نے مدینے آمد پر مجھے اپنے یہاں مہمان ٹھہرایا تھا۔ پھر نبیِ کریمؐ نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے اور مجھے اس انداز سے اشارہ کیا گویا مجھے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر بلند کر رہے ہوں۔ اسی لمحے مجھے اپنی آواز سنائی دی۔ پہلے بہت دُور سے اور پھر آہستہ آہستہ قریب آتی ہوئی۔

اللہ اکبر، اللہ اکبر

اللہ اکبر، اللہ اکبر

اشھدان لاالٰہ الا اللہ

اشھدان لا الٰہ الا اللہ

اشھدان محمدؐ رسول اللہ

اشھدان محمدؐ رسول اللہ

حیّ علی الصلوٰۃ

حیّ علی الصلوٰۃ

حیّ علی الفلاح

حیّ علی الفلاح

اللہ اکبر، اللہ اکبر

لا الٰہ الا اللہ

تمام عالمِ اسلام میں ہر روز پانچ دفعہ یہ الفاظ فضا میں گونجتے ہیں بلکہ مختلف ملکوں میں طلوع و غروب کے اوقات کے فرق کی وجہ سے شاید ہی کوئی لمحہ ایسا ہو جب دنیا کے کسی نہ کسی حصے سے اذان کی آواز نہ بلند ہو رہی ہو۔ مگر یہ ہماری پہلی اذان تھی۔ میں اذان دے کر نیچے اُترا تو حضورؐ نے مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔ اللہ کا رسولؐ اور ایک غلام زادہ۔ چاروں طرف

لوگ اِدھر اُدھر آجا رہے تھے۔ اذان کی آواز سُن کر محلّے کے بہت سے بچّے اکٹھے ہو گئے تھے جنہوں نے مجھے چھت پر کھڑے دیکھا اور اب میری طرف اشارے کر کر کے ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔ اُن کے لئے یہ ایک عجوبہ تھا۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ بہت دیر تک حضورؐ نے کچھ نہیں فرمایا۔ میں بھی ایک عجیب سُرور سے سرشار تھا۔ اتنے میں مَیں اُن کی آواز پر چونکا:

"بلال، تم نے میری مسجد مکمل کر دی"۔

ان الفاظ پر میں نے وہیں شکرانے کے دو نفل ادا کیے۔ بلالِ حبشی نے اپنی زندگی کا مقصد پالیا تھا۔ لوگ اگر میرے بارے میں سب کچھ فراموش کر دیں، اور ویسے بھی میرے پاس یاد رکھے جانے کی کیا بات ہے، مگر پھر بھی میں اسلام کے پہلے مؤذن کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیا جاؤں گا۔

پہلی اسلامی مملکت

مدینے میں ہجرت سے پہلے کوئی مملکت نہیں تھی کہ نظم و نسق کے لئے پہلے سے بنے ہوئے قوانین اور قواعد میں تھوڑا بہت ردّوبدل کر کے کام چلا لیا جاتا۔ صرف قبیلے ہی قبیلے تھے جو ایک دوسرے سے سر بہ گریباں رہتے تھے۔ باہمی حسد اور بغض و عناد اتنے گہرے تھے کہ اُن کی تمام صلاحیتیں سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔ پھر یہاں غیر مسلم بھی آباد تھے۔ مدینہ کئی خوش حال یہودی قبائل کا گھر تھا۔ مذہبی بنیادوں پر قائم ہونے والی مملکت میں غیر مسلموں کے ساتھ بطورِ خاص کوئی مناسب معاملہ ضروری تھا۔ منافق بھی تھے، کمزور ایمان والے بھی۔ ایسے بھی جو ذرا فاصلے سے نئی صورتِ حال کا جائزہ لے رہے تھے کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ جو کچھ ہوا تھا وہ سب کے لئے اتنا نیا، اتنا چونکا دینے والا، اور اکثر کے لئے اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ نئے حالات سے نبٹنے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ صرف ایک بات سب جانتے تھے کہ اب حالات حسبِ سابق ہرگز نہیں رہیں گے۔

سب سے پہلے تو نبیِ کریمؐ نے ایک ایک کر کے سب قبائلی سرداروں سے ملاقاتیں کیں۔ اُنھیں مل جُل کر رہنے کی افادیت کا قائل کیا۔ پھر سب کے ایما پر اُنھوں نے اس نئی شہری مملکت کا سربراہِ اعلیٰ بننا قبول فرمایا۔ اس کے بعد اپنی فراست اور سب کی رضامندی سے ایک دستور مرتّب کیا جو دُنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور تھا۔ میرا ایمان ہے کہ پہلی اسلامی مملکت کا یہ دستور ابد تک انسانی زندگی کی تہذیب کرتا رہے گا۔

سرکاری اُمور بڑھے اور نوزائیدہ مملکت کے مسائل نے سر اُٹھایا تو رسولِ اکرمؐ نے فوج، عدلیہ، انتظامیہ، خزانہ، درس و تدریس، تجارت، خارجی امور وغیرہ کے ادارے قائم کئے اور ہر شعبے میں ایسی راہیں کشادہ فرمائیں جن میں باطنی جامعیت کے ساتھ ساتھ معاشی اور معاشرتی عدل تھا، جو ایسے متوازن تصوّرِ حیات کی عکاس تھیں کہ اس کے سامنے زندگی کا ہر متبادل تصوّر، ہیچ دکھائی دیتا تھا اور جس میں رہتی دُنیا تک ہر دَور کے مسائل کو سلجھانے کی صلاحیت تھی۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ زندگی کا کاروبار تو اس سے پہلے بھی جیسے تیسے گھسٹ رہا تھا لیکن زندگی کو قرینے اور سلیقے سے گزارنے کی راہیں نکلیں تو کایا ہی پلٹ گئی۔

سب سے پہلے حضورؐ نے کاتبوں کی ایک بڑی تعداد جمع کی اور اُن کو مختلف شعبوں کے امور کی تفصیلات اور کوائف کی تحریر کا کام سپرد فرمایا۔ کچھ لوگ کاتبِ وحی تھے، کچھ آمدنی کا اندراج کرتے تھے کہ کس کس نے، کب کب، کتنی کتنی رقم یا جنس سرکاری خزانے میں جمع کرائی، مالِ غنیمت کتنا آیا اور کیسے کیسے خرچ ہوا۔ کچھ سرکاری خزانے سے پنشن پانے والوں کی تفصیلات کا ریکارڈ رکھتے تھے۔ ایک کاتب کی ذمے داری یہ تھی کہ وہ اُن بالغ لوگوں کی فہرستیں مرتب کرے جو جنگ کے لئے موزوں بھی ہیں اور ضرورت پڑنے پر فوراً جنگ کے لئے روانہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کوئی باقاعدہ فوج تو تھی نہیں۔ یہی رضاکار تھے جو جنگ کی صورت میں حالات سے نبٹنے کے لئے ہمہ وقت مستعد رہتے تھے۔ اُنھیں سرکاری خزانے

سے وظیفہ دیا جاتا تھا۔

اُمورِ مملکت کا بوجھ آپڑا تو چند ہی ماہ میں ہماری تعمیر کی ہوئی مسجد ناکافی ہوگئی کیونکہ یہ صرف ہماری جائے عبادت نہیں تھی بلکہ مدینے میں قائم ہونے والی پہلی مملکت اسلامیہ کا صدر دفتر اور تمام ملتِ اسلامیہ کا دینی اور سیاسی مرکز و محور بھی تھی۔ چنانچہ مسجد کی توسیع کے لئے ہم ایک بار پھر کمربستہ ہوگئے۔ یہ توسیع اس لئے بھی ضروری تھی کہ قریبی محلوں میں جو مسلمان اپنی چھوٹی چھوٹی مساجد میں نماز ادا کرتے تھے، اللہ کے رسولؐ کی امامت میں نماز کی سعادت حاصل کرنے بہت بڑی تعداد میں ہماری مرکزی مسجد میں آنے لگے تھے۔ ساتھ ہی رسول اللہؐ کے رہنے کا مسئلہ تھا۔ اُمّ المومنین حضرت سوداؓ اور حضورؐ کی صاحبزادیاں اُمّ کلثومؓ اور فاطمہؓ ساتھ تھیں۔ ابھی تک آپ ایوب خالدؓ کے مہمان تھے۔ چنانچہ مسجد میں توسیع ہوئی اور ساتھ ہی چار حجرے تعمیر کیے گئے۔ ایک سوداؓ کے لئے، ایک اُمّ کلثومؓ، اور فاطمہؓ کے لئے، ایک عائشہؓ کے لئے جن کی رخصت کے دن قریب آرہے تھے اور ایک حجرہ سرکاری خزانے کے لئے جس میں سرکاری رقم اور سرکاری ملکیت کی چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ یہ حجرہ مقفّل رہتا تھا۔ حضورؐ نے حکومت کی آمدنی اور خرچ کا حساب کتاب میرے سپرد فرمادیا تھا۔ گویا مجھے دُنیا کی پہلی اسلامی مملکت کا پہلا وزیرِ خزانہ بنادیا گیا تھا۔ بہت بڑی سعادت تھی یہ مجھ غلام زادے کی کہ مجھے اتنی بڑی ذمے داری سونپی گئی۔ مؤذن کی حیثیت سے تو میرے ساتھ میرے محترم بزرگ ابن اُمِ مکتومؓ بھی تھے لیکن اس نئے فرضِ منصبی میں کوئی میرا کوئی شریکِ کار نہیں تھا اس سرورِ عالمؐ کی رہنمائی شامل تھی جس سے میں اپنی ذمے داری سے عہدہ برآ ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو یہ کام مجھے بہت مشکل نظر آیا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا نبیِ کریمؐ کی توجہ سے میری پریشانیاں کم ہوتی گئیں۔

ابتدا میں میری مشکل یہ تھی کہ آمدنی کے نہ ذرائع معین تھے نہ مقدار۔ یہ بھی

نہیں معلوم تھا کہ آمدنی کی صورت کب پیدا ہو گی۔ اُدھر خرچ کی مدیں مقرر تھیں۔ یہ لکھ چھوڑنا کہ کتنی رقم وصول ہوئی، کب اور کہاں سے وصول ہوئی۔ کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن متوقع آمدنی کا اندازہ نہیں لگ پاتا تھا۔ نہ یہ علم تھا کہ آمدنی کب ہو گی۔ اُدھر خرچ تھے کہ رُکتے ہی نہیں تھے۔ غریبوں اور محتاجوں کی امداد جس میں حضورؐ کے حکم پر اہلِ صفّہ کے تقریباً اسی نوے حضرات کی کفالت شامل تھی، مختلف سرکاری امور پر مقرر کارکنوں کی تنخواہیں، جنگ میں گرفتار ہونے والے مسلمانوں کی گلوخلاصی کے لئے رقم کی ادائیگی، بیواؤں کی خبر گیری، بے وسیلہ مقروضوں کی اعانت، مسافروں کی دیکھ بھال، سرکاری مہمانوں کی تواضع اور ان سب کے علاوہ وہ خرچ جو کسی خاص صورتِ حال میں ایسے لوگوں پر اُٹھتا تھا جن کی کسی خاص وجہ سے دلجوئی منظور ہوتی تھی۔ یہ سب اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کے احکامات تھے۔ پھر غزوات اور سرایہ کے اخراجات۔ یہی صورتِ حال تھی ہمارے بجٹ کی، زکوٰۃ کی فرضیت یعنی ۹ ہجری سے قبل۔ اس کے بعد صورتِ حال بہت بہتر ہو گئی تھی کیونکہ باقاعدہ اور بروقت آمدنی کے ذرائع بن گئے تھے۔ اس سے پہلے تو یہ تھا کہ کچھ مسلمان رضاکارانہ طور پر اپنی آمدنی سے کچھ رقم حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے۔ مدینے میں زیادہ تر زراعت کا کاروبار تھا چنانچہ لوگ کبھی کبھی اپنی صوابدید پر فصلوں کا کچھ حصہ اجناس کی صورت میں دے جاتے تھے جو مال خانے کے حجرے میں جمع کر لیا جاتا تھا۔ یہی مال خانہ میرا سرکاری دفتر تھا۔ زکوٰۃ فرض ہونے سے پہلے آمدنی کی ایک اور صورت پیدا ہو گئی تھی۔ فتوحات ہونے لگی تھیں اور مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ سرکاری خزانے میں آجاتا تھا۔ کبھی خرچ آمدنی سے زیادہ ہوتا تھا تو رسالت مآبؐ نماز کے خطبے میں یا خاص طور پر مسلمانوں کا اجلاس بلوا کر سب کو رضاکارانہ طور پر رقم جمع کرانے کی تلقین فرماتے تھے اور اللہ کے کرم سے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اندازے سے کم رقم جمع ہوئی ہو۔

بدر

مجھے، جو جیتے جی موت کے کرب سے گزر چکا ہے، کسی کی جان لینا اچھا نہیں لگتا۔ شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ نے مجھے شمشیر زنی کا نہ شوق دیا نہ استعداد، بڑی کوشش کی لیکن مبتدی کا مبتدی رہا۔ حمزہؓ اور علیؓ دونوں نے میرے ساتھ بہت مغز مارا مگر میں اس فن میں کوئی مہارت نہ حاصل کر سکا۔ مدِمقابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا، آنکھوں آنکھوں میں اسے تولنا، اُس کی قدوقامت اور قوت کا اندازہ لگانا، پھر اپنے پورے قد کا استعمال کرتے ہوئے وزن آگے کی طرف ڈال کر اُس پر وار کرنا، یہ سب کچھ مجھے کبھی نہیں آیا۔ یہ سارے کام ایک ایک کر کے تو میں کچھ حد تک کر لیتا تھا لیکن ایک ساتھ یہ سب کچھ مجھ سے نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کچھ بھول جاتا تھا، کبھی کچھ۔ غزوہ بدر سے ایک دن پہلے علیؓ سارا دن مسجد کے عقب میں مجھے مشق کراتے رہے، تلوار کے وار اور ہر وار کی مناسبت سے قدموں کا استعمال سکھاتے رہے۔ میرا قدموں کا استعمال ٹھیک تھا۔ حمزہؓ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے میرے جسم

کی چستی کی تعریف کی۔ علیؓ نے کہا کہ میں اپنے قد کا مناسب فائدہ اٹھاتا ہوں مگر میرے بازو میرے قدموں کا ساتھ نہیں دے پاتے تھے۔ ویسے دل ہی دل میں ہم سب جانتے تھے کہ جنگ تو ہمیں قوتِ بازو سے نہیں قوتِ ایمان سے لڑنا تھی۔ اسلام کے معرکوں میں ہمیں واقعی یہ محسوس ہوتا تھا کہ دشمن ہمارے سامنے موم کی طرح پگھلتا جارہا ہے اور ہماری نگاہیں ہی اُس کا پتہ پانی کرنے کے لئے کافی ہیں۔

اللہ کے رسولؐ کو علم تھا کہ جنگ جوئی میرے خون ہی میں نہیں تھی، اس لئے انہوں نے مجھے دوسرے فرائض سونپ دئے۔ میرے سپرد یہ کام تھا کہ میں فوج کے راشن کا بندوبست کروں۔ فوج کیا تھی صرف تین سو آدمی تھے لیکن غربت کے اس دور میں تین سو کی خوراک کا انتظام بھی معنی رکھتا تھا، مگر ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال رہی اور مدینے سے بدر روانگی اور واپس مدینے آنے تک کھانے کا سارا انتظام ٹھیک رہا۔ اس عرصے میں مجھے خوراک جمع کرنے کے لئے تمام حربے استعمال کرنا پڑے۔ کسی سے مانگا، کسی سے خریدا، کسی سے اُدھار لیا، کسی کو اللہ تعالیٰ کا خوف دلایا۔ یہ تو لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ اُن دنوں میری حالت اُس مرغی جیسی تھی جس کی نظر سے ایک دانہ بھی نہیں بچتا تھا۔ مگر یہ مبالغہ ہے کہ بلال نے چیونٹیوں کو بھی معاف نہیں کیا۔ جہاں اُن کی قطار دیکھتا، ساتھ ساتھ چل پڑتا تاکہ اُن کا جمع کیا ہوا ذخیرہ بھی اٹھا لائے۔ ویسے صورتِ حال اس سے بہت زیادہ مختلف بھی نہیں تھی۔

بدر میں مسلمان کام ضرور آئے مگر کسی نے بھوک سے نڈھال ہو کر شہادت نہیں پائی۔ مدینے سے روانگی سے قبل ہی ہمیں اللہ جلّ شانہٗ کی طرف سے اُس کی رضا کی بشارت مل چکی تھی اور اُس نے ایک لمحے کے لئے بھی ہمیں ہمارے حال پر نہیں چھوڑا۔ ہماری جنگ دفاعی تھی، محدود تھی اور صرف اللہ کے لئے تھی جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیات

میں ہمیں حکم ملا تھا:

اللہ کی راہ پر جنگ کرو،
اُن کے خلاف،
جو تم سے جنگ کرتے ہیں،
جنہوں نے تمہیں بے گھر کیا۔
لڑو مگر خود جنگ نہ شروع کرو
کیونکہ اللہ جنگ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔
اور پھر جب تمہارا دشمن جنگ روک دے
تو تم بھی جنگ روک دو۔

جنگ ٹھن ہی گئی تو اللہ کے رسولؐ نے اس محاذ کی بھی ایسی قیادت کی کہ بڑے بڑے عسکری ماہر اُن کی حکمتِ عملی پر رشک کرتے ہیں۔ انہوں نے جنگ میں یہاں تک طے فرمادیا تھا کہ کون کہاں، کس کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ فوج کی تنظیم کی بھی ایک نئی صورت وضع کی۔ جب ہم لوگ میدانِ جنگ میں اُترے تو ہماری فوج ایک نیا منظر پیش کر رہی تھی۔ صحرائی جنگوں میں رواج یہ تھا کہ لوگ الگ الگ چھوٹے چھوٹے دستوں کی شکل میں جنگ کرتے تھے۔ ایک دائرے میں، یہاں معرکہ آرائی ہو رہی ہے تو کچھ فاصلے پر ایک دوسرے حلقے میں مدمقابل ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں اور تمام دائروں میں ریت خون سے رنگی جا رہی ہے۔ زخمی گر رہے ہیں، لاشیں تڑپ رہی ہیں۔

ہمیں حضورؐ نے یہ ہدایت دی تھی کہ ہم سب ایک ساتھ رہیں۔ ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں۔ گویا ہر شخص کو ایک قلعے کا حصہ بنادیا تھا جس میں ہر ایک اپنے قریبی ساتھی کے لئے باعثِ تقویت تھا۔ یہی حکمتِ عملی ہم نے بعد کی جنگوں میں بھی نہایت کامیابی سے

استعمال کی اور زک صرف اُس وقت اٹھائی جب اس سے انحراف کیا۔ حضورؐ کا ارشاد تھا :

"آج جنّت تلواروں کے سائے میں ہے۔ آج جو شہادت پائے گا فرشتے اُسے خود جنّت تک لے کر جائیں گے مگر سب شہداء کے زخم اُن کے سینوں پر ہونے چاہئیں، پشت پر نہیں"۔

ہمیں یہ تعلیم دی گئی تھی کہ ہماری ہر جنگ اصولوں کی خاطر لڑی جائے گی، ہوائے نفس کے لئے نہیں۔ رسول اللہؐ نے جنگ کا دائرہ محدود کرنے کے لئے بھی قواعد مرتب فرمائے اور اُن کے اعلان کے لئے میرا انتخاب فرمایا۔ سردیوں کی شام تھی اور فارس کی ہوا چل رہی تھی۔ موسم میں بے حد خنکی تھی۔ آج سے پہلے میں نے حضورؐ کو کبھی اتنا خاموش اور آپ ہی آپ میں اتنا گم نہیں دیکھا تھا۔ جب انہوں نے مجھے ہدایات دینے کے لئے پاس بلایا تو مجھے بہت آگے جھک کر اُن کے الفاظ سننا پڑے تھے۔ ہدایات دے کر حضورؐ رخصت گئے۔ آج شام وہ وقت سے بہت پہلے خیمے میں چلے گئے تھے جہاں انہوں نے رات بہت دیر گئے تک عبادت کی اور مسلمانوں کی فتح کے لئے دعائیں فرمائیں۔

دوسرے دن صبح میں ایک بلند مقام پر کھڑا ہو گیا۔ مدینے کے درختوں کے جھنڈ میرے پیچھے تھے اور میرے سامنے سپاہِ اسلام تھی جسے اسلام کی پہلی جنگ میں شریک ہونا تھا۔ تین سو نفوس اور اُن کے سامنے صحرا، جدھر ہمیں کوچ کرنا تھا۔ فضا میں کوئی پرندہ نہیں تھا۔ ہوا ساکت تھی اور آسمان پر سفید بادل کا صرف ایک ٹکڑا تیر رہا تھا۔ میں نے بآوازِ بلند سب کو مخاطب کیا اور اللہ کے رسولؐ کی ہدایات کا اعلان کیا۔ جو کچھ اُس دن میری زبان سے ادا ہوا مجھے اُس پر فخر ہے :

"جنگ کے قواعد یہ ہوں گے،
کوئی کسی عورت یا بچے پر ہاتھ نہیں اُٹھائے گا،

کوئی کھیت میں کام کرتے ہوئے کسی کسان پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا،
کوئی کسی ضعیف آدمی پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا،
کوئی کسی اپاہج پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا،
کوئی کسی پھلدار درخت کو نہیں کاٹے گا،
اگر کسی سے کھانے کو کچھ لیا تو اُس کی قیمت ادا کی جائے گی،
کوئی جنگی قیدیوں کو رسیّوں سے نہیں جکڑے گا،
کوئی خود سوار ہو کر قیدیوں کو پیدل چلنے پر مجبور نہیں کرے گا،
جو ہتھیار ڈال دے گا اُس کے ساتھ نرمی سے پیش آیا جائے گا،
دوبارہ تاکید ہے کہ کوئی بچوں پر ہرگز ہاتھ نہیں اُٹھائے گا"۔

بچوّں کے متعلق مجھے حضورؐ نے دو مرتبہ اعلان کرنے کو فرمایا تھا۔ یہ تھی ہماری تعلیم و تنظیم۔ کُل تین سو سترہ آدمی، جن میں چھیاسی مہاجر تھے، خزرج کے ایک سو ستّر اور اوس کے اکسٹھ۔ ستّر اونٹ تھے اور صرف دو گھوڑے۔ مکےّ سے جو فوج ہمارے ساتھ لڑنے آ رہی تھی اُس میں ایک ہزار آدمی، سات سو پچاس اُونٹ اور ایک سو گھوڑے تھے۔ ہم لوگوں نے درختوں کی چھالیں اپنے جسموں پر باندھ کر ڈھالوں کا کام لیا۔ ہمارے مدِمقابل فولاد کے زرہ بکتر پہنے تھے۔ گھوڑوں پر سوار ہو کر حملہ آور ہوتے تو ہمیں لگتا تھا سروں پر چٹانیں منڈلا رہی ہیں۔

لیکن فتح ہماری ہوئی!

یہاں میں اپنے خلاف ایک الزام کی تردید کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے ایک جنگی قیدی کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ یہ جنگی قیدی اُمیہ تھا، میرا سابقہ آقا جس نے ایک بار مجھے مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔ یہ سب جانتے تھے کہ بلال اور اُمیہ کے درمیان کوئی رو رعایت

نہیں تھی جیسے کہ بارہ سال پہلے اُمیہ اور بلال میں کوئی رورعایت نہیں تھی۔ اسی پس منظر میں مجھ پر عائد کردہ الزام کو زیادہ ہوا ملی۔

جب جنگِ بدر کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوا تو شام خاصی گہری ہو چکی تھی۔ اُمیہ ہتھیار ڈالنے کی تیاری کر رہا تھا مگر ابھی تلوار اُس کے ہاتھ میں تھی۔ جیسے ہی اُس نے اچانک مجھے اپنے گرد کھڑے ہجوم سے باہر نکلتے دیکھا تو اُس سے رہا نہ گیا۔ اُس نے مجھے نہایت حقارت سے غلام کہہ کر پکارا۔ مجھے چاہیئے تھا کہ میں ہنس پڑتا لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ اُمیہ کو بھی چاہیئے تھا کہ وہ تلوار ہاتھ سے گرا دیتا مگر اپنے سابق غلام کے سامنے وہ بھی ایسا نہ کر سکا۔ پھر میں نے دیکھا کہ اُس کی تلوار مجھ پر وار کرنے کے لئے اُٹھی۔ اُس وقت میں نے دیکھا کہ اُس کی زرہ پیٹ پر سے کٹی ہوئی تھی۔ تقریباً ایک پور کے برابر چوڑی جگہ خالی تھی، میں نے اُسی جگہ وار کیا اور وہ اوندھے مُنہ گر گیا۔ میرے ساتھیوں نے اُسے سیدھا کیا، وہ مر چکا تھا۔ اُس وقت مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے کیا ہو گیا ہے۔

مجھ پر ایک عجیب اضطراب کی کیفیت طاری ہو گئی۔ غلاموں کے خمیر میں، اُن کی گھٹی میں یہ بات پڑی ہوتی ہے کہ اپنے آقا پر کبھی مدافعت میں بھی ہاتھ نہ اٹھانا۔ اس وقت میرا سابق آقا زمین پر پڑا تھا اور میری تلوار سے اُس کا خون ٹپک رہا تھا۔

اُس وقت سے آج تک میں نے کئی راتیں سوچتے سوچتے گزاری ہیں کہ بلال کیا تو نے اُس سے بدلہ لیا تھا جو اللہ کی طرف سے تجھ پر جائز نہیں تھا، کیا تو نے جان بوجھ کر اپنے رسولؐ کے صریح حکم کی خلاف ورزی کی کہ ہتھیار ڈالنے والوں پر ہاتھ نہیں اٹھانا، کیا تیرے پاس اُس کے قتل کا کوئی جواز تھا۔ کیا تجھے بدلہ لینے کی اجازت تھی، وہ اُس وقت جنگی قیدی تھا یا ہتھیاروں سے لیس ایک مخالف، اُس نے تجھ پر پہلے ہاتھ اٹھایا تھا یا تو نے حفظِ ماتقدم کے طور پر اُس پر پہلے وار کر دیا تھا، تو غصّے میں بہک جانے کا قصوروار تھا یا اُس کے غصّے کی وجہ سے

مدافعت پر مجبور ایک بے قصور، تیری تلوار نے اُس دن اُس کی زندگی کا فیصلہ کیا تھا یا تیرے اپنے مستقبل کا۔

اُمیہ کی لاش کے گرد کھڑے دوستوں نے مجھے مبارک باد دی لیکن وہ صحیح صورتِ حال کے شاہد نہیں تھے۔ موقعے کی صرف دو ہی شہادتیں تھیں۔ میں اور اُمیہ!

اُحُد

اُحد میں ہمیں معلوم ہوا کہ جنگ ایک ہنڈولا ہے جو کبھی اوپر لے جاتا ہے کبھی نیچے لے آتا ہے۔ جنگ میں یہ فیصلہ نہیں ہوتا کہ کون جیتا ہے، کون ہارا ہے بلکہ یہ کہ اُس سے پہلے کیا ہوا اور اُس کے بعد کیا ہوا۔

اُحد میں وہ جیت گئے، وہ کھڑے رہے اور ہم گھبرائے ہوئے، پریشان، خوف زدہ، اپنی جانیں بچانے کے لئے تتر بتر ہو گئے۔ وہ جیت گئے تھے لیکن اپنی فتح کی خوشی میں انہوں نے کیا کیا۔ اُحد کے پتھریلے خارزار میں اپنی فتح کا نعرہ لگانے کے بعد انہوں نے کیا کیا۔ اُنہوں نے اسی میدان میں اپنے لئے جہنم کی فصل بوئی۔ انہوں نے لاشوں کی بے حرمتی کی، اُن کو برہنہ کیا، اُن کے اعضاء کاٹے۔ اُن کے ناک کان کاٹ کر گلے کے ہار بنائے۔

لیکن ایسا کیوں کیا انہوں نے ؟ لاشوں کی بے حرمتی سے انہیں کیا حاصل ہوا؟ اُن کے اعضاء کاٹ کے انہوں نے کیا پایا؟ میں نے سُنا ہے ٹرائے میں ایک مرتبہ Achilles نے اپنے دشمن کی لاش کو گھوڑے کے ساتھ باندھ کر کھنچوایا تھا۔ ایسا کیوں

کرتے ہیں لوگ؟ میری عقل کام نہیں کرتی۔ شاید وہ سمجھتے ہوں کہ لاشوں کو مسخ کر کے وہ دوسروں کو عبرت سکھاتے ہیں۔ شاید انہیں خوف ہو، [redacted] خیال ہے کہ ہر جنگ کے بعد آخری فیصلہ جیتنے، ہارنے والے نہیں بلکہ مرنے والے کرتے ہیں۔ جنگ میں کسی کی ہار جیت نہیں ہوتی، صرف موت کی فتح ہوتی ہے اور آخری قہقہہ وہی لگاتی ہے۔

واقعہ یہ تھا کہ یہ ہمارا اور اللہ تعالیٰ کا معاملہ تھا۔ قرآن کی تیسری سورت آلِ عمران کی آیت ۱۶۶ میں صاف آیا ہے کہ اللہ نے ہمیں اُحد میں اس لئے شکست دلائی کہ وہ ہماری آزمائش چاہتا تھا:

اور جو مصیبت تم پر اُس روز پڑی
جب دونوں گروہ باہم مقابل ہوئے،
وہ اللہ کی مشیت سے ہوئی،
تا کہ اللہ مومنین کو جان لے۔

بدر کی فتح نے ہمیں ولولہ عطا کیا، اُحد کی شکست نے ہمیں سنجیدگی بخشی۔ ہم نے واقعی اپنی صفیں بہت جلد توڑ دی تھیں۔ حضورؐ ہمیں پکارتے رہے اور ہم سراسیمگی کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگتے رہے۔ ہمیں شاید یہ وہم تھا کہ پیغمبرؐ کی حکم عدولی کرنے پر بھی اللہ ہماری مدد کو آئے گا۔ ہمیں بچوں کی طرح ایک سخت سبق دیا گیا تھا اور ہم تھے بھی واقعی بچوں کی طرح۔ مگر اس سبق کی ہمیں بڑی قیمت چکانا پڑی۔

اُحد میں کائنات کا سب سے قیمتی خون بہا۔ شیرِ نیستاں حمزہؓ نے شہادت پائی۔ ہند کے پاس ایک حبشی غلام تھا، میری طرح حبشہ کا رہنے والا۔ اُس کا نام وحشی تھا۔ وہ نیزہ پھینکنے میں کمال رکھتا تھا۔ ہند کو حمزہؓ سے خاص بغض تھا کیونکہ وہ اس بدر کے جرار سے اپنے باپ، چچا اور بھائی کی موت کا بدلہ لینا چاہتی تھی جو بدر میں اُن کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ہند نے وحشی کو لالچ دیا کہ اگر وہ حمزہؓ کو قتل کر دے تو وہ اسے آزاد کر دے گی۔ اِس کے علاوہ اُسے

چاندی میں تول دے گی اور اُس کے قد کے برابر اُسے ریشم کے تھانوں کا ڈھیر بھی دے گی۔

اُحد کے میدان میں وحشی کا صرف ایک ہدف تھا۔ حمزہؓ۔ اُسے کسی اور سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ جنگ ہو رہی تھی۔ دونوں طرف سے لوگ ایک دوسرے پر ہلّے بول رہے تھے۔ تلواریں، نیزے، بھالے، تیر انسانوں کے جسموں میں پیوست ہو رہے تھے۔ انسان کٹ کٹ کر گر رہے تھے، میدانِ کارزار خون سے سُرخ ہوتا جا رہا تھا۔ گھوڑوں کا شور الگ تھا۔ ہر سمت سے زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگ خس و خاشاک کی طرح گھوڑوں کے سُموں تلے روندے جا رہے تھے۔ چاروں طرف لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ جوش میں بھرے ہوئے فریقین نعرے بلند کر رہے تھے مگر اس سارے ہنگامے میں، سارے ہجوم میں وحشی تنہا تھا۔ سب سے الگ اپنے شکار کے تعاقب میں۔ آپس میں گتھم گتھا سپاہیوں کے بیچ سے راستہ بناتا، ہتھیاروں کی ضرب سے بچتا بچاتا، برق رفتار گھوڑوں کی زد سے ہٹتا بچتا، زخمیوں میں، لاشوں میں رینگتا، گھسٹتا، اپنا نیزہ سنبھالتا آخر کار وہ وہاں پہنچ گیا جہاں چند قدم کے فاصلے پر حمزہؓ دشمنوں سے برسرِ پیکار تھے اور اِن کے مدِّمقابل اُس شیرِ میدان کے سامنے اپنا سارا کس بل بُھولے ہوئے تھے۔ وحشی، زخمیوں اور لاشوں کے درمیان لیٹا رہا، آنکھیں کھولے، نیزہ ہاتھ میں سنبھالے۔ بالکل ساکت! اتنے میں اُس نے دیکھا کہ حمزہؓ اُس کے نیزے کی زد میں ہیں اور اُس کے وجود سے بے خبر اپنے مخالفین پر وار پہ وار کئے جا رہے ہیں۔ وحشی لاشوں میں سے جست لگا کر اُٹھا اور اپنا نیزہ حمزہؓ کی ناف میں پیوست کر دیا بس ایک ہی وار۔ یہی ایک وار وحشی کی جنگِ اُحد تھی۔ اس کے بعد وہ میدان سے باہر چلا گیا۔ کچھ دنوں مکے میں رہا۔ پھر طائف چلا گیا اور غزوۂ تبوک کے بعد مدینے آکر اسلام قبول کیا۔

مجھے وحشی پر ترس آتا ہے۔ غلام کے لئے آزادی کی رشوت سے انکار بہت مشکل ہے لیکن اس نے وہ ریشم کا لباس کبھی نہیں پہنا اور ہند کی چاندی خرچ کرنے کی بھی اُسے کبھی توفیق نہیں ہوئی۔ اُس نے صرف آزادی حاصل کی اور صحرا میں نکل گیا مگر اس آزادی میں

بھی وہ غلام ہی رہا، اپنی حرکت پر شرمسار، اپنے ضمیر کی ملامت کا شکار، اپنے وجود، حتیٰ کہ اپنے نام تک سے بے زار!

ایک مدت بعد جب وہ مسلمان ہو گیا تو حضورؐ نے اسے اپنے سامنے آنے سے منع فرمادیا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شاید اُسے دیکھ کر آپ کو حمزہؓ کی شہادت یاد آجاتی ہے، جن سے انہیں بے حد پیار تھا مگر ایک دفعہ سرورِ عالمؐ نے خود وضاحت فرمائی کہ میرے لئے سارے مسلمان برابر ہیں، وحشی سمیت، میں نے اس لئے اُسے سامنے آنے سے منع کیا ہے کہ وہ خود میرے سامنے شرمندہ شرمندہ سا رہتا ہے اور اپنے دل پر بوجھ محسوس کرتا ہے۔

اُحد کے دن ہند کا خوب صورت چہرہ بھی خون آلود ہوا۔ اُس نے حمزہؓ کا پیٹ چاک کر کے اُن کا کلیجہ نکال کر چبایا تھا۔

اُحد کے دن رحمتِ عالمؐ خود بھی شہادت کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ایک نوکیلا پتھر، کہیں سے آکر انہیں اتنی زور سے لگا کہ وہ زخمی ہو کر گر پڑے۔ انہیں گرتا دیکھ کر ابن قمیئہ، جو مکے کا سب سے بڑا تیغ زن تھا، گھوڑا دوڑاتا اُن کے پاس جا پہنچا۔ آپ ابھی سنبھل بھی نہیں پائے تھے۔ اس سے بہتر موقع اور کون سا ہو سکتا تھا۔ وہ بھی ابن قمیئہ، جیسے شمشیر زن کے لئے جو پہلے ہی کئی مسلمانوں کو تہِ تیغ کر چکا تھا۔ اُس نے بھرپور وار کیا لیکن طلحہؓ، جو حضورؐ کے ساتھ کھڑے تھے، برق کی سی سُرعت سے بڑھ کر تلوار کی زد میں آگئے۔ اُن کے ایک ہاتھ کی ساری انگلیاں کٹ گئیں اور ابن قمیئہ کی تلوار جو سیدھی نبی اکرمؐ کے خود پر آ رہی تھی، بہک گئی اور اُس کا زور بھی کم ہو گیا۔ اس کے باوجود، وار اتنی طاقت سے کیا گیا تھا کہ تلوار اُن کی کنپٹی کے پاس خود کے کنارے پر لگی اور مِغفَر کی دو کڑیاں ٹوٹ کر نبی کریمؐ کے گال میں دھنس گئیں۔ خود سے تلوار اُچٹ کر حضورؐ کے شانے پر لگی جس پر دوہری زِرہ تھی۔ سر اور شانے پر کوئی کاری زخم تو نہیں آیا لیکن کنپٹی کے پاس ضرب پڑنے سے اُن کو چکر آگیا اور وہ گر پڑے۔ اُن کے گرتے ہی ابن قمیئہ، جسے اپنی تلوار کی کاٹ پر پورا بھروسہ تھا، اپنی طرف سے اپنا کام

ختم کر کے واپس جانے کے لئے مڑا۔ میں نے بھی بڑھ کر اُس پر پوری طاقت سے ضرب لگائی مگر اُس کے دفعتاً مڑ جانے سے میری تلوار شاید اُس کے پاؤں پر لگی اور وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا اور باآوازِ بلند حضورؐ کے قتل کا اعلان کرتا ہوا اپنی صفوں میں چلا گیا۔ اس کا یہ منحوس اعلان محاذ کے دونوں طرف کئی لوگوں نے سُنا۔ اُس کے جاتے ہی چند اور مشرکین نے پیغمبرِ خداؐ کو نرغے میں لینے کی کوشش کی لیکن اُس وقت بارہ جاں نثاروں نے، جن میں میں بھی شامل تھا، حضورؐ کے گرد گھیرا ڈال لیا اور اُن کی ڈھال بن گئے۔ سب کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں جیسے خارپشت کے کانٹے باہر کو نکلے ہوتے ہیں۔ خاندانِ مخزوم کے شماسؓ نے جو حضورؐ کے بالکل سامنے تھے، اُن کی مدافعت میں اتنے زخم کھائے کہ آپ نے انہیں 'زندہ ڈھال' کے نقب سے نوازا۔ بالآخر اسی مدافعت میں انہوں نے شہادت پائی۔

شامِ اُحد

قریش اپنی جنگ ختم کر کے فارغ ہو گئے، مسلمانوں نے اُحد کی گھاٹی پر چڑھ کر اپنے لئے محفوظ مقام منتخب کر لئے۔ حضورؐ بھی زخمی حالت میں اُحد ہی کی ایک بلندی پر تشریف فرما تھے۔ نیچے میدان میں نیم مردہ زخمیوں کے کراہنے کی آوازوں کے علاوہ کوئی آواز نہیں تھی۔ ابو سفیان کو ابن قمیۂ کے اعلان کے باوجود حضورؐ کی ہلاکت کا یقین نہیں تھا۔ شام ذرا اور گہری ہوئی تو ہم نے ایک گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنی۔ تاریکی کا ابھی تک پورا غلبہ نہیں ہوا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ابو سفیان اپنے کمیتی رنگ کے گھوڑے پر سوار اُحد کے دامن تک آیا اور بلند آواز سے پوچھنے لگا :

"کیا آپ لوگوں میں محمد موجود ہیں ؟"

حضورؐ نے جواب دینے سے منع فرما دیا۔ کوئی جواب نہ پا کر ابو سفیان نے پھر پوچھا :

"کیا ابو قحافہ کا بیٹا موجود ہے ؟"

اس پر بھی کوئی جواب نہ ملا تو اُس نے عمر بن خطابؓ کا پوچھا۔ پھر بھی کوئی جواب نہ آیا تو ابو سفیان خود ہی زور زور سے واہی تباہی بکنے لگا:

"سب کے سب قتل ہو چکے ہیں۔ کوئی زندہ ہوتا تو جواب دیتا"۔

"اُعلُ ہُبُلُ اُعلُ ہُبُلُ"

یہ سن کر عمرؓ سے نہ رہا گیا۔ اُنھوں نے کہا:

"اے اللہ کے دشمن تو جھوٹ کہتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے ہم سب کو تیرے قتل کے لئے زندہ، سلامت رکھا ہے"۔

اس کے جواب میں ابو سفیان نے اپنی فتح پر پھر ہُبل کی سربلندی کا نعرہ لگایا:

"اُعلُ ہُبُلُ اُعلُ ہُبُلُ"

رسول اللہؐ نے فرمایا اس کو جواب دو کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے بلند ہے، سب سے بڑا ہے۔ یہ سن کر ابو سفیان نے کہا ہمارے پاس عزیٰ ہے۔ نبی پاکؐ نے فرمایا جواب دو کہ اللّٰہُ مَولٰینا ولا مَولاَ لَکم۔

یہ سن کر ابو سفیان نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور رخصت ہوتے ہوتے کہہ گیا کہ آئندہ سال بدر کے مقام پر ملاقات ہوگی۔ رہی سہی کسر وہاں نکل جائے گی۔ حضورؐ نے اس کا چیلنج قبول فرمایا اور مجھے کہا اعلان کر دو کہ اے دشمنِ خدا ہم انشاء اللہ بدر کے میدان میں تمہارا انتظار کریں گے۔ دُور سے ابو سفیان کی آواز پھر سنائی دی۔

"اُعلُ ہُبُلُ اُعلُ ہُبُلُ"

یہ آواز دور ہوتی ہوتی غائب ہو گئی تو ہم لوگ ایک ایک دو دو کر کے اُحد سے نیچے اُترے۔ حضورؐ بھی اپنے زخموں کے باوجود، نیچے میدان میں تشریف لے آئے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک شمع تھی وہ ایک ایک شہید کے پاس جاتے اور دُعا فرماتے۔ اُحد کے میدان میں اور

بھی کئی شمعیں جل رہی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے ہوئے لوگ شہداء کے لئے دُعائیں کر رہے تھے۔ ایک جگہ اوس کے کچھ لوگ تھے جو اپنے شہداء کی تلاش میں تھے کہ ایک زخمی کو دیکھ کر اُن کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی یہ تھے اُصیرم بن ثابتؓ تھے جنہیں ابھی ایک دن پہلے اُنھوں نے کفر کا طعنہ دیا تھا اور اُنھوں نے آگے سے ٹکا سا جواب دیا تھا کہ اگر مجھے اسلام کے بارے میں یقین ہوتا کہ یہ سچا دین ہے تو میں اسلام لانے میں ایک لمحہ تاخیر نہ کرتا۔ اس وقت وہ مسلمان شہداء کی لاشوں کے درمیان شدید زخمی حالت میں آخری سانسوں پر تھے۔ کسی نے پوچھا آپ یہاں کیسے، کسی دوست کی خاطر یا اسلام کی خاطر۔ جواب ملا:

"اسلام کی خاطر۔ آج صبح میرے دل میں اسلام کی روشنی اس طرح جاگی کہ میں اسلام میں داخل ہو گیا اور تلوار اُٹھا کر اللہ کے نبی کے جیش میں شامل ہونے کے لئے یہاں آ گیا۔ یہاں جنگ میں شریک ہوا۔ دشمنوں پر بڑھ چڑھ کر وار کرتا رہا کہ ایک کاری وار کی زد میں آکر یہاں گر پڑا"۔

اس کے علاوہ وہ اور کچھ نہ کہہ سکے اور کہنے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔ اللہ کی شان کہ ایسا شخص، شاید پہلا شخص جنت کا حقدار ہوا جس نے زندگی میں ایک نماز بھی نہیں ادا کی۔

حیرتوں پر حیرت کا دن تھا اُحد کا یہ میدان کارزار۔ ابھی ایک حیرت ختم نہیں ہوئی تھی کہ مقتولین میں کسی نے ایک ایسے شخص کو پہچانا جسے ہم ایک عظیم یہودی عالم کی حیثیت سے جانتے تھے۔ چہرہ زخموں سے اتنا بگڑ گیا تھا کہ ٹھیک سے شناخت نہیں ہو رہی تھی۔ لوگوں نے غور سے دیکھا تو تصدیق ہو گئی کہ یہ واقعی یہودیوں کے فاضل اور مقتدر ربی مخیریق کی لاش تھی جن کا تعلق بو ثعلبہ سے تھا۔ بعد میں عقدہ کھلا کہ آج علی الصبح انہوں نے

اپنے چند صیہونی پیروکاروں کو بلا کر کہا کہ ہمیں محمد کے ساتھ کئے ہوئے اپنے میثاق کا پاس کرنا چاہئے اور اُن کے دوش بدوش لڑنا چاہئے۔ اُن کے یہودی پیروکاروں نے یوم سبت کا بہانہ تراشا کہ آج تو ہفتے کا دن ہے اُن کے لئے جنگ میں شرکت ممکن نہیں۔ مُخیریق برابر زور دیتے رہے۔ یوم سبت کے سلسلے میں اُنھیں اپنے ساتھیوں کی بہت سی سابقہ کوتاہیوں سے آگاہی تھی۔ مگر اُن کے بار بار کہنے پر بھی کسی نے اُن کی بات نہ سنی۔ آخر وہ تن تنہا جنگ میں شامل ہونے کے لئے نکل آئے اور مدینے سے رخصت ہوتے ہوئے بآواز بلند اعلان کر دیا۔

"سب لوگ آگاہ رہیں کہ اگر اس پاسِ عہد میں میری جان چلی گئی تو میری تمام جائیداد اور ملکیت کے وارث محمد ہوں گے۔ وہ جس طرح چاہیں، خدا کے بتائے ہوئے کاموں پر صرف کریں"۔

اس نیت اور ارادے سے وہ اُحد کے میدان میں اُترے اور لڑتے لڑتے راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔ مجھے خادم رسولؐ کی حیثیت سے علم ہے کہ حضورؐ کے یہاں سے غرباء و مساکین میں جو کھجوریں خیرات کی جاتی تھیں، اُن کا بیشتر حصہ اُن سات باغوں سے آتا تھا جو مُخیریق نے آنحضرتؐ کے لئے چھوڑے تھے۔ یہ اسلام میں سب سے پہلا وقف تھا۔ اللہ کے نبی مُخیریق کو بہترین یہود، کہا کرتے تھے۔

کیسے کیسے چاند سورج دفن ہوئے اُس دن اُحد کی وادی میں۔ حمزہؓ، مصعب بن عُمیرؓ عبداللہ بن جحشؓ، مالک بن سنانؓ، شماس بن عثمانؓ اور کتنے ہی اور جانباز، کل ستر مسلمان۔ مگر میں بلال، جو اِن سب شہیدوں کی تجہیز و تکفین میں شامل تھا، آج یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ قریش کو اس کامیابی پر خوش نہیں ہونا چاہئے تھا کیونکہ اُحد کے نگین نور کے وہ مینار بن کر ابھرے جن سے جادۂ حق آج بھی منوّر ہے۔

جنگ تو ہوتی ہی سانحہ ہے لیکن کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جو سانحہ جنگ کے اندر اپنی نوعیّت کا ایک نیا سانحہ بن جاتے ہیں۔ غزوۂ اُحد میں جب گھمسان کا رن پڑا تو

مسلمانوں نے غلطی سے کافروں کے لشکر کا فرد سمجھ کر حُذیفہؓ کے والد یمانؓ پر حملہ کر دیا۔

حذیفہؓ چیختے ہوئے اُن کو بچانے کے لئے اُن کی سمت دوڑے کہ میرے والد ہیں، میرے والد ہیں مگر اتنے میں وہ شہادت پا چکے تھے۔ اس نادانستہ قتل پر حذیفہؓ کے منہ سے صرف یہ نکلا۔

يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرّٰحِمِينَ

(اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے)

اُحد ہی میں ایک اور انوکھا واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص رسول اللہ کے اپنے ہاتھ سے مقتول و مخذول ہوا۔ یہ بدبخت اُبی بن خلف تھا، میرے سابق آقا کا بھائی اور وہ ناہنجار جس نے مکے میں ایک بوسیدہ ہڈی کا چورا بنا کر حضورؐ کے روئے مبارک پر پھینکا تھا۔ اُبی بن خلف نے رسول پاکؐ پر تلوار اُٹھائی تھی۔ جب وہ قریب آیا تو آنحضرت نے ایک چھوٹے نیزے سے جو اُن کے ہاتھ میں تھا، اُس کو مارا۔ زخم کوئی ایسا کاری نہیں تھا۔ ذرا سی نوک چُبھی تھی مگر تکلیف کی جس شدت کا اظہار اُس کی چیخ پکار سے ہو رہا تھا، وہ اُس کے حلیفوں کی سمجھ سے باہر تھا۔ بعض نے تو اس کا باقاعدہ مذاق بھی اُڑایا کہ کیا اتنے چھوٹے سے زخم پر دُہائی مچائی ہوئی ہے۔ لیکن جب اُس کی حالت بہت غیر ہو گئی تو مشرکین نے اُسے اونٹ پر لاد کر مکے روانہ کر دیا۔ مگر سُنا ہے کہ وہ مکے سے ایک منزل پہلے ہی مرّالظہران میں جہنّم واصل ہو گیا۔

احد وہ واحد میدانِ جنگ ہے جہاں ایک ایک قبر میں قلتِ وسائل کے سبب دو دو تین تین شہداء کو دفن کیا گیا۔

غزوۂ احد کے شہداء کے بارے میں قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی۔

مومنین میں سے سے کچھ لوگ
ایسے بھی ہیں جنھوں نے

جس بات کا اللہ سے وعدہ کیا تھا
اس پر پورے اُترے۔
بعض تو اِن میں وہ ہیں
جو اپنی نذر پوری کر چکے
اور بعض ان میں مشتاق ہیں۔

(۳۳_۲۳)

سورۂ آلِ عمران کہ یہ مشہور آیت بھی جنگ اُحد کے موقع پر نازل ہوئی تھی اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے۔

اُن کو مردہ مت خیال کرو
بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں ،
اپنے پروردگار کے مقرب ہیں
اُن کو رزق بھی ملتا ہے۔
وہ خوش ہیں اُس چیز سے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اُنھیں عطا فرمائی۔

اب یا کبھی نہیں

یہودی ایک خدا کو ماننے والے تھے، انہیں اپنی کتابوں کے ذریعے ایک پیغمبر کے آنے کا انتظار بھی تھا۔ قرائن سے اُن پر یہ واضح بھی ہو چکا تھا کہ وہ آنے والے پیغمبر محمدؐ ہی ہیں۔ پھر نبیِ کریمؐ کی مدینہ تشریف آوری کے بعد وہ اُن کے ساتھ چند اہم معاہدوں میں بھی منسلک ہو چکے تھے مگر ہم لوگ اُن کی طرف سے کبھی پوری طرح مطمئن نہیں ہوئے۔ وہ جب بھی، جہاں بھی ملتے ان سے غیریت ہی نہیں معاندت کی بُو آتی۔ اُن کے تیور ہمیشہ بگڑے بگڑے نظر آتے۔ آئے دن چھوٹے بڑے واقعے بھی ہوتے رہتے جن سے اُن کے دلوں کا بغض ظاہر ہوتا رہتا۔ کبھی کبھی تو وہ صریحاً بدتمیزی پر اُتر آتے۔ ہمارے ساتھ ان کے معاہدے تھے۔ غزوۂ بدر میں اُنھیں ہماری کامیابی پر خوش ہونا چاہئے تھا مگر نہیں۔ رسولِ اکرمؐ اُن کے پاس خوشخبری لے کر گئے تو اُدھر سے یہ جواب ملا کہ قریش ناتجربہ کار تھے اُن سے جیت جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ ہم جیسے جنگ آزمودہ بہادروں

سے پالا پڑتا تو پتہ چلتا کہ جنگ کسے کہتے ہیں۔ اُحد میں ہماری ہزیمت پر وہ دل ہی دل میں خوش تھے اور اُن کے طنزیہ چبھتے ہوئے جملے گلیوں، بازاروں میں ہمارے کانوں میں پڑتے رہتے تھے وہ ہم سے معاہدہ تو کر بیٹھے تھے مگر لگتا تھا کہ مسلمانوں سے پنجہ آزمائی پر تلے بیٹھے ہیں۔ اور مسلمانوں پر ایک فیصلہ کن وار کا ارادہ رکھتے ہیں۔

رسولِ کریمؐ اُن کے رویّے سے پریشان پریشان رہنے لگے تھے۔ دُنیا کو عدل و انصاف کی تربیت دینے والے کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ جب تک یہود کی طرف سے کوئی پہل نہ ہو، جب تک وہ واقعی کوئی قابلِ گرفت جرم نہ کر بیٹھیں، ان کے خلاف کسی انجانے وسوسے کی بنیاد پر کوئی تادیبی کارروائی کی جائے۔ لیکن فراست کا تقاضا تھا کہ قرائن سے بھی نتیجے اخذ کئے جائیں اور بہر صورت اُن کے متوقّع شر سے ممکنہ حد تک محتاط رہا جائے۔ اسی عرصے میں چند آیتیں بھی نازل ہوئیں جن سے دلوں کے راز جاننے والے نے ذہنوں سے ایسے پردے اُٹھادئے کہ سب شبہات یقین میں بدل گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آلِ عمران کی ایک سو اٹھارہویں آیت میں واشگاف الفاظ میں اعلان فرمایا:

"وہ تمھیں برباد کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔
وہ تمھیں تکلیف پہنچا کر خوش ہوتے ہیں۔
اُن کی نفرت اُن کے مُنہ سے نکلتے ہوئے الفاظ سے عیاں ہے
لیکن جو بغض وہ اپنے دلوں میں رکھتے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہے"۔

پھر ایک اور آیت نازل ہوئی آلِ عمران کی ایک سو بیسویں:

"تم کو اچھی حالت میں دیکھ کر اُنھیں افسوس ہوتا ہے
اور تم پر کوئی بُری حالت آپڑتی ہے تو وہ اس سے خوش ہوتے ہیں"۔

اب ہر ایک کو یقین تھا کہ کسی وقت بھی کوئی واقعہ رونما ہو سکتا ہے۔ رسولِ کریمؐ نے مکمل حفاظتی تدابیر اختیار کرلیں۔ چاروں طرف اپنے جاسوس پھیلا دیے کہ اہلِ یہود کی

حرکات و سکنات پر نظر رکھیں اور ان کی ہر چال سے باخبر رہیں تاکہ مسلمان اچانک کسی سازش کا شکار نہ ہو جائیں۔ تقریباً دو سال ہو گئے تھے ہمیں مکّے سے آئے ہوئے۔ ان برسوں میں اُنھوں نے ہمیں ہر رنگ میں دیکھ لیا تھا اور ان میں سے کوئی بھی رنگ اُنھیں پسند نہیں تھا۔ وہ حسد کی آگ میں جلے جارہے تھے۔ ہمارے دین کی روز افزوں مقبولیت، ہمارے پیغمبرؐ کی ہر لحظہ بڑھتی ہوئی توقیر اُن کے دلوں کا ناسور بن گئی تھی۔ قریشِ مکّہ سے اُن کے سازباز کی اطلاعات بھی ملتی رہتی تھیں۔ خاص طور پر اُن کے قبیلے بنو قینقاع کی ریشہ دوانیاں زوروں پر تھیں۔ عبداللہ ابنِ سلاّم جو اسی قبیلے کے فرد تھے اُن کی رگ رگ سے واقف تھے۔

پھر ایک واقعہ ایسا ہوا جس سے یہودیوں کا سارا عناد کھل کر سامنے آگیا۔ مدینے کے جنوب میں جہاں قینقاع آباد تھے، ایک مسلمان عورت کسی خرید و فروخت کے سلسلے میں جارہی تھی کہ ایک یہودی صراف نے اُس سے چھیڑ خانی کی۔ ایک مسلمان راہرو نے یہ صورت دیکھی تو اُس نے صراف سے باز پرس کی، جھگڑا بڑھ گیا۔ تلواریں بے نیام ہو گئیں اور یہودی صراف قتل ہو گیا۔ اسی اثناء میں اور یہودی بھی اکٹھے ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے مسلمان کو قابو کر کے شہید کر دیا۔ دونوں طرف سے ایک ایک فرد جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، اسی پر بات ختم ہو سکتی تھی۔ مگر بنو قینقاع تو جیسے اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے باقاعدہ جنگ کی ٹھان لی اور سات سو مسلح افراد کا لشکر تیار کر لائے۔ کم و بیش اتنی ہی نفری کی توقع اُنھیں عبداللہ ابن ابی اور عبادہ بن الصّامتؓ سے تھی۔ مگر ان دونوں نے ساتھ نہ دیا۔ نبیِ کریمؐ کے حکم پر مسلمانوں نے بنو قینقاع کے لشکر کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا اور اُنھیں ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا۔ دو ہفتے تک محاصرے میں رہنے کے بعد اُنھیں غیر مشروط طور پر خود کو مسلمانوں کے حوالے کرنا پڑا۔ اب اُن کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے کا وقت تھا۔ رسول اللہؐ اپنے خیمے میں تھے کہ ابن ابی آپہنچا اور اپنے حلیفوں کی امان مانگنے لگا۔ حضورؐ نے غصّے سے مُنہ پھیر لیا مگر ابنِ ابی نے ان کا دامن پکڑ لیا۔ رسول اللہؐ نے سختی سے

اُسے دامن چھوڑنے کو کہا مگر اس نے کہا واللہ میں آپ کا دامن نہیں چھوڑوں گا جب تک آپ بنو قینقاع سے اچھے سلوک کا وعدہ نہیں فرمائیں گے۔ اُن کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ پیغمبرِ رحمتؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں تیری خاطر اُن کی جاں بخشی کرتا ہوں۔ مگر اُنھیں مدینہ چھوڑنا پڑے گا۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے عبادہ ابنِ الصّامتؓ کو حکم دیا کہ اُنھیں مدینے کی حدود سے باہر چھوڑ آئیں۔ مدینے سے نکالے جانے کے بعد اُنھوں نے وادی القراء میں ایک یہودی قبیلے کے یہاں پناہ لی اور کچھ دن وہاں رہ کر شام کی سرحدوں پر جا آباد ہوئے۔

اس کے بعد یہودی قبیلہ بنو نُضیر بھی اُنھیں کے نقشِ قدم پر چلا اور مدینے سے خارج کر دیا گیا۔ یہ اللہ کے اُس حکم کی تعمیل تھی جس میں کہا گیا تھا کہ جب تم جنگ میں فتح حاصل کر لو تو اپنے دشمنوں کو ایسی مثال بنا دو کہ اُن کے پشت پناہوں کے دلوں میں تمھاری دہشت بیٹھ جائے اور وہ آئندہ کے لئے محتاط ہو جائیں۔ دہشت پھیلی اور ایسی پھیلی کہ مدینے میں جس جس کے دل میں چور تھا اپنی عافیت کی راہیں تلاش کرتا نظر آتا تھا۔ مسلمانوں سے اتنا سلوک برتا تھا، اُن کے ہر کام میں اس طرح پیش پیش رہتا تھا کہ جیسے کبھی کوئی خلش تھی ہی نہیں۔ لیکن یہ سب محض ایک ظاہری صورت تھی۔ اندر دلوں میں ابال اُٹھ رہے تھے۔ بظاہر تو کوئی بات نہیں تھی جس پر گرفت ہو سکتی۔ مگر فراستِ مومن بیدار تھی۔ ساری صورتِ حال آئینے کی طرح نظروں کے سامنے تھی۔ بنو قینقاع اور بنو نُضیر کے شہر بدر ہونے کے بعد بنو غطفان، بنو ہذیل اور بنو قریظہ اندر ہی اندر مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ مدینے سے باہر پورے عربستان کی صورتِ حال بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔ قریشِ مکہّ بدر کے مقتولوں کے زخم چاٹ رہے تھے۔ اندھی تقلید میں گھرے ہوئے عرب قبائل، قریشِ مکہّ کے ہمنوا تھے۔ صحرائے عرب کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے یہ قبیلے جہاں جہاں آباد تھے قریشِ مکہّ کی حمایت کا دم بھرتے تھے۔ اللہ کے نبیؐ کی کامیابیاں اور اُن کے لئے مسلمانوں کے جذبۂ ایثار اور جانفروشی کی خبریں اُنھیں بے حال کئے دیتی تھیں۔ مسلمانوں کی جاں نثاری کا یہ عالم تھا کہ

شاید چشمِ فلک نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ سرورِ کائناتؐ نے ایک عید کے خطبے میں صدقے کی برکات کا ذکر فرمایا۔ تو عورتوں کے مجمع سے ہر ایک نے اپنے زیور اُتار اُتار کر پھینکنے شروع کر دئے۔ میں دامن پھیلائے بیٹھا تھا اور عورتیں اپنی انگوٹھیاں، کان کی بالیاں، گلے کے ہار میرے دامن میں پھینکتی جاتی تھیں۔ ایسی خبریں سن سن کر دشمنوں کے سینے پر سانپ لوٹتے تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ ایک بے سہارا، بے آسرا یتیم جو مکےّ سے نہایت کس مپرسی کے عالم میں نکلا تھا کیسے اتنا اہم ہو گیا کہ تمام صحرائے عرب اُس کی عظمت سے لرزاں ہے۔ ہر عرب قبیلے میں اُس کی طرف سے ایک انجانا خوف سماتا جا رہا ہے۔ اُن کے آباواجداد کی تہذیب اور تمدن کا ایک مکمل دور تھا جو داؤں پر لگا ہوا تھا۔ اس بغض و عناد میں اُنھیں یہودیوں کی بھی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ عرب قبائل کا جوش و جذبہ اور یہودیوں کی علمی بصیرت اور دُور اندیشی مل کر ایک ایسا مدِمقابل بن گئے تھے کہ جس سے اب چشم پوشی ممکن نہ تھی۔ یہود کو یہ بھی غم کھائے جا رہا تھا کہ وہ ابھی تک نصاریٰ پر سبقت لے جانے اور اُن کے دین کو زیر کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہوئے تھے کہ توحید کا وہ خورشید طلوع ہو گیا جس کی کرنیں ہر کہ و مہ کو خیرہ کئے دے رہی تھیں۔ اُنھوں نے فیصلہ کر لیا کہ عمل کا وقت یہی ہے۔ اگر اب نہیں تو کبھی نہیں۔ اس سے پہلے کہ یہ سیلاب ان کی زندگی کی ساری قدریں بہالے جائے اسے روک دیا جائے۔ چنانچہ بنو نُضیر کے حیؔ ابن اخطب اور دو بھائی سلام اور کنانہ اور بنو وائل کی دو سربرآوردہ شخصیتیں ہوذہ بن قیس اور ابو عمارہ وفد کی صورت میں خیبر سے نکلے اور قریشِ مکہّ کے پاس جا پہنچے۔ قریشِ مکہّ نے اُن سے اپنی تسلی کے لئے بہت سے سوال کئے۔ وہ داعیٔ اسلامؐ کے دشمن بھی تھے مگر اُن سے خاصی حد تک خائف بھی۔ قریش کے چند لوگ تو دعوتِ اسلام کی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی پذیرائی کو دیکھ کر یہ بھی سوچنے لگے تھے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ محمدؐ واقعی حق پر ہوں۔ اسی تذبذب کے پیشِ نظر اُنھوں نے اس پنج رکنی وفد سے کہا کہ آپ سب سے پہلے اہلِ کتاب ہیں۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارا اور محمدؐ کا اختلاف کیا ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ

آپ کے خیال میں ہمارا دین بہتر ہے یا اسلام۔ اس پر یہودی وفد نے اپنی تمام دینی تعلیم اور عقائد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے یہ جواب دیا کہ قریش کا دین اسلام کے مقابلے میں حق سے قریب تر ہے۔ موحد یہودیوں نے توحیدِ اسلامی پر قریش کی بت پرستی کو حق بجانب کہہ کر جو ستم ڈھایا اُس پر سورۂ النساء کی دو آیتیں نازل ہوئیں جن میں اُن پر لعنت بھیجی گئی اور ان کو نارِ جہنم کی وعید سنائی گئی۔

یہودیوں سے اصولی اتفاق کے بعد ابو سفیان، صفوان اور دیگر اہلِ قریش یہودی وفد کو خانہ کعبہ کے اندر لے گئے جہاں اُنھوں نے ایک دوسرے کا آخری وقت تک ساتھ دینے کی قسمیں کھائیں۔ قریش سے خاطر خواہ ملاقات کے بعد حیؔ بن اخطب کے وفد کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ اس وفد کے اراکین نے فیصلہ کیا کہ اب جب کہ اُنھیں قریش کی حمایت حاصل ہو چکی ہے باقی قبائل کی طرف بھی رجوع کیا جائے۔ اُن کی عرب عصبیت اُبھاری جائے۔ جس جس قبیلے کو داعیانِ اسلام سے کوئی صدمہ پہنچا ہے اُن کے زخم ہرے کیے جائیں۔ اُن پر نمک پاشی کر کے اپنے مذموم مقاصد حاصل کیے جائیں۔ چنانچہ یہ وفد فرداً فرداً ہر اُس قبیلے کے پاس پہنچا جن کا کوئی فرد مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا یا جسے مسلمانوں سے کسی قسم کی رنجش تھی۔ اُنھیں شہ دی، اپنی بھرپور حمایت کا یقین دلایا۔ اُنھیں بتایا کہ قریشِ مکہ بھی ان کی معاونت کریں گے۔ اُن کے سامنے اُن کی بت پرستی کی توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے بھی ملائے۔ نبی اسد فوراً رضامند ہو گئے۔ بنو غطفان سے یہ وعدہ کیا گیا کہ اگر وہ مشترکہ جنگ میں قریش کا ساتھ دیں تو اُنھیں خیبر کی کھجوروں کی فصل کا نصف حصہ دیا جائے گا۔ اس طرح بنو غطفان کے ذیلی قبیلوں یعنی فزارہ، مُرّہ اور اشجع سے دو ہزار کی نفری ہمارے دشمنوں کے ساتھ شامل ہو گئی۔ بنو سُلیم سے یہودی سات سو افراد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بنو سُلیم کی بستیوں سے جنوب میں بسنے والے قبائل میں بنو عامر رسول اللہؐ سے اپنے معاہدے پر قائم رہے اور یہودی وفد کی کسی چال میں نہیں آئے۔ قریش

کے اپنے جنگجو چار ہزار تھے۔ یہ طے پایا کہ قریش اور ان کے جنوب میں بسنے والے حلیف مکے سے سمندر کے کنارے کنارے چل کر مدینہ پہنچیں گے۔ یہ وہی راستہ تھا جس پر چل کر وہ جنگِ اُحد کے لئے آئے تھے۔ دشمنوں کی فوج کے دوسرے حصے کو نجد کے میدانی علاقے کی طرف سے چل کر مدینے کی مشرقی سمت سے حملہ آور ہونا تھا۔ ہمارے دشمنوں کو یقین تھا کہ جب اُحد میں مسلمان تین ہزار سپاہیوں کے سامنے نہ ٹھہر سکے تو اب تو اُن کی تعداد اُس سے تین گنا زیادہ تقریباً دس ہزار ہو گی۔ اب مسلمانوں کے بچ نکلنے کا کیا امکان ہے۔

غرض یہ کہ یہود و قریش کی باہمی سازش نے ہمارے عربستان میں مسلمانوں کے خلاف ایک ایسا طوفان بھڑکا دیا تھا جو اسلام کے خلاف ایک برقِ بلا بن کر ٹوٹ پڑنے کے لئے بے قرار تھا۔ جس سے ہم پوری طرح باخبر تھے۔ آئے دن صحرا سے آنے والے طرح طرح کی خبریں سُناتے تھے۔ مگر ہمارے ہادیؐ مطمئن نظر آتے تھے تو ہم میں سے کوئی بھی ہراساں نہ تھا۔

بدرِ صغریٰ

"اے دشمن خدا ہم انشاء اللہ ضرور آئندہ سال بدر کے میدان میں تیرا انتظار کریں گے"۔

پیغمبرِ اسلامؐ کا یہ اعلان جو اُنھوں نے اُحد میں ابوسفیان کا چیلنج قبول کرتے ہوئے میری زبانی ابوسفیان کو سُنایا تھا ہمیں بھی یاد تھا، ابوسفیان کو بھی اور سارا عربستان اس معرکے کا منتظر تھا ہر قبیلے میں اس پر قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ جوں جوں وقت قریب آتا جاتا تھا ان قیاس آرائیوں میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

ابوسفیان نے اُحد سے چلتے چلتے اپنے دل کی بھڑاس ضرور نکال لی تھی مگر اُس کا یہ بڑا بول اب اُس کے گلے کا پھندا بنا ہوا تھا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ سارے عربستان میں قحط پڑا ہوا تھا۔ مکے سے ہزاروں گھوڑوں، اونٹوں کو لے کر بدر جانا اور وہاں ان حالات میں اُن کی خوراک کا بندوبست کرنا ممکن نہیں تھا۔ مدینے والوں کو آسانی تھی کہ بدر اُن سے چند میل

کے فاصلے پر تھا۔ وقت سر پر آ گیا تھا اور ابو سفیان پریشان تھا۔ چیلنج اس نے خود دیا تھا اور وقتِ مقررہ پر اگر وہ اپنی فوج کو لے کر بدر نہ پہنچا اور مدینے والے پہنچ گئے تو سارے عرب میں اُس کی ساکھ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔ قریش کا منہ کالا ہو جائے گا۔ وہ اور سہیل بن عمرو کئی دفعہ سر جوڑ کر بیٹھے مگر مسئلہ حل طلب تھا، حل طلب ہی رہا۔ سوچ سوچ کر دونوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے مشترک دوست نُعیم بن مسعود کو راز میں لیا جائے۔ بنو غطفان کا یہ مرنجا مرنج شخص جوڑ توڑ کا ماہر تھا۔ سارے عرب کے سربرآوردہ لوگوں سے اس کے مراسم تھے۔ ابو سفیان نے جیسے ہی نُعیم سے بات چھیڑی وہ معاملہ فہم شخص ساری بات سمجھ گیا۔ ابو سفیان نے اُس سے درخواست کی کہ کوئی ایسی صورت پیدا کرو کہ محمد کا لشکر بدر نہ پہنچے اور قریش یہ کہنے کے قابل ہوں کہ ہم تو پوری طرح تیار بیٹھے تھے، مسلمان ہی نہیں پہنچے تو ہم وہاں کس سے جا کر لڑتے۔ اس طرح تمام ذمے داری مدینے والوں پر پڑ جائے گی اور قریش سرخرو ہو جائیں گے۔ ابو سفیان نے نُعیم کو پیشکش کی کہ اگر وہ مسلمانوں کو بدر پہنچنے سے روکنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ اس کو بیس اونٹ انعام دے گا۔

مُہم جُو نُعیم ایک لمحہ ضائع کئے بغیر وہاں سے مدینے روانہ ہو گیا اور وہاں پہنچتے ہی اپنے ملنے والوں کو جن میں انصار، مہاجر، منافق، یہودی سبھی شامل تھے قریش کی عظیم الشان جنگی تیاریوں کی ایسی ایسی من گھڑت تفصیلات سنائیں کہ بہت سوں کو یقین آ گیا۔ منافقین دل ہی دل میں خوش ہوتے، یہودیوں نے ذرا زیادہ خوشیاں منائیں اور دونوں نے مل کر اس بے بنیاد خبر کو ہر ممکن طریقے سے مدینے کے طول و عرض میں پھیلا دیا، یہاں تک کہ مسلمان بھی نفسیاتی دباؤ میں آ گئے۔ اُن کے حلقوں میں بھی اس قسم کی سوچ کا اظہار کیا جانے لگا کہ قریش کی اتنی زبردست تیاری کے بعد، اُن کے خلاف مقابلے پر اُترنا، صریحاً خودکشی ہے۔ ان خیالات کی گونج ابو بکرؓ اور عمر فاروقؓ نے بھی سنی تو بیتاب ہو کر حضورؐ کی خدمت

میں حاضر ہوئے۔ دونوں نے دوٹوک الفاظ میں اپنا مافی الضمیر بیان کیا کہ ہم فوج کشی کے حق میں ہیں۔ حسبنا اللہ و نعم الوکیل جس پر آل عمران کی یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

یہ ایسے لوگ ہیں کہ جب لوگوں نے اُن سے کہا:

اُن لوگوں نے تمہارے مقابلے کے لئے سامان جمع کیا ہے۔

تو اللہ نے اُن کے ایمان کو اور زیادہ کر دیا۔

اور انہوں نے کہہ دیا کہ ہم کو حق تعالیٰ کافی ہے۔

اور وہی سب کام سپرد کرنے کے لئے اچھا ہے۔

پس یہ لوگ خدا کی نعمت اور فضل سے بھرے ہوئے لوٹے اور اُنھیں کوئی ناگواری ذرا بھی پیش نہ آئی۔

(III-۱۷۲-۱۷۵)

اللہ کے نبیؐ نے ابو بکرؓ اور عمرؓ کے الفاظ سن کر فرمایا

"میں بدر پہنچوں گا خواہ مجھے تنہا ہی کیوں نہ جانا پڑے"۔

ان الفاظ کی گونج سارے مدینے میں سنائی دی۔ اس اعلان کے ساتھ ایک طرف تو نُعیم کے بیس اونٹ گئے اور دوسری طرف اسلامی لشکر تیار ہوا اور وقت مقررہ پر بدر پہنچ گیا۔ بات سنبھالنے کے لئے ابو سفیان بھی کچھ فوج لے کر مکے سے نکلا مگر ایک دو دن اِدھر اُدھر گھوم کر واپس آ گیا اور مکے پہنچ کر اعلان کروا دیا کہ ہم تو گئے تھے مدینے والے ہی نہیں آئے۔ ایسے معاملات میں حقیقت کب چھپی رہتی ہے۔ سارے عرب میں ابو سفیان کی تھو تھو ہو گئی۔ صفوان تو سارے مکے میں کہتا پھرتا تھا کہ یہ سب کچھ ابو سفیان اور محض ابو سفیان کا کیا دھرا ہے۔ اُس سے ایسی عاقبت نااندیشی کی توقع نہیں تھی۔ ضرورت کیا پڑی تھی اُسے احد کی کامیابی کے بعد اس قسم کے چیلنج دینے کی۔

غزوۂ احزاب

آج دمشق کی اس پُر سکون فضا میں اُن حالات کا تصوّر بھی مشکل ہے لیکن ہجرت کے پانچویں سال موسم سرما میں، جب مدینے میں عرب قبائل کے اجتماعی حملے کی تیاریوں کی خبریں پہنچیں، تو ہماری پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ خبر ملی کہ مکّے میں دارالندوہ میں قریش کا ایک اجلاس ہوا ہے جس میں قریش کا علمِ جنگ لہرا لیا گیا۔ عثمان بن طلحہ کو علَم برداری کا منصب سونپا گیا۔ شاید اس لئے کہ اُحد میں یہ منصب عثمان کے باپ کو دیا گیا تھا اور وہ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ مکّے سے آنے والوں نے یہ بھی خبریں سنائیں کہ قریش نے ابو سفیان کی سربراہی میں چار ہزار شمشیر زنوں کا لشکر تیار کیا ہے جس میں تین سو گھوڑے اور ایک ہزار برق رفتار اونٹنیاں شامل ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بنو فزارہ سے عُیَینہ بن حصن کی قیادت میں گھڑ سواروں کے دل کے دل نکلے ہیں اور اُن کے جلو میں بھی ایک ہزار تیز رفتار سانڈنیاں

ہیں۔ قبیلہ بنو مُرّہ کے چار سو جنگجو حارث بن عوف کی کمان میں مسلمانوں سے جنگ کے لئے نکلے ہیں۔ قبیلہ اشجع سے خبر ملی کہ اُنھوں نے بھی مِسعر بن رُخیلہ کو اپنے چار سو تیغ زنوں کا سردار بنا کر بھیجا ہے۔ اُدھر سے بنو سُلیم سات سو افراد کا لشکر لے کر اُن کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ اسی طرح بنو اسد اور بنو سعد کی لشکر کشی کی تیاریوں کی بھی خبریں ملیں۔ ساری خبریں یکجا ہوئیں تو اندازہ ہوا کہ کم و بیش دس ہزار کا لشکر ہے جو ابو سفیان کی قیادت میں مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے پر تول رہا ہے۔ صحرائے عرب میں یُوں تو آئے دن کوئی نہ کوئی معرکہ ہوتا رہتا تھا لیکن فوج کشی کے لئے اتنا بڑا اژدھام پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا اور فوج کشی بھی ایسی کہ اُن کی تعداد میں، اُن کے رسل و رسائل کی سہولتوں میں، اُن کے اسلحہ میں، اُن کے رسد کے انتظامات میں اور ہمارے وسائل میں زمین آسمان کا فرق تھا اور شاید یہ آسمانی فرق ہی تھا جس نے ہماری اور ہمارے آفاقی دین کی لاج رکھ لی۔ جوں ہی قریش نے مکّے سے کوچ کی تیاری کی، بنو خزاعہ کے چند گھڑ سواروں نے برق رفتاری کے ساتھ صرف چار دن میں مدینے کی مسافت طے کر کے حضورؐ کو تمام تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ اب گنا چنا وقت رہ گیا تھا۔ ایک ہفتے میں دشمن سر پر آن پہنچے گا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ مسجد نبوی میں نبیِ کریمؐ نے اپنے رفقاء کو مشورے کے لئے جمع فرمایا، بالکل ویسے ہی جیسے جنگ اُحد سے قبل اُنھوں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا تھا۔ جنگ کی حکمتِ عملی پر مباحثہ ہُوا اور نہایت غور و خوض کے بعد ہمارے قائدؐ نے سلمان فارسیؓ کی رائے سے اتفاق فرمایا۔ سلمانؓ کی تجویز یہ تھی کہ جنگ مدینے کے اندر رہ کر لڑی جائے۔ مدینے کے تین اطراف تو پہاڑ ہیں جہاں سے حملہ نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف شام کی سمت پہاڑ نہیں ہیں۔ ہمارے دائیں بائیں کے دونوں پہاڑوں کے درمیان ایک ایسی گہری اور چوڑی خندق کھو دی جائے جس کا عبور سانڈنی سواروں اور گھڑ سواروں کے لئے ممکن نہ ہو۔ اُنھوں نے بتایا کہ اہلِ فارس یہ طریقہ بہت کامیابی سے استعمال کرتے

ہیں۔ چنانچہ اسی حکمتِ عملی پر عمل کیا گیا۔ خندق کے اس طرف جو قریبی مکان تھے خالی کرا لئے گئے۔ تمام عورتوں، بچوّں اور ضعیفوں کو خندق سے دو فرلانگ کے فاصلے پر حویلیوں اور بڑے بڑے گھروں میں منتقل کر دیا گیا۔ خندق کی کھدائی میں جو چھوٹے بڑے پتھر نکلتے تھے اُنھیں دشمنوں پر برسانے کے لئے جگہ جگہ ڈھیر کرتے جاتے تھے۔ سلع کی پہاڑی کے دامن سے بھی مناسب وزن کے پتھروں کو جمع کر کے ان ڈھیروں میں شامل کر دیا گیا۔ بنو قریظہ سے باہمی تعاون کا معاہدہ تھا، اُن سے کدالیں، پھاوڑے، بیلچے اور مٹی پھینکنے کے لئے کھجوریں رکھنے کی ٹوکریاں حاصل کی گئیں۔ منہ اندھیرے نمازِ فجر کے بعد کھدائی کا کام شروع ہو جاتا تھا جو مغرب تک جاری رہتا۔ کھدائی کرنے والوں نے اپنی قمیضیں اُتار رکھی تھیں۔ جب مٹی پھینکنے کے لئے ٹوکریاں کم پڑتیں تو اپنی قمیصوں ہی میں مٹّی بھر بھر کر پھینکتے جاتے تھے۔

یہ خندق مسلسل نہیں تھی۔ جگہ جگہ بڑی بڑی چٹانیں تھیں۔ مکانات بنے ہوئے تھے جو خود حملہ آوروں کے خلاف رکاوٹ تھے۔ جہاں پہاڑ یا مکان نہیں تھے اُن حصّوں میں خندق کھود کر کہیں مکانوں اور کہیں پہاڑوں سے ملانا تھا تاکہ مدافعت مکمل ہو جائے۔ خندق کھودنے والے ہر شخص کو احساس تھا کہ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ سستی اور سہل انگاری کی کوئی گنجائش نہیں۔ چاہے کئی وقتوں کا فاقہ ہے، چاہے تھک کر نڈھال ہو چکے ہیں لیکن کام کئے جانا ہے کیوں کہ دشمنوں کے پہنچنے سے پہلے خندق تیار نہ ہوئی تو مدینے کا ایک فرد بھی اُن کے ظلم اور سفاکی سے نہ بچ سکے گا۔ اُنھیں یاد تھا کہ اُحد میں ان ظالموں نے کس طرح لاشوں کا مُثلہ کیا تھا۔ اور اب تو اُنھوں نے اسلام کی مکمل بیخ کنی کا عزم کر رکھا تھا۔ مستقبل کا سارا نقشہ اُنھیں اپنی نظروں کے سامنے چلتا پھرتا دکھائی دے رہا تھا۔

یہ ساری باتیں میں تفصیل سے اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ میرے سامنے اُن

ہولناک دنوں کی بے شمار تصویریں چل پھر رہی ہیں۔ کھدائی کرنے والے مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اُن کے معاون سروں پر مٹی بھری ٹوکریاں لادے قطار در قطار مٹی باہر پھینکتے جاتے تھے۔ خندق رفتہ رفتہ گہری ہوتی گئی۔ سلمان فارسیؓ تن و توش کے بہت مضبوط تھے، پھر بنو قریظہ کی ملازمت کے دوران میں اُنھیں مٹی کھودنے کی خاصی مشق ہو گئی تھی۔ ہر شخص اُن کی کارکردگی پر عش عش کر رہا تھا۔ مہاجر اُنھیں اپنی صف میں شامل کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ وہ بھی اُن کی طرح تلاشِ حق میں باہر سے آئے ہیں۔ انصار دلیلیں دیتے کہ نہیں وہ نبیؐ کے ورود سے پہلے مدینے میں موجود تھے، اس لئے وہ انصار میں سے ہیں۔ حضورؐ دونوں کی باتیں سُن سُن کر مُسکراتے رہتے۔ آخر ایک دفعہ جب یہ گفتگو طول پکڑ گئی تو سرکارِ دو عالمؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا:

"سلمان ہمارا ہے۔ نبی کے گھر کا فرد ہے"۔

نبیؐ کے گھر کا فرد ہونے کا شرف مجھے بھی بخشا گیا تھا۔ نبیِ محترمؐ بھی خندق کی کھدائی کے تمام کام میں برابر شرکت فرماتے رہے۔ کبھی ایک ٹولی کے ساتھ ہوتے کبھی دوسری کے ساتھ۔ مگر حکم تھا کہ جب کوئی مشکل پیش آئے یا کوئی غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا ہو تو وہ جہاں بھی ہوں اُنھیں مطلع کیا جائے۔ ایسی پہلی صورتِ حال جابرؓ کو پیش آئی۔ وہ جہاں کھدائی کر رہے تھے وہاں زمین سے ایک اتنا بڑا پتھر نکل آیا جو کسی اوزار سے ٹس سے مَس نہ ہوتا تھا۔ رسالت مآبؐ کو اطلاع دی گی وہ وہاں پہنچے۔ انھوں نے پانی منگوایا اور اس میں اپنا لعابِ دہن شامل کیا۔ پھر وہ پانی پتھر پر چھڑک دیا۔ پھر جب سب نے مل کر زور لگایا تو وہ پتھر آسانی سے اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ دوسری مرتبہ مہاجرین کی ٹولی کی طرف سے مدد کی درخواست موصول ہوئی۔ عمرؓ نے رسول اللہؐ سے عرض کی کہ ایک بہت بڑا پتھر ہے جو کسی طرح اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ رسالت مآبؐ وہاں پہنچے، اُنھوں نے عمرؓ کے ہاتھ سے کدال لے کر پتھر پر ایک ضرب لگائی جس سے ایک شعلہ

بلند ہوا، اتنا روشن کہ مدینے کا شہر اور جنوبی علاقہ روشن ہو گیا۔ پھر اُنھوں نے ایک اور ضرب لگائی تو اسی طرح چنگاریاں بلند ہوئیں لیکن اس مرتبہ اُحد اور اُس کے اُدھر کا تمام شمالی علاقہ روشن ہو گیا۔ تیسری ضرب لگی تو پتھر ریزہ ریزہ ہو گیا اور اس مرتبہ جو روشنی نکلی تو تمام مشرقی علاقے میں چکاچوند ہو گئی۔ اس وقت میں حضورؐ کے خیمے میں خدمت پر مامور تھا۔ سلمان فارسیؓ البتہ وہاں موجود تھے۔ اُنھوں نے یہ تمام ماجرا مجھے سُنایا۔ اُنھوں نے بتایا کہ جب میں نے یہ روشنیاں دیکھیں تو نبی مکرمؐ سے اس کی تعبیر پوچھی۔ حضورؐ نے فرمایا سلمان پہلی روشنی میں مَیں نے یمن کے محلات دیکھے۔ دوسری میں مجھے شام کے محلات نظر آئے اور تیسری روشنی میں مجھے مدائن میں کسریٰ کا سفید محل دکھائی دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے بشارت ملی ہے کہ میرے لئے پہلی روشنی کے ذریعے یمن کی راہ کھول دی گئی ہے۔ دوسری کے ذریعے شام اور تیسری کے ذریعے مشرق کے راستے وا کر دئے گئے ہیں۔

ہم میں سے بیشتر کو کئی کئی وقت کا فاقہ رہتا تھا۔ اُدھر سخت محنت کشی ہمیں نڈھال کئے دیتی تھی۔ خود رسالت مآبؐ بھی کئی کئی وقت کے فاقے سے رہتے تھے۔ جب جابرؓ نے اُن سے پتھر ہلانے کے لئے مدد مانگی تھی تو اُنھیں کئی روز بعد حضورؐ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ حضورؐ اُنھیں بہت کمزور دکھائی دئے۔ جابرؓ نے گھر جا کر اپنی بیوی کو اس پریشانی کا حال سنایا تو اُنھوں نے کہا ہمارے پاس تو صرف یہ ایک بھیڑ کا چھوٹا سا بچہ ہے اور کچھ جَو۔ چنانچہ اُنھوں نے بھیڑ کے بچے کو ذبح کر کے پکالیا اور جَو پیس کر کچھ روٹیاں بنالیں۔ اُس دن جب کام کرتے کرتے رات ہو گئی اور اندھیرے میں نظر آنا بند ہو گیا تو جابرؓ رسولِ اکرمؐ کے پاس گئے اور اُنھیں شام کے کھانے کی دعوت دی۔ جابرؓ یہ قصہ بڑے شوق سے بیان کرتے تھے۔ کہنے لگے کہ رسول اللہؐ نے میری ہتھیلی پر ہتھیلی رکھ دی اور میری انگلیاں اپنی انگلیوں میں جکڑ لیں۔ میں نے تو صرف اُنھیں دعوت دی تھی مگر اُنھوں نے عام اعلان کروا دیا کہ

آج جابرؓ کے یہاں ہم سب کی دعوت ہے۔ میں پریشان ہو کر گھر روانہ ہوا اور اپنی بیوی کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ بیوی نے ذرا توقف کے بعد سوال کیا کہ سب کو دعوت تم نے دی ہے یا حضورؐ نے اپنی طرف سے۔ میں نے کہا یہ اُن کا اپنا فیصلہ تھا۔ بیوی نے یہ سُن کر کہا تو پھر وہ بہتر سمجھتے ہیں۔ حضورؐ دس صحابہ کے ساتھ جابرؓ کے گھر پہنچے۔ کھانا اُن کے سامنے چن دیا گیا۔ اُنھوں نے اس پر اللہ کا نام لے کر برکت کی دُعا مانگی۔ جب سب سیر ہو کر کھا چکے تو کھانا ابھی باقی تھا۔ پھر اسی طرح دس دس کی ٹولیاں آتی رہیں اور سیر ہو ہو کر لوٹتی رہیں۔ میں آخری ٹولی میں تھا۔ ہمارے کھا چکنے کے بعد بھی کچھ کھانا بچ رہا تھا۔ ہر شخص اپنی آنکھوں سے اللہ کی رحمت دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں شکر بجا لا رہا تھا۔ حضورؐ تمام وقت دن بھر کے تھکے ماندے لوگوں کو سیر ہو کر کھاتے دیکھ کر تبسّم فرماتے رہے اور میں سوچ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کس کس انداز سے اپنی رزّاقی کی لاج رکھتا ہے۔

چھ دن کی محنتِ شاقہ کے بعد خندق تیار ہو گئی۔ ہم لوگوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی کہ ہماری محنت بر آئی۔ اب صرف اللہ تعالیٰ سے دُعا تھی کہ وہ ہمیں نصرت عطا فرمائے اور اس امتحان میں سرخرو کرے۔

خندق مکمل ہوتے ہی حضورِ اکرمؐ نے خندق کے ساتھ ہی پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا۔ خود آپ کا سُرخ چمڑے کا خیمہ عین کوہِ سلع کے دامن میں نصب کیا گیا۔

اُدھر قریش حملہ آور اپنے ساتھیوں سمیت مدینے کے نواح میں جنوب مغرب کی طرف سے پہنچے۔ وہ مکّے سے ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ اُسی راستے سے آئے تھے جو انھوں نے غزوۂ اُحد کے وقت اختیار کیا تھا۔ بنو غطفان اور نجد کے دوسرے قبیلوں کے لشکر مشرق یعنی صحرائے نجد کی طرف سے پہنچے۔ دونوں لشکر اُحد میں جمع ہوئے اس خیال سے کہ اب بھی اُحد ہی میدانِ جنگ بنے گا۔ اُحد کے قریب پہنچتے پہنچتے پہلا صدمہ تو اُنھیں یہ

دیکھ کر ہوا کہ خریف کی ساری فصل کٹ چکی ہے اور اب اُن کے اونٹوں کو خود رو خاردار جھاڑیوں پر گزارا کرنا ہو گا۔ گھوڑوں کے لئے چارہ بس وہی تھا جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے جو قطعاً ناکافی تھا۔ اُنھوں نے دل ہی دل میں سوچا کہ اب جو بھی ہونا ہے بلا تاخیر ہو جانا چاہیے۔ جب اُحد میں اُنھیں دُور دُور تک مسلمانوں کا کہیں نام و نشان نہ دکھائی دیا تو فیصلہ کیا کہ مدینے کی طرف پیش قدمی کی جائے۔ خالد اور عکرمہ جو جیشِ قریش کے گھڑ سوار دستوں کی کمان کر رہے تھے مدینے کی طرف لپکے۔ خندق کی مدینے والی سمت کی سطح مخالف سمت کی سطح سے ذرا بلند تھی چنانچہ اُنھیں دور ہی سے مسلمانوں کا پڑاؤ نظر آ گیا۔ اُن کا خیال تھا کہ ان مٹھی بھر لوگوں کو تو وہ محض اپنی تعداد سے کچل کر رکھ دیں گے لیکن خندق اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ جوں ہی وہ ذرا قریب آئے اور اُنھیں اپنے راستے میں ایک ناقابلِ عبور خندق حائل نظر آئی تو دانت پیس کر رہ گئے۔ کچھ نہ بن پڑا تو زچ ہو کر بآوازِ بلند کہنے لگے کہ اس طرح اوٹ سے لڑنا عربوں کی حمیّت کی توہین ہے۔

اب صورتِ حال سب کے سامنے تھی۔ مسلمان خندق کے اِس پار مدینے کی طرف تیر اندازوں کے پرے جمائے بیٹھے تھے اور کفّار خندق کے اُس پار خندق عبور کرنے کی کوشش میں کبھی قریب آتے تھے، کبھی تیروں کی بارش سے زخمی ہو کر پلٹ جاتے تھے۔ اُدھر سے بھی تیر اندازی ہو رہی تھی۔ ایک تیر سعد بن معاذؓ کے بازو میں لگا جس سے اُن کی ایک رگ کٹ گئی۔ اُدھر بھی بہت سے لوگوں نے تیروں کے زخم کھائے۔ قریش اور غطفان کے کئی گھوڑے بھی تیروں سے زخمی ہو کر گرے۔ خندق میں ایک جگہ ایسی تھی جس کی چوڑائی نسبتاً کم تھی۔ دشمنوں کی اُس پر نظر تھی۔ وہ سارا دن اُس جگہ کا معائنہ کرتے رہتے تھے۔ ہم لوگوں نے بھی وہاں اپنا پہرہ سخت کر رکھا تھا۔ ایک لمحہ ایسا آیا کہ قریش کے دستوں نے محسوس کیا کہ اس مقام پر مسلمانوں کا پہرہ اتنا سخت نہیں رہا۔ چنانچہ عمرو بن عبدِ وُد، عکرمہ،

ضرار بن الخطاب اور قبیلہ مخزوم کے نوفل نے گھوڑوں کو مہمیز دی اور خندق پار کر کے مسلمانوں کے سر پر آ کھڑے ہوئے۔ علیؓ اور عمرؓ نے چشمِ زدن میں آگے بڑھ کر اُن کا راستہ روک دیا۔ عمرو بن عبدالود نے مبارزت طلب کی اور علیؓ کے ہاتھوں جہنم واصل ہوا۔ باقی الٹے قدمے لوٹے اور آناً فاناً خندق پار کر گئے۔ لیکن نوفل کا گھوڑا خندق پار نہ کر سکا اور سوار سمیت خندق میں گر گیا۔ نوفل پر مسلمانوں نے پتھروں کی بوچھاڑ کر دی۔ آخر اُس بدنصیب نے خود ہی درخواست کی کہ اس سے بہتر ہے اُسے قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ چند مسلمان نیچے اُترے اور اُسے قتل کر کے اُس کی لاش پر مٹی پھینک دی۔

ابھی میں نے کہا تھا کہ صورتِ حال اب بالکل واضح ہو گئی تھی مگر درپردہ دو شخص ایسے کردار ادا کر رہے تھے جو بے حد اہمیت کے حامل تھے اور جس سے عام لوگ بے خبر تھے۔ ایک تو حیَی بن اخطب کا کردار تھا جو بنو قریظہ کے درپے تھا کہ وہ محمدؐ سے اپنا معاہدہ توڑ دیں۔ بنو قریظہ کا سردار کعب ابن سعد اور بنو قریظہ کے تمام لوگ اسے منحوس سمجھتے تھے۔ کیونکہ اُس کی وجہ سے بنو نضیر پر آفت نازل ہوئی تھی۔ جب حیَی بن اخطب بنو قریظہ کے قلعے پر پہنچا تو اس کا نام سُن کر کعب نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ بڑی منت سماجت کے بعد اُس نے دروازہ کھلوایا تو کعب اُس کی کوئی بات سننے پر رضامند نہ نظر آیا۔ حیَی اپنے دلائل پیش کرتا گیا اور آخر کعب کو اپنی چکنی چپڑی باتوں میں لے آیا۔ آخری بات اس نے یہ کی کہ اوّل تو قریش کی ناکامی کا کوئی امکان ہی نہیں اور بالفرض اگر حجت کی خاطر مان بھی لیا جائے تو حیَی، بنو قریظہ کے قلعے میں بنو قریظہ کے دوش بدوش محمدؐ کی انتقامی کارروائی کا مقابلہ کرے گا، اُن کے ساتھ جان دے گا۔ کعب اُس کی لچھے دار باتوں میں آ گیا۔ حیَی نے اُن کا تحریری معاہدہ منگوایا اور اپنے ہاتھوں سے اُس کو پھاڑ کر دو ٹکڑے کر دیا۔ کعب نے جب اپنے قبیلے کے لوگوں کو یہ خبر سنائی تو اُن میں سے اکثر نے اس کی مخالفت کی مگر پس و پیش کا وقت اب گزر چکا تھا اور کعب نے

کفار کی حمایت کی ٹھان لی تھی۔ خندق کے اُس پار بنو قریظہ میں بھی منافقین کی خاصی تعداد اپنے کاموں میں سرگرم تھی۔ اُن کی طرف سے رسول اللہؐ کے کانوں میں بھنک پڑی کہ بنو قریظہ معاہدہ منسوخ کر چکے ہیں۔ وہ بے حد پریشان ہو گئے اُنھوں نے فوراً اوس کے سعد بن معاذؓ، خزرج کے سعد بن عبادہؓ، زبیرؓ اور اُسید بن حُضیرؓ کو اس ناگہانی خبر کی تصدیق کرنے کے لئے بھیجا۔ یہ لوگ بنو قریظہ کے پاس پہنچے تو اُنھوں نے اُنھیں رسالت مآبؐ کے خلاف نہایت توہین آمیز الفاظ استعمال کرتے سُنا۔ بنو قریظہ نے اُن کی ایک دلیل نہ سنی۔ واپس آکر اُنھوں نے بڑی پردہ داری سے حضورؐ کو صورتِ حال سے مطلع کر دیا۔ نبیِ اکرمؐ نے اُن کی روداد سُن کر با آواز بلند اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور مسلمانوں کو حوصلہ بلند رکھنے کی تلقین کی۔

دوسرا اہم کردار اس معرکے کا نُعیم بن مسعودؓ تھے جو اس وقت سامنے آئے جب بنو قریظہ کی بدعہدی سے حضورؐ بے حد پریشان تھے۔ دشمنوں کی صفوں میں بھی کچھ پریشانیاں تھیں۔ بنو غطفان کا قریش اور یہود سے کوئی اصولی معاہدہ نہیں تھا وہ اُنھیں لوٹ مار اور خیبر کی فصل کے نصف حصے کا لالچ دے کر ساتھ لائے تھے۔ اب بنو غطفان محاصرے کے طول سے گھبرا رہے تھے۔ اپنی اور اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کی خوراک کی کمی اُنھیں بدحال کئے دے رہی تھی۔ دو ہفتے گزر چکے تھے۔ ہر روز اُن کے کئی گھوڑے بھوک سے انڈھال ہو کر مر جاتے تھے۔ اس لئے اُنھوں نے اپنا ایک نمائندہ حارث غطفانی محسنِ عالمؐ کی طرف بھیجا اور کہا کہ اگر آپ ہم کو مدینے کی کھجوروں کی فصل سے نصف حصہ دینے پر رضامند ہوں تو ہم اپنے گھروں کو واپس لوٹ جائیں گے۔ مگر انصارِ مدینہ اس پر راضی نہ ہوئے۔

نُعیمؓ بنو غطفان کی شاخ بنو اشجع کے فرد تھے اور اپنے قبیلے کے ساتھ اس مہم میں اُن کے شریک تھے۔ جنگِ احزاب ہی کے دنوں میں اُنھوں نے اپنے قلب میں اسلام کی روشنی محسوس کی اور ایک دن بے قرار ہو کر چھپتے چھپاتے مدینے پہنچے اور سرورِ دو عالمؐ کے خیمے میں

حاضر ہو گئے۔ نبیِ اکرمؐ انھیں دیکھ کر حیران ہوئے اور پوچھا کہ کیسے آنا ہوا۔ نعیمؓ نے اپنا مدعا بیان کیا اور بیعت کر کے باقاعدہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ قلب میں اسلام کی شمع جلی تو اسلام کا درد بھی محسوس ہوا۔ حضورؐ سے پوچھنے لگے کہ دریں حالات وہ دین کی کیا خدمت بجا لا سکتے ہیں۔ آپؐ نے اُن سے فرمایا کہ اسلام دشمن قبائل میں جس طرح ممکن ہو پھوٹ ڈالو۔ نعیمؓ نے پوچھا کہ اگر مجھے اس سلسلے میں تھوڑی بہت دروغ گوئی کر کے کسی کو فریب دینا پڑے تو۔ حضورؐ نے معاً فرمایا:

"جنگ تو ہے ہی سراسر فریب"۔

نعیمؓ بارگاہِ رسالت سے اُٹھے تو مکمل طور پر بدلے ہوئے انسان تھے۔ سیدھے بنو قریظہ کے پاس پہنچے۔ کعب نے اُن کی بڑی آؤبھگت کی، لیکن نعیمؓ نے کہا کہ اس وقت میں اپنی خاطر تواضع کرانے نہیں آیا بلکہ تم کو ایک بڑی مصیبت سے خبردار کرنے آیا ہوں۔ محمدؐ سے پیمان شکنی ہو سکتا ہے تمھیں بہت مہنگی پڑے۔ کعب جو یہ سننے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا ایک دم چوکنا ہو گیا۔ نعیم نے کہا جنگ بہر نوع جنگ ہے اور آخری میدان کسی کے ہاتھ بھی رہ سکتا ہے۔ اگر قریش اور بنو غطفان وغیرہ کامیاب ہوتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اُس ایک فیصد اتفاق سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ کسی وجہ سے جنگ کا پانسہ پلٹ جائے اور قریش اپنے ساتھیوں سمیت اپنے گھروں کا رُخ کر جائیں، پھر تمھارا کیا حشر ہوگا۔ تمھیں تو یہاں مسلمانوں کے درمیان ہی رہنا ہے۔ مسلمانوں کے انتقام کے تصوّر ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔ تم لوگوں کا تو نشان باقی نہیں رہے گا۔ کعب یہ باتیں غور سے سُن رہا تھا۔ نعیمؓ کے خدشات بنو قریظہ کو اپنے دل کی آواز محسوس ہوئے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ معاہدہ تو وہ توڑ چکے تھے، بلکہ مسلمانوں کے ایک وفد کے سامنے رسولِ اکرمؐ کے لئے نہایت اہانت آمیز لفظ بھی استعمال کر چکے تھے۔ نعیمؓ نے انھیں مشورہ دیا کہ قریش اور بنو غطفان کو

واقعی پابند کرنے کے لئے کہ وہ انھیں مسلمانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر فرار نہ ہو جائیں بنو قریظہ کو چاہیئے کہ وہ ضمانت کے طور پر دونوں بڑے قبیلوں سے کچھ سربرآوردہ شخصیتوں کو اپنے پاس بطور ضمانت رکھ لیں تاکہ اگر قریش اور بنو غطفان کے دل میں کسی وقت یہ خیال آ بھی جائے کہ وہ بنو قریظہ کو اپنے حال پر چھوڑ کر واپس چلے جائیں تو اس پر عمل کرنے سے پہلے سو مرتبہ سوچیں۔ بنو قریظہ کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔ یہ کہہ کر نعیمؓ سیدھے ابو سفیان کے خیمے میں پہنچے اور کہنے لگے کہ میں نے کچھ باتیں سنی ہیں جن کا آپ کو علم ہونا چاہیئے۔ ابو سفیان نے وضاحت چاہی تو انھوں نے سخت رازداری کا وعدہ لے کر کہا مجھے اطلاع ملی ہے کہ بنو قریظہ مسلمانوں سے معاہدہ توڑ کر اپنے فیصلے پر بہت پچھتا رہے ہیں۔ بے حد پشیمان ہیں اور اب وہ مسلمانوں کے خلاف اپنی سابقہ کارروائی کی تلافی کے راستے ڈھونڈ رہے ہیں۔ اُنھوں نے طے کیا ہے کہ کسی طرح قریش اور غطفان کے چند اہم لوگ حاصل کئے جائیں اور انھیں محمدؐ کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ انھیں قتل کر کے بنو قریظہ کی خطا معاف کر دیں۔ اُٹھتے اُٹھتے پھر اُنھوں نے ابو سفیان سے وعدہ لیا کہ وہ ان کی تمام گفتگو صیغۂ راز میں رکھے گا۔ وہاں سے اُٹھ کر نعیمؓ سیدھے بنو غطفان کے پاس پہنچے اور انھیں بھی وہ کچھ کہا جو ابو سفیان سے کہا تھا اور اُن سے بھی رازداری کا وعدہ لے لیا۔ ابو سفیان سیانا آدمی تھا مگر اُس کے دل میں شک کی لکیر سی پڑ گئی۔ وہ بے حد فکرمند ہو گیا۔ اس کا ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ دوسرے ہی دن اُس نے بنو قریظہ کو پیغام بھجوایا کہ کل صبح حملے کے لئے تیار ہو جائیں۔ وہاں سے صاف جواب مل گیا کہ کل تو یوم سبت ہے لڑائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اب وہ آئندہ بھی اگر جنگ میں شریک ہوئے تو اس شرط پر ہوں گے کہ پہلے بنو قریش اور بنو غطفان اپنے کچھ مقتدر بندے اُن کے حوالے کر دیں۔ اب تو ابو سفیان کا شک پورے یقین سے بدل گیا۔ نعیمؓ کی بتائی ہوئی ایک ایک بات درست معلوم ہونے لگی۔ اُدھر نعیمؓ ابو سفیان اور بنو غطفان سے گفتگو کے بعد چھپتے چھپاتے ہمارے خیموں میں پہنچے۔ میں نے حضورؐ کو اُن کی

آمد کی اطلاع دی۔ حضورؐ نے فوراً باریابی کی اجازت عطا فرمائی۔ نعیمؓ نے بڑی تفصیل سے اپنی کارروائی کی روداد سنائی۔ ہم سب تو اُن کی گفتگو سے حظ اُٹھا ہی رہے تھے لیکن نبیؐ کریمؐ بہت زیادہ لطف اندوز ہو رہے تھے۔ خاص طور پر ابو سفیان سے نعیمؓ کی ملاقات کی تفصیل سُن سُن کر سرورِ کائناتؐ بے حد محظوظ ہوئے۔ اُن کا پور پور مسکرا رہا تھا۔

ابو سفیان حضورؐ کا بچپن کا ساتھی تھا۔ دونوں ساتھ پلے بڑھے تھے۔ وہ اس شعلہ خُو کے مزاج سے واقف تھے۔ اُس کی کمزوریوں سے آشنا تھے۔ اُس کی حد سے بڑھی ہوئی انا کو جانتے تھے۔ اُنھیں اندازہ تھا کہ وہ جب کسی بات پر اڑ جاتا تھا تو کسی کی نہ سنتا تھا۔ خود سری جو خود پرستی کی حد تک بڑھی ہوئی تھی اس کے خمیر کا حصہ تھی۔ بر خود غلط اتنا تھا کہ اپنی رائے کے مقابلے میں بہتر سے بہتر رائے کو بے وقعت سمجھتا تھا۔ خود کو عقلِ کل جانتا تھا۔ اپنی غلطی تسلیم کرنا اُس کے لئے تقریباً ناممکن تھا۔ حضورؐ بار بار نعیمؓ سے تفصیل دہرانے کو کہتے۔ فرماتے اچھا تو جب تم نے یہ کہا تو پھر ابو سفیان نے کیا کہا۔ جب تم نے پہلے پہل بات چھیڑی تو اس کا ردِ عمل کیا تھا۔ تم نے پہلے پہل بات کیسے شروع کی۔ اُٹھ کے آئے تو ابو سفیان کے چہرے پر کیا تاثر تھا۔ ہر بات مسکرا مسکرا کر بار بار پوچھتے۔ ہم سب کے سر سے بھی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بہت بڑا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔ آویزش کی بنیاد پڑ گئی تھی اور دشمنوں کے درمیان ایک دوسرے پر اعتبار اُٹھ گیا تھا۔ جو اُن حالات میں ہمارے لئے ارحم الراحمین کا احسانِ عظیم تھا۔ اب ہمیں احساس ہو چلا تھا کہ دشمن کی مہم جوئی عملاً بے اثر ہوتی جا رہی ہے۔ تین دن اور گزر گئے اور صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ صرف یہ اطلاع ملتی رہتی تھی کہ یہود اور قریش نے جو بھان متی کا کنبہ جوڑا تھا اور جس کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ بس ایک دن کا کام ہے۔ مسلمانوں کو ختم کر کے لُوٹ مار کریں گے اور فاتح و کامران اپنے اپنے گھروں کو واپس آ جائیں گے۔ وہ کنبہ اب بے یقینی کا شکار ہو کر ایک دوسرے سے منحرف ہوتا جا رہا تھا۔ اور

اب اُنھیں کسی کامیابی کا یقین نہیں رہا تھا۔ ہمارے اپنے خیموں میں بھی بھوک اور سردی سے حالات دگرگوں تھے۔ خالق و مالکِ کائنات سے دعائیں مانگتے تھے کہ یہ عذاب جلد ختم ہو۔ نبیؐ پاکؐ ساری ساری رات عبادت اور دعاؤں میں گزارتے تھے۔ پھر جو ہوا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ مجھے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ کیسے ایک یخ بستہ رات میں برق و باد و باراں کا طوفان آیا اور کیسے دشمنوں کا ایک ایک خیمہ اکھڑ کر ہوا کے تھپیڑوں میں اُڑتا پھرا، کیسے دشمنوں کے سب سے بڑے سرغنہ ابو سفیان نے محاصرہ توڑ کر واپس جانے کا اعلان کیا اور کسی کے جواب کا انتظار کئے بغیر خود مکے کی طرف روانہ ہو گیا۔ حضورؐ کے حکم پر حذیفہؓ خندق کے اُس پار گئے اور اپنی آنکھوں سے سارا ماجرا دیکھ کر حضورؐ کو سنایا۔ ہم سب نے کلمۂ شکر ادا کیا۔ علی الصبح رسولِ کریمؐ نے مجھے اذان دینے کا حکم دیا۔ اذان میں جب میں نے اللہ اکبر کے الفاظ ادا کئے تو خندق کے پار خیموں کی تباہی اور دشمن کی پسپائی کا منظر مجھے اللہ اکبر کی تفسیر دکھائی دیا۔ دھندلی دھندلی روشنی میں صاف نظر آ رہا تھا کہ اُدھر کوئی ذی روح موجود نہیں ہے۔ تمام خیمے اکھڑے پڑے ہیں۔ چاروں طرف بکھرا ہوا ساز و سامان گواہی دے رہا تھا کہ غنیم کس افراتفری کے عالم میں فرار ہوا ہے۔ اسی موقع پر سورۂ احزاب کی نویں آیت نازل ہوئی، جس میں ربِّ ذوالجلال والاکرام نے اس احسان کا بیان فرمایا ہے۔ اذان کے بعد اقامت ہوئی۔ ہادیٔ برحقؐ نے امامت فرمائی۔ ہر شخص دل ہی دل میں شکر کے ہزار ہزار سجدے کر رہا تھا۔ سب کی آنکھیں رحمان الرحیم کے کرم سے اشکبار تھیں۔ نماز پڑھ کر سب اپنے اپنے خیموں کی طرف روانہ ہو گئے لیکن مَیں دیر تک اُجڑے اُکھڑے خیموں کو دیکھتا رہا۔ میرے لبوں پر یہ کلمہ جاری تھا لاحول والاقوۃ الّا باللہ العلی اعظیم۔ جسے میں اکثر رسول اللہؐ کے مُنہ سے سُنا کرتا تھا۔

میں دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا وکفٰی بِربِّک ہادیاً ونصیراً اللہ بلند و برتر کے سوا

کوئی اور طاقت، کوئی قوت نہیں۔ وہی نصیر ہے، وہی سمیع ہے۔ وہی یکتا و یگانہ، دلوں کے راز جاننے والا وہ طاقت رکھتا ہے کہ جو وہ چاہے وہ ہو جائے۔ وہ جب اپنے امکانات کے چھپے ہوئے خزانے پر ارادۂ تخلیق کی نظر ڈالتا ہے تو غیب سے اشیاء خلعتِ وجود سے آراستہ ہو ہو کر پردۂ ہستی پر آنے لگتی ہیں۔ وہ ہر لحظہ اپنے آپ کو منوا سکتا ہے۔ یہ کوتاہ فہم اور بد نہاد لوگ جو ہمارے خلاف، ہمارے دین کے خلاف محض اپنی تعداد، اسلحہ اور نخوت کے زور پر اُمڈ آئے تھے اُس ذاتِ مطلق کے دائرۂ اختیار کا کوئی تصوّر نہیں رکھتے تھے۔ وہ خود پرست، بد خواہ، اپنی قوت کے بل پر اپنے تئیں مختارِ کُل ہونے کا زعم رکھتے تھے، گویا وہ خود اپنے آپ کو نعوذ باللہ، چھوٹا موٹا خدا سمجھ بیٹھے تھے۔ پھر مالک و مختارِ مطلق نے اپنی قدرت سے ان کی خود فریبی اور خام خیالی کا پردہ چاک کر دیا۔ اور ایسے خارج از گمان و قیاس طور پر، کہ اس کی دنیاوی معنوں میں نہ کوئی توجیہ ہے نہ کوئی تاویل۔ بے شک وہی مُعز و مذّل ہے۔ اس کی قوت کے آگے کوئی قوت نہیں۔ اس کی رحمت کے آگے کوئی رحمت نہیں اور کوئی مددگار نہیں اُس کے سوا۔ نہ کوئی اُس سے زیادہ مُنتقم اور سریع الحساب ہے، عظمت ہے تو صرف اُسی کی۔ وہی کبریا ہے اور صرف اُسی کی بزرگی لائقِ حمد و ستائش ہے۔ اب آپ بھی ہند کی طرح کہیں گے کہ میں وعظ کر رہا ہوں۔

میں اپنے خیالات کی رو میں بہا جا رہا تھا۔ خالقِ کائنات کی گمراہ مخلوق اللہ سبحانہٗ کی منشا اور ارادے کے خلاف کیا کیا چالیں چلتی ہے۔ کدھر کدھر کا رُخ کرتی ہے نہیں جانتی کہ مشرق بھی اللہ کا ہے مغرب بھی، شمال بھی اور جنوب بھی، سب کچھ اسی مالکِ کون و مکاں کی مِلک ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ اس کی ذات سے مفر ممکن نہیں۔ یہ بھی اُسی کو علم ہے کہ عساکرِ کفار نے دنیاوی طاقت کے باوجود اپنی بے بسی اور زبوں حالی سے کوئی سبق بھی حاصل کیا یا نہیں۔ ویسے اس سبق کی توفیق بھی اُسی جلّ وعلا، احکم الحاکمین کی جانب سے ملتی ہے۔

میں پتہ نہیں کتنی دیر اور انھیں خیالوں میں گُم رہتا کہ میرے کانوں میں کوچ کا اعلان گونجا۔ اعلان سنتے ہی میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور کوچ کے انتظامات میں لگ گیا۔ حضورؐ کے خیمے کا سارا سامان اور خیمہ اکھاڑ کر اونٹ پر لادا اور اُن کی ہمرکابی میں مدینے کا رُخ کیا۔ راستے بھر سوچتا رہا کہ اللہ تعالیٰ سبحانہٗ کا مجھ پر کتنا کرم ہے کہ نصرت و کامرانی کی ایک اور اذان میرے حصے میں آئی۔

سفرِ حُدیبیہ

جنگِ احزاب کو ایک سال ہو گیا تھا۔ قریش ابھی تک اپنے زخموں کو چاٹ رہے تھے۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ جنگِ خندق میں اپنی شکستِ فاش کا اوروں کو تو کیا، خود اپنے آپ کو کیا جواز دیں۔ کیا بتائیں اپنے حلیفوں کو کہ کیا ہُوا تھا۔ اتنی بڑی تعداد میں اتنی زبردست تیاریوں کے بعد جو حملہ کیا گیا تھا وہ کیسے ہمیشہ کے لئے اُن کی پیشانی کا سیاہ داغ بن کر رہ گیا۔ ابھی تک اُنھیں اپنی شکست کا صحیح پس منظر جاننے کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ اُنھیں ابھی تک یہ باور نہیں آ رہا تھا کہ وہ اُس ازلی جنگ کے بد نصیب فریق ہیں جو روزِ اوّل سے حق و باطل کے درمیان چلتی آ رہی ہے اور جس میں بالآخر باطل کی قوتوں کو ہمیشہ سر نگوں ہونا پڑتا ہے۔ سعد اُلاوس سعد بن معاذؓ کی شہادت کا سانحہ بھی گزرا اور ایسے کہ مدینے کے زمین و آسمان ہل گئے۔ اچھی خبریں بھی ملتی رہیں۔ مختلف قبائل کے وفود آتے رہے اور حلقۂ اسلام وسیع ہوتا چلا گیا۔

ایک دن شوال کے مہینے کی آخری تاریخیں تھیں کہ رسولِ کریمؐ نے ہمیں اپنا ایک خواب سنایا کہ وہ احرام باندھے سر کا حلق کرائے، خانۂ کعبہ کی کلید ہاتھ میں لئے خانہ کعبہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ ساتھ ہی اُنھوں نے اعلان فرمادیا کہ وہ عمرے کے لئے تشریف لے جائیں گے۔ ذی قعد کی پہلی تاریخ کو پیر کے دن حضورؐ نے مدینے سے کوچ فرمایا۔ کم و بیش پندرہ سو صحابہ ہمرکاب تھے۔ اُن کے ساتھ قربانی کے لئے ستّر اونٹ بھی تھے۔ عمرؓ اور سعد بن عبیدہؓ کا خیال تھا کہ ہم دشمنوں کے علاقے میں جا رہے ہیں۔ قریش سے راستے میں بھی خطرہ ہے۔ اس لئے سب لوگ مسلّح ہوں۔ مگر حضورؐ نے فیصلہ فرمایا کہ کوئی اسلحہ ساتھ نہیں ہوگا۔ صرف تلواریں ہوں گی۔ وہ بھی میان میں رہیں گی۔ خود حضور علیہ الصلوات والتسلیمؐ نے تلوار بھی نہیں لی۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اُن کا مقصد عُمرہ اور صرف عُمرہ ہے۔

ہجرت کے بعد ہم پہلی بار مکّہ جا رہے تھے۔ مکّہ جہاں میرا سارا بچپن گزرا تھا۔ مجھے اکثر اس شدت سے یاد آتا تھا کہ اکثر میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ ایک بار میں نے مکّے کی یاد میں چند اشعار بھی کہے تھے:

"کاش میں ایک رات اُس میدان میں بسر کرتا جس میں میرے اردگرد اذخر و جلیل اُگی ہوئی ہوں۔ کیا وہ وقت کبھی پھر آئے گا کہ میں کوہ مجنہ کے چشموں سے سیراب ہوں۔ کیا میں اپنی زندگی میں کبھی پھر مکّے کی پہاڑیوں کے بالمقابل کھڑا ہوں گا"۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہم نئے نئے ہجرت کر کے مدینے آئے تھے۔ یہاں کا موسم غیر مانوس اور آب و ہوا ہمارے لئے بالکل مختلف تھی۔ میں اور عامر بن فہیرہؓ دونوں اُن ابتدائی دنوں میں ابو بکرؓ کے گھر میں رہتے تھے۔ عائشہؓ کی کچھ دنوں پہلے رخصتی ہوئی تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ مدینے میں موسمی بخار کی وبا پھیل گئی اور ہم تینوں اُس کی لپیٹ میں آگئے۔ بخار اتنا شدید تھا کہ ہم تینوں کئی کئی گھنٹے نیم بے ہوشی کے عالم میں رہتے تھے۔ ایک دن عائشہؓ

اپنے والد سے ملنے آئیں تو ہماری حالت دیکھ کر بہت پریشان ہوئیں۔ اُنھوں نے اپنے والد کو بیمار دیکھ کر اُن کا حال دریافت کیا تو ابو بکرؓ نے ایک شعر میں جواب دیا۔ عائشہؓ کم عمر تھیں۔ اُن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو عامرؓ سے رجوع کیا۔ اُن کا حال پوچھا تو اُنھوں نے بھی جواباً ایک شعر پڑھ دیا۔ اب تو عائشہؓ واقعی بہت پریشان ہو گئیں۔ میری حالت دونوں سے قدرے بہتر تھی۔ مگر اپنی بیماری کے عالم میں مجھے مکّہ بہت یاد آ رہا تھا۔ میں نے یہی شعر جو ابھی آپ کو سنائے ہیں اُن کو سُنائے تو وہ اس قدر گھبرا گئیں کہ اُلٹے قدموں واپس چلی گئیں اور حضورؐ کو جا کر کہا کہ تینوں کے تینوں پر پاگل پن کا اثر ہے۔ بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ دیوانگی طاری ہے۔ پھر اُنھوں نے اپنی یادداشت سے جو کچھ سُنا تھا حضورؐ کو سنایا تو حضورؐ نے مسکرا کر اللہ تعالیٰ سے دُعا فرمائی کہ مدینے کی آب و ہوا، پانی اور اناج کو سب مہاجرین کے لئے مکّے سے بھی زیادہ مفید اور موزوں بنا دے۔ اُن کی یہ دُعا قبول ہوئی اور مدینہ ہمیں ہر طرح سے راس آ گیا۔

آج ایک بار پھر مکّے کے درودیوار کا نقشہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ ایک ایک گلی ایسے جیسے سامنے نظر آ رہی ہو اور اُن میں گھرا ہوا اللہ کا گھر۔

پہلی منزل پر آرام کے بعد رسولِ اکرمؐ اور اُن کے ساتھ اکثر صحابہ نے احرام باندھ کر عمرے کی نیت کے دو دو نفل ادا کئے۔ سرورِ کائناتؐ نے اپنی قربانی کے اونٹ منگوانے کا حکم دیا۔ میں لپک کر ناجیہؓ کو بلا لایا۔ بنو اسلم سے تعلق رکھنے والے یہ صحابی قربانی کے اونٹوں کے نگراں تھے۔ حضورؐ نے اپنے اونٹ پر دائیں جانب نشان لگایا اور اسے ہار پہنائے۔ باقی لوگوں کو بھی تاکید کی کہ وہ بھی اپنے اونٹوں کو اسی طرح قربانی کے لئے تیار کریں۔ تیاری مکمل ہوتے ہی اُنھوں نے کوچ کا اعلان فرمایا اور لبیک اللّٰہم لبیک کا نعرہ بلند فرمایا۔ سب اس نعرے میں شریک ہو گئے اور کوہ و دمن اللہ کے حضور اس اعلانِ سپردگی کی بازگشت سے گونج اُٹھے۔ بہار کا موسم تھا۔ ہوا معتدل تھی۔ دُور دور تک پھیلی ہوئی جنگلی

جھاڑیوں پر چھوٹی چھوٹی ہلکے سبز رنگ کی پتیاں پُھوٹ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے زردی مائل بُھورے ریگستان نے کوئی گہنا پہن لیا ہے۔ ہوا چلتی تھی تو نوخیز پتّیاں یُوں جھلملا اُٹھتی تھیں کہ جیسے سارا صحرا کھلکھلا کر ہنس رہا ہو۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں کہیں کہیں جنگلی جانور بھی نظر آ جاتے تھے جو ہمیں دیکھتے ہی خوفزدہ ہو کر اِدھر اُدھر بھاگ جاتے تھے۔ ایک مقام پر ایک گور خر نظر آیا تو ابو قتادہؓ جو احرام میں نہیں تھے اس کے پیچھے روانہ ہو گئے اور رات گئے اسے شکار کر لائے۔ حضورؐ نے خود اور ان کی اجازت سے مُحرِم حضرات نے بھی اس کا گوشت کھایا۔ قافلے میں وہ تمام نو مسلم بھی شامل تھے جنھوں نے حال ہی میں اسلام قبول کیا تھا۔ حارثہ ابن سعید کے آٹھوں بیٹے میرے دوست تھے۔ ان میں سے دو سے مجھے بہت قرب حاصل تھا کیونکہ وہ اصحابِ صفّہ میں شامل تھے۔ خِراش بن اُمیہؓ خزاعی جو بنو مخزوم کے حلیف تھے، خُفافؓ اور اُن کے والد ایما بن رَحضہ الغفاریؓ۔ شریدؓ بن سوید ثقفیؓ بھی تھے جو چند روز قبل ہی اسلام لائے تھے اور زید بن خالد الجُھنیؓ بھی۔ یہ وہی زیدؓ تھے جن کے ہاتھ میں فتحِ مکّہ کے دن قبیلۂ جُہینیہ کا عَلَم تھا۔

روانگی سے قبل سرورِ دوعالمؐ نے قبیلۂ خُزاعہ کی شاخ کعب سے ایک شخص کو پیشگی روانہ فرمادیا تھا تاکہ وہ ہمیں قریش کے ردِ عمل سے مطلع کرتا رہے۔ جوں ہی ہمارا قافلہ عسفان پہنچا تو مُخبر نے بتایا کہ قریش سخت تذبذب کے عالم میں ہیں۔ متولّیانِ کعبہ کی حیثیت سے وہ کسی کو طوافِ کعبہ کی اجازت دینے سے انکار نہیں کر سکتے کہ یہی اُن کی فضیلت کا ایک بڑا جواز تھا اور دشمنانِ اسلام کی حیثیت سے وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ محمدؐ کثیر تعداد میں اپنے صحابہؓ کے ساتھ مکّے میں داخل ہوں اور عزّت و وقار سے عبادت کر کے واپس چلے جائیں۔ تمام عربستان میں چہ میگوئیاں شروع ہو جائیں گی۔ قریش کی رہی سہی ساکھ بھی ختم ہو جائے گی کہ اُن کا سب سے بڑا منہ بولا دشمن خود اُن کے شہر میں شان و شوکت سے داخل

ہو کر، اطمینان سے عبادات کر کے اُن کے سینے پر مونگ دلتا ہوا تزک و احتشام سے واپس چلا گیا۔ تمام صحرائے عرب میں قریشِ مکّہ کی ہوا اکھڑ جائے گی۔ انکار کریں تو ایک عظیم روایت کی قربانی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ تو صرف کعبے کے متولّی تھے اور کعبہ تمام عرب کی یکساں ملکیت تھا۔ اقرار کریں تو قریہ قریہ بدنام ہوتے ہیں۔ بیچ کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ پھر بھی اپنے چند حلیفوں کی رائے کے خلاف اُنھوں نے خالد بن ولید کو روانہ کر دیا کہ وہ مسلمانوں کا راستہ روکنے کی کوشش کریں۔ ہمیں بھی راستے میں یہ خبر مل گئی۔

حضورؐ نے یہ سنتے ہی مجھے حکم دیا کہ میں کسی ایسے شخص کو لاؤں جو قافلے کو کسی متبادل، غیر معروف راستے سے لے جائے۔ قافلے میں بنو اسلم نامی ایک شخص شامل تھا جو صحرائے عربستان کے اس حصّے کے چپّے چپّے سے واقف تھا۔ میں نے اُسے حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا اور وہ قافلے کو عام راستے سے ہٹا کر سمندر کی طرف لے گیا اور وہاں سے ایک نہایت دشوار گزار راستے سے چلتا ہوا حُدیبیہ کے درّے تک لے آیا۔ یہاں سے مکّہ ایک منزل بھی نہیں تھا۔ سب کا اصرار تھا کہ یہ فاصلہ بھی لگے ہاتھوں طے کر لیا جائے، مگر وہ درّہ ختم ہوتے ہی حضورؐ کی اونٹنی قصواء بیٹھ گئی۔ چاروں طرف سے اُسے اُٹھانے کے لئے "حَل حَل"، کا شور اُٹھتا رہا، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ آوازیں بلند ہوئیں کہ قصواء ضد کر رہی ہے لیکن رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ قصواء کسی اور کے حکم کی پابندی کر رہی ہے۔ ہم یہیں قیام کریں گے۔ چنانچہ حدیبیہ ہی میں خیمے نصب کر دیئے گئے۔ قصواء نے کسی اور کے حکم پر اس سے پہلے مدینے میں بھی ایک عظیم تاریخی فیصلہ کیا تھا جو ہم سب کو یاد تھا۔

خالد بن ولید جو مدینے سے آنے والے تمام جانے پہچانے راستوں پر ہماری تلاش میں بے نیل و مرام پھرتے پھراتے مکّے کے نواح میں آئے تو یکایک ہمارے قافلے کو مکّے سے اس قدر قریب دیکھ کر سخت پریشان ہو گئے اور اُنھوں نے فوراً مکّے جا کر قریش کو ہماری

آمد کی اطلاع دے دی۔ اب قریش کے پاس زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔

بنو خزاعہ جو کبھی خانۂ کعبہ کے کلید بردار تھے قریش کے حریفوں میں تھے اس لئے کہ بنو بکر جن سے اُن کی دشمنی تھی قریش کے حلیف بنے ہوئے تھے۔ بنی خزاعہ کے قبیلے بنو اسلم، بنو کعب اور بنو مصطلق پیغمبرِ اسلامؐ کو اچھا سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہ ابھی تک حلقۂ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ قریش کا اُن سے براہِ راست کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ لیکن وہ ان کو مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے۔ جس وقت قریش کو خالد بن ولید نے ہمارے حدیبیہ پہنچ جانے کی اطلاع دی اُس وقت بنو خزاعہ کا ایک سردار بدیل بن ورقا بھی وہیں مکّے میں موجود تھا۔ وہ یہ خبر سنتے ہی حدیبیہ روانہ ہو گیا۔ اُس نے سرورِ کائناتؐ کو بتایا کہ قریش قسمیں کھا کھا کر کہہ رہے ہیں کہ جب تک ہمارا ایک آدمی بھی زندہ ہے ہم محمدؐ اور اس کے ساتھیوں کو مکّے میں نہیں داخل ہونے دیں گے۔ یہ سُن کر نبیٔ رحمتؐ نے نہایت نرمی سے اُسے بتایا کہ وہ قریش کو مطلع کر دیں کہ ہمارا مقصد صرف عمرہ کرنا ہے۔ ہم اللہ کے گھر کا طواف کریں گے اور واپس مدینہ چلے جائیں گے۔ ہم کسی سے فساد نہیں کرنا چاہتے لیکن اگر کوئی ہمارا راستہ روکے گا تو اُس سے ہم جنگ کریں گے۔ یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا اگر قریش کو سوچنے کے لئے کچھ اور وقت درکار ہے تو ہم تیار ہیں۔ وہ جو احتیاطی تدابیر کرنا چاہتے ہیں کر لیں مگر اللہ کے گھر کا راستہ نہ روکیں۔

بدیل نے مکّہ جا کر رسول اللہؐ سے اپنی ملاقات کی تفصیل سے قریش کو آگاہ کیا اور مسلمانوں کے پُر امن مقاصد بھی بیان کئے مگر قریش کی کوئی تسلی نہیں ہوئی۔ بنو ثقیف کے عروہ نے پیشکش کی کہ وہ خود حدیبیہ جا کر ساری معلومات حاصل کر کے قریش کو مطلع کرے گا۔ میں قربانی کے اونٹوں کے پاس ناجیہؓ سے باتیں کر رہا تھا کہ عروہ کے آنے کی اطلاع ملی۔ میں فوراً لپک کر گیا اور عروہ سے اُس کے آنے کا مقصد پوچھا۔ اُس نے اپنا مقصد

بیان کیا تو میں اُسے حضورؐ کے خیمے میں لے گیا۔ مغیرہ بن شعبہؓ جو خیمے سے باہر ہی کھڑے تھے اور حضورؐ کے خدام میں شامل تھے ہمیں اندر لے گئے۔ میں نے عروہ کا تعارف کرایا اور چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ عروہ نے گفتگو شروع کی تو بدویانہ بے تکلفی میں باتیں کرتے کرتے حضورؐ کی ریشِ مبارک کو ہاتھ لگا دیا۔ میں آگے بڑھنے ہی کو تھا کہ مغیرہؓ نے اس کے ہاتھ پر اپنی تلوار کا چپٹا حصّہ مار کر کہا کہ وہ آئندہ یہ گستاخی نہ کرے۔ عروہ فوراً سنبھل کر بیٹھ گیا۔ مگر چند ہی لمحوں بعد اُس نے عادتاً دوبارہ جب کسی بات پر زور دینے کے لئے ریشِ مبارک کی طرف ہاتھ بڑھایا تو مغیرہؓ نے زور سے تلوار کا چپٹا حصّہ اس کے ہاتھ پر مار کر کہا اپنا ہاتھ دور رکھو ورنہ یہ ہاتھ ہی نہیں رہے گا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی نیت نیک تھی اور عروہ محض اپنی عادت سے مجبور تھا مگر ہمارے لئے یہ بے تکلفی حضورؐ کی شان میں گستاخی تھی جو ہماری برداشت سے باہر تھی۔ عروہ معاملہ فہم تھا، بات سمجھ گیا اور چند لمحوں بعد جب وہ حضورؐ سے گفتگو کر کے باہر نکلا تو اُس نے دوسرے خیموں میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے اُسے ساتھ لے جا کر سب اطراف کی سیر کرائی۔ وہ کئی گھنٹے ہمارے ساتھ رہا اور جب واپس گیا تو اُس نے قریش کو اپنے دورے کی سرگزشت سنائی۔ اُس نے اُنھیں بتایا کہ وہ قیصرو کسریٰ اور نجاشی کے درباروں میں بھی جا چکا ہے۔ لیکن جیسا احترام اُس نے محمدؐ کا دیکھا ہے اس کا عشرِ عشیر بھی اس نے کہیں نہیں دیکھا۔ اُن کے ماننے والے اُن پر نچھاور ہوئے جاتے ہیں۔ وہ وضو کرتے ہیں تو وضو کے پانی کے ایک ایک قطرے کے لئے ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے ہیں اور جس کے ہاتھ ایک بوند بھی آجاتی ہے وہ اُسے خیر و برکت کے لئے اپنے جسم پر ملتا ہے۔ میرا خیال ہے محمدؐ کی تجویز مناسب ہے اور ہمیں تسلیم کر لینی چاہئے۔

اِدھر سرورِ کائناتؐ نے بھی بنو کعب کے خِراشؓ کو اپنا سفیر بنا کر قریش کی جانب

روانہ کر دیا۔ عکرمہ بن ابو جہل نے اس کی بات سننے سے پہلے ہی اس کے اونٹ کو باندھ کر اسے گرفتار کر لیا مگر بعد میں لوگوں کے کہنے سننے پر اُسے رہا کر دیا۔ خراشؓ نے واپس آکر حضورؐ کو عرض کی کہ میں ایک بے وزن آدمی ہوں۔ آپؐ کسی ایسے شخص کو بھیجئے جس کا مکے میں کوئی حلیف ہو۔ چنانچہ پہلے حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو تجویز فرمایا اور پھر عمرؓ کے کہنے پر حضرت عثمانؓ کا نام تجویز ہوا، کیونکہ اُن کے قبیلے کے کئی عزیز مکے میں رہتے تھے۔ عثمانؓ مکے پہنچے تو قریش نے اُنھیں تمام مسلمانوں کو مکے آنے کی اجازت تو نہیں دی البتہ انھیں کہا کہ وہ خود خانۂ کعبہ کا طواف کر لیں۔ مگر عثمانؓ نے یہ پیشکش قبول نہیں کی۔ ابن ابیؓ کو بھی قریش اپنا ہم خیال ہی سمجھتے تھے۔ اُنھیں بھی قریش نے طواف کی پیش کش کی مگر اُنھوں نے جواباً کہا کہ جب تک اللہ کا رسولؐ طواف نہیں کر لیتا، میں طواف نہیں کر سکتا۔ حضورؐ کو یہ بات معلوم ہوئی تو اُنھوں نے خوشی کا اظہار فرمایا۔

فتحِ مبین

عثمانؓ کو قریش سے گفت و شنید میں توقع سے زیادہ وقت لگ گیا۔ ہم سب پریشان تھے۔ اُن کی طرف سے کوئی خبر نہیں آرہی تھی۔ اسی پریشانی کے عالم میں افواہ پھیل گئی کہ عثمانؓ کو قریش نے شہید کر دیا ہے۔ اب اضطراب حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ ہر چہرہ پژمردہ، ہر پیشانی پر فکر کے آثار۔ چھوٹے چھوٹے حلقوں میں لوگ اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس معاملے پر گفتگو کرتے نظر آتے تھے۔ قریش نے اپنی دشمنی میں ماہ ذی قعد کی حرمت کا پاس بھی نہیں کیا۔ سب نے اپنی تلواروں کے قبضوں پر ہاتھ رکھ کر خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کا اعلان کیا۔ آنحضرتؐ نے بھی فرمایا کہ میں انتقام لئے بغیر یہاں سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ اسی اثنا میں آنحضرتؐ پر وحی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ وہ ایک کیکر کے درخت سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے اور بیعتِ جہاد کی دعوت فرمائی۔ یہ وہی بیعت ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں ہوا ہے۔

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ

(اے پیغمبرؐ) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے اللہ
اُن سے خوش ہوا۔ (۴۸۔۱۸)

سب نے عہد کیا کہ مر جائیں گے مگر میدان سے نہیں ہٹیں گے۔ سب سے پہلے بیعتِ رضوان کی سعادت عکاشہ بن مُحصِن کے بڑے بھائی ابو سنان بن محصنؓ کے حصے میں آئی۔ یہ عکاشہ سے بیس برس بڑے تھے۔ ان کا نام وہب تھا۔ اس کے بعد تو تانتا بندھ گیا۔ سب حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تو رسول اللہؐ نے اپنا دستِ راست اپنے ہی بائیں ہاتھ پر رکھ کر فرمایا کہ یہ عثمانؓ کا ہاتھ ہے۔ صرف ایک منافق جدؔ ابن قیس ایک اونٹ کے پیچھے چھپا رہا اور اس بدبخت نے بیعت نہیں کی۔

بیعت کا سلسلہ ختم ہوتے ہی سب نے تلواریں میان سے نکال لیں۔ ہمیں اب یقین تھا کہ مقابلہ ہو کر رہے گا اور یہ بھی کہ فتح انشاء اللہ ہماری ہو گی یا جامِ شہادت نصیب ہو گا جس سے روح میں ایک فرحت و شادمانی کا احساس تھا۔

اتنے میں عثمانؓ کی خیریت کی اطلاع آ گئی۔ کہنے کو تو حدیبیہ کے ایک نوخیز ہلکے سبز رنگ کی پتیوں سے بھرے ہوئے درخت کے نیچے پیش آنے والا یہ ایک چھوٹا سا واقعہ تھا مگر اس کی بازگشت رہتی دُنیا تک سنائی دیتی رہے گی۔ اطاعت، یقین، حوصلہ مندی، جراُتِ کردار، تسلیم و رضا، استقامت، قربانی اور بے مثل فداکاری کے ملے جلے جذبات کا یہ وہ اظہار تھا جس سے آج تک روح میں ایک گونہ سرور ہے۔ عثمانؓ واپس تشریف لائے تو اُنھوں نے بتایا کہ قریش کو آپ کے اصل مقصد کا علم ہو گیا ہے۔ وہ اقرار بھی کرتے ہیں کہ اُنھیں حرمت والے مہینوں میں کسی کو حج و عمرہ سے روکنے کا حق نہیں ہے لیکن وہ صرف اس بار اجازت دینے سے قاصر ہیں۔

پھر اہلِ مکہ نے سہیل بن عمرو کو بھیجا جو قریش کے آخری قاصد تھے۔ سہیل بن عمرو نے معاہدہ کی جو شرائط پیش کیں وہ ہم سب کو یک طرفہ محسوس ہوئیں، لیکن جب آنحضرتؐ نے اُنھیں قبول فرما لیا تو کسی کو معترض ہونے کی گنجائش نہ رہی۔ معاہدے کے متن پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی بجائے سہیل کے کہنے پر باسِمکَ اَللّٰھُمَّ لکھا گیا۔ محمد رسول اللہؐ کی بجائے سہیل کے اصرار پر محمدؐ ابن عبداللہ تحریر ہوا۔ ایک شرط یہ تھی کہ اگر قریش کا کوئی فرد مسلمان ہو کر آئے تو محمدؐ اُسے واپس کر دیں گے لیکن اگر کوئی مسلمان مرتد ہو کر قریش کے پاس پہنچ جائے تو اُسے واپس نہیں کیا جائے گا۔ میں سوچتا ہوں کتنی بدگمانی تھی قریش کو اپنے لوگوں کے بارے میں اور کتنا اعتماد تھا پیغمبرِ آخر الزماںؐ کو اپنے دین کی تعلیم اور تربیت پر کہ اُنھیں کسی مسلمان کے کفارِ قریش سے جا ملنے کا ہلکا سا شائبہ بھی نہیں تھا۔ قریش کو البتہ تشویش تھی کہ مکے کی سرداری اور استحصالی نظام کے مقابلے میں مدنی معاشرے کا انسانی حقوق کی بحالی اور مساوات پر قائم نظام انتہائی پرکشش ہے جو کسی وقت بھی اُن کے لئے شدید خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔ گویا قریش کی یہ شرط مدنی نظام کی افضلیت کا ایک خاموش اعتراف تھا۔ باقی شرائط بھی بظاہر یک طرفہ تھیں۔ مگر حضورؐ نے نہایت خندہ پیشانی سے قبول فرما لیں۔ چند مسلمانوں، خصوصاً عمرؓ نے اپنی پریشانی کا اظہار بھی کیا۔ یہ اس لئے کہ رحمتِ عالمؐ کی تعلیمات نے ذہنوں کو جکڑا نہیں تھا۔ غور و فکر کی اجازت ہی نہیں، ہمت افزائی کی جاتی تھی۔ ہر شخص اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتا تھا اور شخصی رائے کے آزادانہ اظہار کے بعد آخری فیصلہ اللہ کے رسولؐ کا ہوتا تھا۔ ان شرائط پر اُنھوں نے فیصلہ فرما دیا تو یہ تلخ گھونٹ سب نے حلق سے اُتار لیا۔

شرائط طے ہو گئیں تو معاہدے پر دستخطوں کی تیاری شروع ہو گئی۔ حضورؐ دائیں بائیں نظریں دوڑا رہے تھے کہ توثیق کے لئے کس کس کو بلائیں۔ اتنے میں باہر سے بڑی دردناک

چیخوں کی آواز سنائی دی۔ سب خیموں سے باہر نکل آئے۔ دیکھا تو سامنے ایک انتہائی دل دوز منظر تھا۔ ابو جندلؓ، سہیل بن عمرو کے چھوٹے بیٹے، چلا چلا کر مدد کے لئے پکار رہے تھے۔ اُن کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ پاؤں میں بھاری بھاری بیڑیاں، چلتے تھے تو اُن کی جھنکار سُنائی دیتی تھی۔ اُن کے ساتھ ہمارے ساتھیوں کا ہجوم تھا۔ ہر ایک دم بخود، مبہوت، کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ سہیل کے بڑے بیٹے عبداللہ بن سہیلؓ، اللہ کے فضل سے پہلے ہی حلقۂ اسلام میں آچکے تھے اور اس وقت ہم لوگوں میں شامل تھے۔ اپنے چھوٹے بھائی کی حالتِ زار دیکھ کر ان سے رہا نہ گیا۔ بے ساختہ اُنھیں سنبھالنے کے لئے لپک کر آگے بڑھے۔ اتنے میں سہیل بن عمرو بھی خیمے سے باہر آچکا تھا۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک ہاتھ سے عبداللہؓ کو دھکا دے کر پرے کیا اور ابو جندلؓ کی زنجیر کو، جو اُن کے گلے سے لٹک رہی تھی، پکڑ کر اس زور سے کھینچا کہ وہ زمین پر آرہے۔ پھر اُسی زنجیر کے سرے کو گھما کر اس بے دردی سے اُن کے منہ پر مارا کہ شدّتِ ضرب سے اُن کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ ساتھ ہی سہیل نے مڑ کر رسول اللہ ﷺ کی سمت دیکھا اور کہا کہ محمد ہمارا معاہدہ ابو جندل کے آنے سے قبل طے ہو چکا تھا۔ اُس کی رُو سے اب آپ لوگوں کو اسے میرے حوالے کرنا ہو گا۔

ہوا یہ تھا کہ ابو جندلؓ چند روز قبل اسلام لے آئے تھے۔ سہیل بن عمرو، جو اپنے بڑے بیٹے کے مسلمان ہونے کا غم بھی نہیں بھلا پایا تھا، ابو جندلؓ کے اسلام لانے کی خبر سن کر اتنا سیخ پا ہوا کہ اُس نے اُنھیں زنجیروں میں جکڑوا کر مکّے کے کسی تہ خانے میں قید کر رکھا تھا جہاں سے وہ کسی طرح زنجیریں توڑ کر آزاد ہو گئے اور سیدھا ہمارے خیموں کا رُخ کیا۔ یہاں اُن کے ساتھ یہ ماجرا ہوا۔

رسول کریم ﷺ نے، کہ صادق و عادل تھے، سہیل کی بات سُن کر ایک لمحے کے توقف کے بغیر اعلان فرما دیا کہ ہاں واقعی ابو جندلؓ سہیل کے ساتھ جائیں گے۔ ابو جندلؓ جو انتہائی

بے چارگی کی حالت میں حضورؐ کے فیصلے کے منتظر تھے ایک بار پھر زور زور سے دہائی دینے لگے۔ جو کچھ اُنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی زبانی سُنا اُن کی فہم سے بالا تھا مگر حضورؐ نے آگے بڑھ کر اُن کے شانے پر ہاتھ رکھا، اُنھیں دلاسا دیا، صبر کی تلقین فرمائی اور کہا کہ وہ جو قادر و مختار ہے یقیناً اُن کے لئے کوئی سبیل پیدا کرے گا۔

رسالت مآبؐ کے یہ مختصر کلمات بارگاہِ الٰہی میں جس طرح مُستجاب ہوئے، یہ ایک الگ داستان ہے۔ کبھی موقع ملا تو عرض کروں گا کہ حدیبیہ کے اسی مظلوم ابو جندلؓ نے اپنے ایک ہم خیال ابو بصیر کے ساتھ مل کر' معاہدے کی شرائط کے اندر رہتے ہوئے، مکّے کے بر خود غلط اور بہ زعمِ خویش بہت ذی عقل اور ہوشیار قریش کو ایسے ایسے ناکوں چنے چبوائے کہ اُن کی عائد کردہ احمقانہ شق اُن کے گلے کا ہار بن کر رہ گئی اور اُنھوں نے خود حضورؐ سے درخواست کی کہ وہ اُنھیں مدینے بُلا کر اپنے پاس رکھیں۔ نہ ہُبل اور لات کی منت سماجت اُن کے کام آئی نہ اُن کی اپنی کوئی تدبیر۔

ابو جندلؓ کے بارے میں حضورؐ کے فیصلے کے بعد سب لوگ پھر خیموں میں آگئے۔ معاہدہ سامنے رکھا گیا اور حضورؐ نے مسلمانوں کی طرف سے ابو بکرؓ، عمرؓ، علیؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور محمد بن مَسْلَمہؓ کے دستخط کروائے۔ ان کے علاوہ آپ نے سہیل کے بیٹے عبداللہ بن سہیلؓ سے بھی معاہدے کی توثیق کروائی۔ اس سارے عرصے میں حضورؐ ایک سمت کھڑے رہے۔ جو جو دستخط کرتا جاتا تھا، حضورؐ کے پاس آ کر کھڑا ہوتا جاتا تھا۔

اس تمام عرصے میں مَیں خیمے کے مدخل پر کھڑا سوچ میں گم تھا۔ خیمے کا پردہ اُٹھا ہُوا تھا اور سامنے کچھ فاصلے پر مجھے وہ کیکر کا درخت نظر آرہا تھا جس کے نیچے بیعتِ رضوان ہوئی تھی۔ درخت کی چھدری شاخوں کے پیچھے سورج نصف النہار سے نیچے آچکا تھا اور اس کی اُفقی روشنی میں درخت کی نو خیز، نازک پتیوں کے کنارے زردی مائل نظر آرہے تھے جیسے ہر پتّی

پر سونے کی باریک سی جھالر لگی ہوئی ہو۔ درخت کی شاخیں ہلکی ہلکی ہوا میں ہلکورے لیتیں تو پتیاں یوں لرزتیں کہ سارا درخت جھلملا اُٹھتا۔ کبھی میں خیمے کے اندر دیکھتا تھا کبھی باہر۔ مجھے کوئی اندر سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ بلال دیکھ تیری آنکھوں کے سامنے تاریخ عالم کا ایک عظیم باب رقم ہو رہا ہے۔ گواہ رہنا کہ مسلمانوں نے کس جذبۂ ایمانی سے اپنے ہادیٔ برحق کی رضا کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا۔

کیکر کی یہ باریک باریک پتیاں رُت بدلتے ہی پیوندِ خاک ہو جائیں گی۔ یہ درخت بھی نہیں رہے گا اور بلال تُو بھی نہیں لیکن جو کچھ اس درخت اور اس کی پتیوں نے دیکھا اور بلال جو کچھ تو نے دیکھا اور دیکھ رہا ہے وہ تاریخ کے ماتھے کا جھومر بن کر ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔

معاہدہ ضبطِ تحریر میں آگیا۔ سہیل بن عمرو اور ابو جندلؓ واپس چلے گئے تو رسالت مآبؐ نے قربانی کے لئے سب سے پہلے اپنا اونٹ منگوا کر ذبح فرمایا اور خراشؓ کو بلوا کر اپنے سر کا حلق کرایا۔ پھر کیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے سب نے اپنے اپنے قربانی کے جانور ذبح کر دئے کسی نے حلق کروایا، کسی نے محض قینچی سے بال ترشوائے۔ تھوڑی ہی دیر میں چاروں طرف بال ہی بال بکھر گئے۔ سرورِ عالمؐ نے زمین سے اپنے بالوں کی لٹیں اُٹھائیں اور پاس اُگی ہوئی ایک خودرو جھاڑی پر پھینک دیں جس پر چھوٹے چھوٹے پھول کھل رہے تھے۔ یہ دیکھتے ہی سب اُس جھاڑی پر ٹوٹ پڑے اور ہر شخص نے تبرک کے طور پر جتنے بال ہاتھ لگے سمیٹ لئے۔ نُسیبہ بنتِ کعبؓ بھی اس دوڑ میں شریک تھیں۔ وہ بھی مردوں کے شانہ بشانہ آگے بڑھیں اور موئے مبارک کی ایک لٹ اُٹھالی جو مرتے دم تک اُن کے پاس رہی۔ یہ تگ و دو جاری تھی کہ ہوا کا ایک نہایت تیز جھونکا آیا اور چاروں طرف بکھرے ہوئے بالوں کو ایک آن میں اُڑا کر مکّے کی طرف حدودِ حرم میں لے گیا۔ یہ بشارت تھی ہمارے سفرِ عمرہ کی قبولیت کی۔

حدیبیہ سے واپسی پر مدینے کے راستے میں سورہ فتح نازل ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ نے صلح حدیبیہ کو فتحِ مبین قرار دیا انا فتحنالك فتحًا مّبين۔ جیسے ہی یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہؐ کی مسرّت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُنھوں نے فوراً گھڑ سواروں کو بھیج کر اپنے جلیل القدر صحابہؓ کو اپنے پاس بلوایا اور اُنھیں یہ آیاتِ مقدسہ سنائیں۔ ان کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اللہ کی کائنات میں مجھے اس سورۃ سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں ہے۔ صلحِ حدیبیہ بے شک فتحِ مبین ہی تھی۔ آنے والے وقت میں ثابت ہو گیا کہ صلحِ حدیبیہ کی سیاسی حکمت اور دُور اندیشی کس طرح ہماری تاریخ پر اثر انداز ہوئی۔ اس سے پہلے قریش حضورؐ کو محض ایک سرکش ناقابلِ اعتنا باغی سمجھتے تھے۔ اب اُنھیں مجبوراً اُنہیں اپنا مدِمقابل اور برابر کا حریف تسلیم کرنا پڑا اور ساتھ ہی ساتھ مدینے کی نوزائیدہ مملکتِ اسلامیہ کو بھی۔ مسلمانوں کا حقِ زیارتِ کعبہ تسلیم کرنے کا یہ مطلب تھا کہ اسلام بھی دوسرے مذاہب کی طرح ایک مسلمہ مذہب ہے۔ دس سال تک لڑائی بند رکھنا طے پایا تو جنوب سے خطرہ ٹل گیا اور بھرپور تبلیغ کا موقعہ ملا۔ مختصراً صلحِ حدیبیہ تاریخِ اسلام کا ایک ایسا موڑ ہے جہاں سے ہماری تاریخ کا دورِ اوّل ختم ہوا اور ایک نئے درخشاں مستقبل کا آغاز ہوا۔ یہ چھٹی ہجری کے موسمِ بہار کا وہ تحفہ تھا جس کے بعد ہم نے کبھی خزاں نہیں دیکھی۔

جانبِ منزل

دس ہزار کا لشکر، عرب کی تاریخ کا ایک عظیم الشان فوجی اجتماع، پیدل، گھڑ سوار، ہر شخص سر سے پاؤں تک کیل کانٹے سے لیس، سازوسامان سے لدے ہوئے سینکڑوں اونٹ، عربستان کے بے شمار قبائل کے دستے جو مدینے سے آتے ہوئے راستے میں ہمارے ساتھ شامل ہوتے گئے، ہر سپاہی کا دل نورِ ایمان سے منور، جذبۂ جہاد سے سرشار۔ یہ کاروان جب مَرُّالظّہران پہنچا تو حضورؐ نے پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا۔

مُرُّالظُّہران سے مکہ ایک منزل یعنی چند گھنٹوں کی مسافت پر ہے۔ یہاں سے ہوازن کے قبیلوں کو بھی راستہ جاتا تھا۔ نجد کے جنوبی حصے میں پہاڑیوں پر آباد لات کے پجاریوں کا یہ قبیلہ اسلام دشمنی میں قریشِ مکہ سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ ایک اور راستہ یہاں سے طائف کی طرف نکلتا تھا جو لات کے مندر کے محافظوں کا نہایت سرسبز و شاداب شہر تھا مگر ہماری منزل کیا تھی، کسی کو علم نہیں تھا۔ اللہ جانتا تھا یا اُس کا رسولؐ ۔ حضورؐ نے ابھی تک اپنا

عندیہ کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد حضورؐ کے حکم کے مطابق ہر شخص نے اپنا الگ الاؤ جلا رکھا تھا۔ گویا مَرّالظّہران کی پہاڑیوں پر اُس شام دس ہزار الاؤ روشن تھے۔ عشا کے بعد لوگ الاؤوں کے گرد بیٹھ گئے اور قیاس آرائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا کہ منزل کون سی ہے۔ مکہّ، طائف یا ہوازن۔ میرے پاس بیٹھے ابوذرؓ نے کہا:

"میرے خیال میں ہم مکےّ جا رہے ہیں"۔

یہیں سے بات چل پڑی۔ ہر ایک نے اپنا خیال ظاہر کیا:

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ قریش سے ہمارا جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہے"۔

"مگر بنو کعب پر حملے کے بعد اب کیا رہ گیا حدیبیہ کے معاہدے میں"۔

"سوچنے کی بات ہے کہ کعبے کی پناہ میں آجانے کے باوجود بنو کعب پر حملہ ہوا"۔

"میرا تو خیال ہے ہمارا رُخ ہوازن کی طرف ہے۔ یہی راستہ جاتا ہے اُن کے علاقے کو"۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ ہوازن نے ہمیں بہت نقصان پہنچائے ہیں"۔

"شاید اُن کی سرکوبی کا فیصلہ ہو گیا ہے"۔

"ہوازن ہمارے سخت دشمن ہیں مگر حال میں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی کہ اُن سے جنگ چھیڑی جائے"۔

"ہو سکتا ہے ہمارا ارادہ طائف فتح کرنے کا ہو"۔

"طائف میں نبیِ کریمؐ پر بڑی سختیاں ہوئی ہیں، اُن کا حساب چکانا ضروری ہے"۔

"حضورؐ نے کبھی کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا"۔

"لیکن طائف میں لات کا مندر کفر کا بہت بڑا مرکز ہے۔ شاید اُسے ختم کرنے کا ارادہ ہو"۔

"سب سے زیادہ کفر تو اِس وقت مکےّ میں ہے۔ لات تو صرف ایک بُت ہے مکہّ تو بتوں سے بھرا پڑا ہے"۔

"ہو سکتا ہے رسول اللہؐ کا یہ ارادہ ہو کہ شمالی حجاز کے سب سے خوب صورت باغوں والے شہر یثرب پر قابض ہونے کے بعد اب مشرقی حجاز کے باغات کا سب سے خوب صورت شہر حاصل کیا جائے"۔

"میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ ہم قریشِ مکہّ سے لڑنے جا رہے ہیں۔ اُن سے بڑا کون ہو گا دشمن ہمارا۔ ہمارا اصل جھگڑا ہے ہی اُن سے"۔

کعب بن مالکؓ میرے سامنے بیٹھے خاموشی سے سب کی باتیں سُن رہے تھے۔ یکایک وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے:

"میں ابھی پتہ کر کے آتا ہوں"

دو تین نے یک زباں ہو کر کہا:

"کس سے۔ کسی کو معلوم نہیں"۔

کعبؓ بولے:

"میں نبیِ کریمؐ سے پوچھ کر آتا ہوں"۔

یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور ہم لوگ اُن کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد کعبؓ لوٹے تو کہنے لگے:

"جب آپ لوگ اپنی اپنی قیاس آرائیاں کر رہے تھے، میں شعر کہہ رہا تھا۔ سنئے

تلواریں میان سے نکل پڑی ہیں
اور شمشیر زن اُن سے پوچھ رہے ہیں
کہ اُن کی تیز دھاریں کس کے لئے ہیں

اگر تلواروں کی بھی زبان ہوتی

تو وہ بھی یہی سوال کرتیں

کہ بتاؤ ہمارا دشمن کون ہے؟

یہ شعر میں نے حضورؐ کو سنائے۔ میرا خیال تھا وہ سُن کر ضرور کوئی جواب دیں گے مگر وہ صرف مسکرادیئے۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔"

یہ تدبیر بھی نہ چلی تو گفتگو کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا پھر وہیں سے شروع ہو گیا:

"طائف کے بارے میں تو یہ خبر ہے کہ بنو ثقیف نے ہوازن کے دیگر حلیف قبیلوں سے مدد بھی مانگ لی ہے بلکہ کئی شاخوں کے لوگ اُن کے دفاع کے لئے طائف پہنچ بھی گئے ہیں"۔

"سُنا ہے بنو ثقیف نے شہر کے شمال میں ایک پہاڑی پر مورچہ قائم کیا ہے جہاں سے وہ دُور دُور تک دیکھ سکتے ہیں"۔

"مگر طائف سے جنگ کرنے کی بھی کوئی فوری وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ہمارا اصل جھگڑا تو......"

ابوذرؓ باتیں کرتے کرتے رک گئے، اُن کی آنکھیں حیرت زدہ ہو گئیں۔ میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو سامنے ابوسفیان کھڑا تھا۔ ہر شخص ہکا بکا ہو گیا۔ اتنی رات گئے ابوسفیان ہمارے خیموں میں۔ وہی رکھ رکھاؤ، وہی پہلا سا وقار، وہی طمطراق۔ غور سے دیکھا تو اُس سے چند قدم کے فاصلے پر حضورؐ کے چچا عباسؓ تھے اور اُن کے ساتھ حکیم بن حزام جنھوں نے بدر کی لڑائی رکوانے کی بڑی کوشش کی تھی مگر ابوجہل نے اُن کی ایک نہ چلنے دی تھی۔ حکیم کے ساتھ بنو خزاعہ کے بدیل بن ورقہ تھے جنھوں نے حدیبیہ میں حضورؐ کو خبر دی تھی کہ قریش کسی قیمت پر مسلمانوں کو مکے میں داخل ہونے کی اجازت دینے کے لئے تیار نہیں

ہیں۔

ابوسفیان اب اطراف کی پہاڑیوں کو دیکھ رہا تھا جہاں دُور دُور تک الاؤ روشن تھے۔ معلوم ہوتا تھا آسمان سے ستارے اتر آئے ہیں۔ ابوسفیان نے یہ منظر دیکھ کر قدرے حیرت سے کہا:

"محمدؐ کی سلطنت بہت پھیل گئی ہے"۔

مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں بول اٹھا:

"محمدؐ سلطان نہیں رسول ہیں"۔

ابوسفیان نے کچھ جواب نہیں دیا۔ کچھ سوچتے سوچتے اثبات میں گردن ہلادی اور مجھے پہچان کر کہا:

"یہ تم ہو بلال!"

اور بغیر میرے جواب کا انتظار کئے باہر روشنیوں کو دیکھنے لگا۔

میں فوراً سب کو وہیں چھوڑ کر سیدھا حضورؐ کے خیمے میں پہنچا۔ عمرؓ ان کے پاس بیٹھے تھے اور شاید پہلے ہی انہیں ابوسفیان کی آمد کی اطلاع دے چکے تھے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ ابوسفیان آیا ہے، عباسؓ کے ساتھ تو انہوں نے نہایت اطمینان سے فرمایا:

"اللہ کی طرف سے ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے"۔

اتنے میں عباسؓ خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوئے۔ اُن کے پیچھے ابوسفیان، پھر حکیم اور سب سے آخر میں بدیل۔

ابوسفیان چند روز پہلے مدینے بھی آیا تھا۔ بنو کعب کے خلاف قریش کی زیادتی کے بعد حدیبیہ کے معاہدے کی دوبارہ توثیق کے لئے مگر وہاں اُس کی کوئی پذیرائی نہیں ہوئی تھی۔ حضورؐ نے سب کو چٹائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ابوسفیان نے بیٹھتے ہی کہا:

"محمدؐ آپ نے تو پتہ نہیں کہاں کہاں کے لوگ اکٹھے کر لئے ہیں۔ اتنی بڑی فوج اپنے ہی اعزہ کے خلاف نامناسب......

حضورؐ کو میں نے کبھی کسی کی بات کاٹتے نہیں دیکھا تھا مگر اُس وقت انھوں نے ابوسفیان کا قطع کلام کرتے ہوئے فرمایا:

"زیادتی آپ لوگوں کی طرف سے ہوئی ہے۔ آپ نے حدیبیہ کا معاہدہ توڑا ہے۔ بنو کعب کے خلاف حملے میں آپ نے بنوبکر کا ساتھ دیا اور خانۂ کعبہ کی حدود کی بھی بے حرمتی کی"۔

ابوسفیان نے موضوع بدلنے کی کوشش کی:

"کاش! آپ کے غصے کا رُخ ہوازن کی طرف ہوتا جو آپ کے سب سے بڑے دشمن ہیں اور اُن سے آپ کی عزیزداری بھی دُور کی ہے"۔

رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا:

"مکے کی فتح کے بعد اگر اللہ نے چاہا تو وہ اہلِ اسلام کو اُن پر بھی اقتدار دلادے گا"۔

مکے کا نام سُن کر میرے کان کھڑے ہوگئے۔ تو گویا یہ تھی ہماری منزل اور ہم جانے کیا کیا سوچتے رہے۔ یہ کہہ کر حضورؐ نے تینوں مہمانوں سے کہا کہ وہ اللہ کی وحدت اور اُن کی رسالت کی شہادت دیں۔ حکیمؓ اور بدیلؓ نے فوراً کلمہ پڑھ دیا۔

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ،

مگر ابوسفیان نے صرف اتنا کہا:

"**لا الہ الا اللہ،**"

اور چُپ ہوگیا۔ جب اُسے رسالت کی شہادت کے لئے کہا گیا تو اُس نے چٹائی پر

نظریں گاڑلیں اور چٹائی ہی کی طرف دیکھتے دیکھتے بولا:

"محمدؐ میرے دل میں اب بھی شک ہے، مجھے کچھ وقت چاہئے"۔

ابوسفیان کے جواب میں عمرؓ کچھ کہنا چاہ رہے تھے مگر حضورؐ نے انہیں اشارے سے خاموش کرادیا اور عباسؓ سے کہا کہ وہ اپنے خیمے میں مہمانوں کے رات ٹھہرنے کا انتظام کریں۔

ابوسُفیان

اگلے دن جب علی الصبح میں نے فجر کی اذان دی تو پہاڑوں کے سناٹے میں میری آواز میری توقع سے زیادہ گونجی۔ دیکھتے دیکھتے سب خیموں سے باہر نکل آئے۔ ہر شخص وضو کے لئے دوڑ پڑا۔ سارا لشکر جاگ اُٹھا۔ ابوسفیان بھی ہڑبڑا کر اٹھا اور آنکھیں ملتا ہوا عباسؓ سے پوچھنے لگا:

"کیا ہو گیا ہے، کیا ماجرا ہے؟

"عباسؓ نے اُسے بتایا: "نماز کا وقت ہے"۔

"ابوسفیان نے پوچھا: "کتنی مرتبہ ہوتی ہے یہ نماز؟"

عباسؓ نے کہا: "دن رات میں پانچ مرتبہ"۔

"ابوسفیان نے حیرت سے کہا: "پانچ مرتبہ تو بہت زیادہ ہے"۔

یہ کہہ کہ ابوسفیان خیمے سے باہر آ گیا۔ باہر آ کر اُس نے دیکھا کہ فدائیانِ اسلام کس

طرح نبیِ کریمؐ کے گرد پروانہ وار جمع ہیں۔ ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے ہیں، اس کوشش میں کہ حضورؐ کے وضو کے پانی کی ایک چھینٹ اُن پر پڑ جائے۔ اُن کے وضو سے بچے ہوئے پانی کا ایک قطرہ انہیں میسّر آجائے۔ ابوسفیان یہ دیکھ مبہوت ہوگیا۔ کہنے لگا:

"ابوالفضل میں نے آج تک ایسی عقیدت کہیں نہیں دیکھی"۔

عباسؓ نے جواب میں صرف اتنا کہا:

"ابوسفیان اب تمہیں کس کا انتظار ہے۔ تم بھی رسالت کی شہادت دو"۔

ابوسفیان نے بہت دھیمے لہجے میں کہا:

"مجھے اُن کے پاس لے چلو"۔

فجر کی نماز کے بعد عباسؓ، ابوسفیان کو لے کر رسولِ کریمؐ کی خدمت میں پہنچے جہاں ابوسفیان نے اُن کی رسالت کی شہادت دی اور پورا کلمہ پڑھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوگیا۔ حضورؐ نے ابوسفیانؓ کو گلے لگایا اور مبارک باد دی۔ میں نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور رسولِ کریمؐ کے الفاظ دہرائے:

"اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ ایمان بندے کی اپنی صفت نہیں، اللہ کا عطیہ ہے"۔

"ابوسفیانؓ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا:

"ارے حبشی، تُو تو بڑا معلم بن گیا ہے"۔

یہ لقب مجھے موقع بے موقع کئی بار ملا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہمیں کوچ کا حکم ملا۔ مکے کی طرف، جو ہمارے سفرِ شوق کی آخری منزل تھا۔ مرالظہران سے مکہ!

فتحِ مکہ

مرالظہران سے دوڈھائی گھنٹے کی مسافت طے کر کے ہم ذوطویٰ پہنچے۔ وہاں حضورؐ نے لشکر کو رکنے کا حکم دیا۔ ذوطویٰ مکے سے اتنا قریب ہے کہ وہاں سے مکے کا شہر نظر آتا ہے۔ قصواء پر بیٹھے بیٹھے حضورؐ نے فوج کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ میمنہ کی قیادت خالد بن ولیدؓ کو دی اور میسرہ کی زبیر بن العوامؓ کو۔ خالدؓ کے ساتھ بنو سُلیم کا رسالہ تھا اور زبیرؓ کے دستے میں پانچ سو مہاجر اور کچھ دیگر لوگ تھے۔ اُس دن زبیرؓ نے پیلے رنگ کا عمامہ باندھ رکھا تھا۔ فوج کا تیسرا حصہ، جس میں حضورؐ خود تھے، صرف مہاجرین اور انصار پر مشتمل تھا۔ اس کا ہر سپاہی پوری طرح مسلّح، سر سے پاؤں تک فولاد سے ڈھکا ہوا تھا۔ صرف اُن کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ مرالظہران سے روانگی کے وقت حضورؐ نے اپنے دستے کا پرچم سعد بن عبادہؓ کو دیا تھا۔ میمنہ میسرہ مقرر کرنے کے بعد انہوں نے اپنے دستے کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک کا پرچم سعدؓ کے بیٹے قیسؓ کے حوالے کیا اور دوسرے کا جس میں وہ خود تھے، ابو عبیدہؓ کو

عطا فرمایا۔ جب حضورؐ یہ احکام دے رہے تھے، ابو بکرؓ اور اُسید بن حضیرؓ ان کے آگے پیچھے تھے اور عثمانؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ دائیں بائیں۔ لشکر کو چار حصّوں میں تقسیم کرنے کے بعد حضورؐ نے حکم دیا کہ خالدؓ شہر کے زیریں حصےّ سے اور باقی تین دستے مکےّ کے تین درّوں سے الگ الگ لیکن بہ یک وقت شہر میں داخل ہوں گے۔

میں خادمِ رسول، حضورؐ کے دستے میں شامل تھا۔ انہوں نے اپنے خود پر سیاہ عمامہ باندھا ہوا تھا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی چند قدم بعد حضورؐ نے اپنے دستے کو رکنے کا اشارہ کیا۔ سب رک گئے تو آپ نے بہت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں سورہ الفتح اور سورہ النصر کی تلاوت فرمائی اور پھر آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ یہ دستہ شہر کے بالائی درے اذاخر سے حجون اور معلات کے قریب سے مکےّ میں داخل ہوا۔ جہاں سے سارا شہر نظر آتا ہے۔ ہماری پہلی خواہش یہ تھی کہ ہم خانۂ کعبہ کو دیکھیں، کعبے پر نظر پڑتے ہی ہم سب کی عجیب حالت ہو گئی۔ آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر شکر کے کلمات، خانۂ کعبہ کو جی بھر کے دیکھنے کے بعد میں نے باقی شہر کی طرف نظر دوڑائی۔ سارا شہر سنسان پڑا تھا۔ معلوم ہوتا تھا ہمارے لئے خالی کر دیا گیا ہے۔ لوگ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں پناہ لینے کے لئے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ باقی پہلے ہی اپنے گھروں میں پہنچ چکے تھے۔ خانۂ کعبہ کے گرد بھی بہت تھوڑے سے لوگ تھے۔ ایک سال پہلے بھی یہ شہر ہمارے لئے خالی ہوا تھا مگر اُس مرتبہ صرف تین دن کے لئے جو بہت جلد ختم ہو گئے تھے۔

ذرا آگے بڑھے تو حجون اور معلات کے علاقے سامنے تھے جہاں میں اکثر اُمیہ کے کاموں کے سلسلے میں آیا جایا کرتا تھا، سارا راستہ بھاگتے ہوئے کہ دیر ہو گئی تو کہیں آقا ناراض نہ ہو جائے۔ حجون ہی کے محلےّ میں آج سے کئی سال پہلے ایک رات ہشام بن عمروؓ، زہیر بن ابی اُمیہؓ، مطعم بن عدیؓ، ابو البختریؓ اور زمعہ بن الاسودؓ نے بنو ہاشمؓ کے دو سالہ معاشرتی مقاطعے کو ختم

کرانے کا تہیہ کیا تھا۔ سامنے مکےّ کا بازار نظر آرہا تھا جہاں میرا کئی بار سودا ہوا تھا۔ بازار کے ایک طرف نظر پڑی تو وہاں تلواریں چمک رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ حضورؐ نے بہت تردّد سے پوچھا:

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے ہتھیاروں کے استعمال سے منع کیا تھا"۔

پھر عثمانؓ نے آگے بڑھ کر خبر دی کہ خالدؓ کے رسالے پر عکرمہ، سہیل اور صفوان کے ایک دستے نے حملہ کر دیا تھا۔

اس پر آپؐ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے"۔

حجون کے محلےّ میں جنت المعلیٰ کے پاس، جہاں خدیجہؓ اور حضورؐ کے صاحب زادے قاسم دفن ہیں، سُرخ چمڑے کا ایک خیمہ نصب تھا جو ابو رافعؓ نے حضورؐ کے لئے لگایا تھا۔ خانۂ کعبہ سے تھوڑے ہی فاصلے پر۔ یہ ابو رافعؓ وہی تھے جن کو جنگِ بدر کے بعد ابو لہب کے ہاتھوں پٹتا دیکھ کر اُمّ الفضل نے ابو لہب کے سر پر ڈنڈا دے مارا تھا۔ اسی ڈنڈے کا زخم بگڑ کر بالآخر اُس کی موت کا سبب بنا۔ ابو رافعؓ کا قصور یہ تھا کہ ابو لہب نے اُن سے جب جنگِ بدر کی تفصیل پوچھی تو اُنھوں نے صاف صاف سارے واقعات بیان کر دیئے جو ابو لہب کو بہت توہین آمیز معلوم ہوئے۔ تفصیل برداشت سے باہر ہو گئی تو ابو الہب نے غصےّ میں ابو رافعؓ کو مارنا شروع کر دیا۔ ابو رافعؓ کبھی عباسؓ کے غلام تھے جنھیں انہوں نے رسولِ کریمؐ کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ حضورؐ نے انہیں آزاد فرمادیا تھا مگر آزاد ہونے کے بعد بھی وہ میری طرح حضورؐ ہی کی خدمت میں رہے۔ حضورؐ کی نظر خیمے پر پڑی تو انہوں نے سامنے کھڑے جابرؓ کو پاس بلا کر اشارے سے وہ خیمہ دکھایا اور ساتھ ہی شکر و ثنا میں مشغول ہو گئے۔ اُن کا سر تشکرّ سے اتنا جھک گیا کہ ریشِ مبارک قصواء کی گردن کو چھونے لگی۔ ابو قبیس کی پہاڑیوں پر بھی

کچھ لوگ جمع تھے جن میں ابو بکرؓ کے بے حد ضعیف اور نابینا والد عثمان بن عامر جنہیں ہم ابو قحافہ کے نام سے جانتے ہیں اور ابو بکرؓ کی ہمشیرہ قُریبہ بھی تھیں۔ یہ دونوں ابھی اسلام نہیں لائے تھے۔ ابو قحافہ کو میں نے ایک مدت کے بعد دیکھا تھا۔ اتنے بزرگ ہو چکے تھے کہ پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ قحافہ اُن کی صاحب زادی' جن کے نام سے اُن کی کنیت ہے' اُن کی سب سے چھوٹی اولاد تھیں۔

ابو سفیانؓ نے ہماری فوج کی آمد سے پہلے ہی مکّے پہنچ کر داعئ اسلامؐ کی طرف سے اعلان کر دیا تھا کہ جو اُن کے گھر میں یا خانۂ کعبہ میں یا اپنے گھر کے اندر دروازے بند کئے بیٹھا ہو گا، اُسے امان دی جائے گی۔ پہلے پہل تو لوگوں کو یقین نہیں آیا لیکن جب یہی اعلان اسلامی لشکر کے مختلف دستوں سے بار بار ہوُا تو لوگوں کو اطمینان ہوُا اور وہ ایک ایک دو دو کر کے حرمِ کعبہ میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔

اُمِّ سلمہؓ، میمونہؓ، اور فاطمۃ الزہراؓ خیمے میں حضورؐ کا انتظار کر رہی تھیں۔ اُمِّ ہانیؓ بھی کچھ دیر پہلے اپنے گھر سے چل کر وہیں آگئی تھیں۔ قصواء آہستہ آہستہ چلتی سُرخ خیمے کے پاس پہنچی تو ابو رافعؓ نے بڑھ کر ان کی مہار تھام لی۔ حضورؐ نیچے اُترے اور خیمے میں داخل ہو گئے۔ سب سے پہلے انہوں نے غسل فرمایا۔ جب میں اُن کے غسل سے بچا ہوُا پانی لے کر خیمے سے باہر آیا تو ایک ہجوم اُس پانی کا منتظر تھا۔ سب مجھ پر ٹوٹ پڑے اور قریب تھا کہ پانی کا برتن میرے ہاتھ سے چھوٹ جاتا کہ ابو حنیفہؓ نے آگے بڑھ کر لوگوں کو نظم وضبط کی تاکید کی۔ پھر بھی ہر شخص بے تاب تھا کہ وہ اِس سعادت سے محروم نہ رہ جائے۔ جس کے پاس کوئی کاسہ تھا، اُس نے بھر لیا۔ جس کے پاس کچھ نہیں تھا اُس نے چلوؤں میں لے کر چہرے اور سینے پر مل لیا۔ جن کو اتنا بھی نہ مل سکا انہوں نے صرف چھینٹوں پر اکتفا کی اور جنہیں چھینٹے بھی میّسر نہیں آئے انہوں نے دوسروں کے ہاتھوں سے اُس پانی کی نمی حاصل کرنے کی

کوشش کی۔

میں برتن رکھنے اندر گیا تو سرورِ دو عالمؐ شکرانے کے نفل پڑھ رہے تھے۔ آٹھویں رکعت ختم کر کے سلام پھیرا تو اُنھوں نے مجھے بلا کر کہا کہ وہ صحنِ کعبہ میں بھی شکرانے کے دو نفل سب کے ساتھ مل کر ادا کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ایک چھڑی اٹھائی اور باہر لے جا کر اسے خانۂ کعبہ کی دیوار کے سامنے زمین پر گاڑ دیا۔ اس کے فوراً بعد حضورؐ خیمے سے باہر تشریف لائے۔ سر پر وہی سیاہ عمامہ تھا مگر اب زرہ بکتر نہیں، روزمرّہ کے کپڑے پہن رکھے تھے جن میں انھوں نے خیمے کے اندر شکرانے کے نفل پڑھے تھے۔ صفیں درست ہوئیں اور سب نے حضورؐ کی قیادت میں چھڑی کی سمت رُخ کر کے شکرانے کے دو دو نفل ادا کئے۔ اس کے بعد آپ خیمے میں تشریف لے گئے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ پھر فوجی لباس میں خود اور زرہ بکتر پہنے، تلوار لگائے' باہر آئے اور قصواء پر سوار ہو گئے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی اور خود کا مِغفر اوپر اُٹھایا ہوُا تھا۔ وہ لوگ جو صبح کے سفر میں اُن کے ہم رکاب تھے خیمے سے باہر اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ قصواء چلی تو وہ بھی ساتھ ساتھ ہو لئے۔ حضورؐ، ابو بکرؓ سے باتیں کرتے ہوئے خانۂ کعبہ کے جنوب مشرقی گوشے پر پہنچے اور چھڑی کو حجرِ اسود کے ساتھ لگا کر استلام کیا۔ پاس کھڑے لوگوں نے بھی اُن کے ساتھ اللہ اکبر کہا۔ پھر اور لوگ بھی شامل ہو گئے اور تھوڑی ہی دیر میں سارا حرم اللہ اکبر کی صدا سے گونج اٹھا۔ حضورؐ نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش کرا دیا اور طواف میں مشغول ہو گئے۔

اُس دن قصواء کی مُہار اوس کے محمد بن مَسلمہؓ کے ہاتھ میں تھی۔ گزشتہ سال عمرۃ القضا کے موقع پر یہ سعادت قبیلۂ خزرج کے عبداللہؓ ابنِ رواحہؓ کے حصے میں آئی تھی۔ طواف کے سات چکر پورے کرنے کے بعد انہوں نے خانۂ کعبہ کے اطراف رکھے ہوئے بتوں پر نظر ڈالی اور اُن کی طرف چل پڑے۔ ہر بت کے پاس گئے اور اُسے اپنے دستِ

مبارک میں پکڑی ہوئی کمان کی نوک سے گراتے گئے۔ ساتھ ساتھ کہتے جاتے تھے :

"حق آ گیا ہے اور باطل فرار ہو گیا ہے۔ بے شک باطل کو فرار ہی ہونا تھا"۔

اطراف کے بتوں کو گرانے کے بعد وہ خانۂ کعبہ کے سامنے رکھے ہوئے بُت ہبل کے پاس گئے اور اُسے گرا کر توڑنے کا حکم دیا۔

اس کے بعد اُنھوں نے فرمایا کہ سب بتوں کو نذرِ آتش کر دیا جائے۔ ساتھ ہی شہر میں منادی کروادی کہ جس جس گھر میں بُت رکھے ہوئے ہیں، وہ لا کر باقی بتوں کے ساتھ جلا دیئے جائیں۔

مشرکین عرب کے تمام خداؤں کی مجموعی خدائی مطاف میں ملبے کا ڈھیر بنی ہوئی تھی جس میں جگہ جگہ آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ لکڑی، کپڑے، جھلی سے بنے ہوئے بتوں سے شعلے لپک رہے تھے۔ پتھر کے بتوں کے جابجا بکھرے ہوئے اعضاء پر ان شراروں کی چھوٹ پڑتی تو اُن پر سجاوٹ کے لئے لگے ہوئے پیتل کے نقش و نگار دمک دمک اُٹھتے۔ بڑی عبرت کا مقام تھا کہ جب یہ سارے بت قائم تھے تو ان سے کبھی کسی کو روشنی کی ایک کرن بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ 'اُعلُ ہُبل' کا نعرہ لگانے والا آج کوئی نہیں تھا۔ کوئی نہیں تھا جو اُن سے مرادیں مانگے۔ مرادیں پوری کرنا تو در کنار وہ آج اپنی مدد کرنے سے بھی قاصر تھا۔ اُس کے جابجا بکھرے ہوئے ٹکڑے آگ میں دہک رہے تھ۔ بتوں کے پجاری آج اپنے بے بس خداؤں کی فرضی معبودیت کے حصار سے نکل کر معبودِ واحد و لاشریک کے جوارِ رحمت میں اُس کے رسولِ برحقؐ کے ساتھ اتنی بلندیوں پر پہنچ چکے تھے جہاں اُنہیں اپنے جھوٹے خداؤں کی باقیات پر ترس کھانے کا بھی دماغ نہیں تھا۔

ان بتوں کو یہیں جلتا چھوڑ کر آنحضورؐ نے قصواء کا رخ صفا کی طرف موڑ دیا۔ وہاں پہنچ کر اُنھوں نے وہاں رکھے ہوئے اِساف کے بت کو توڑ گرانے کا حکم دیا۔ پھر مروہ کی پہاڑی

کا رُخ فرمایا۔ یہاں نائلہ کا بت نصب تھا۔ یہ بت بھی حضورؐ کے حکم پر توڑ کر گرا دیا گیا۔ اِساف اور نائلہ کے ٹکڑے بھی حضورؐ کے ارشاد کے مطابق مطاف میں جلتے ہوئے دیگر بتوں کے ساتھ جلتی آگ میں پھینک دیئے گئے۔ مروہ پر قائم نائلہ کا بت وہ مقام تھا جہاں مشرکین ذبیحہ کیا کرتے تھے۔ یہ دونوں بھی معبود تھے مگر مشرکین کے دوسرے خداؤں سے ذرا کم حیثیت۔ نائلہ اور اِساف کے بارے میں میں نے بہت عجیب عجیب کہانیاں سن رکھی ہیں مگر مجھے کبھی ان باتوں کی تصدیق کا موقع نہیں ملا اس لئے اُن کہانیوں کا ذکر مناسب نہیں۔ اگر تصدیق ہو گئی اور عمر نے وفا کی اور ہمیں پھر کبھی مل بیٹھنے کا موقع میسر آیا تو بیان کر دوں گا۔

اب حدودِ حرم میں صرف ایک بُت نظر آ رہا تھا۔ سارے بتوں سے بڑا، پیتل کا بنا ہوا۔ یہ بنو خزاعہ کا معبود تھا اور خانۂ کعبہ کی چھت پر لوہے کی میخوں سے نصب تھا۔ میں نے سنا ہے یہ بنو خزاعہ ہی تھے جن کے ایک خوش فہم بزرگ صدیوں پہلے شام سے ہبل کا بت لے کر آئے تھے اور یوں اُن کی کج فہمی سے عربستان میں بت پرستی کی ابتداء ہوئی۔ حضورؐ نے ایک نظر بنو خزاعہ کے بت کو دیکھا اور قصواء سے اتر کر علیؓ سے کہا کہ وہ کعبے کی دیوار کے ساتھ بیٹھ جائیں۔ علیؓ نے تعمیل کی، پھر حضورؐ نے اُن کے شانوں پر پاؤں رکھ کر خانۂ کعبہ پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن علیؓ سے اُن کا وزن برداشت نہ ہو سکا۔ پھر رسولِ پاکؐ خود اُن کی جگہ بیٹھ گئے اور علیؓ کو حکم دیا کہ وہ اُن کے شانوں پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھیں اور خزاعہ کے بت کو اکھاڑ کر نیچے پھینک دیں۔ علیؓ نے تعمیل کی اور یوں یہ آخری بت بھی بھڑکتے شعلوں کی نذر کر دیا گیا۔

حرم کعبہ کو بتوں کی آلودگی سے پاک کر کے آپ مقامِ ابراہیم پر آئے، قصواء سے اُتر کر دو نفل ادا کئے، پھر پیدل چاہِ زمزم پر گئے۔ یہاں عباسؓ نے انہیں آبِ زمزم پلایا۔ اس موقع پر انھوں نے ایک اعلان کے ذریعے زائرین کو پانی پلانے کی ذمے داری ہمیشہ کے لئے

بنو ہاشم کے سپرد کردی۔ یہ پہلے بھی انہیں کا منصب تھا مگر اب رسالتمآبؐ کی طرف سے اس کی توثیق کردی گئی۔ اس کے بعد علیؓ نے خانۂ کعبہ کی چابی پیش کی تو عباسؓ نے درخواست کی کہ کعبے کی کلید برداری بھی بنوہاشم کو عنایت فرمائی جائے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا:

"میں تم کو وہ دے سکتا ہوں جو تم نے کھویا تھا۔ وہ نہیں جسے دینے سے کوئی اور کچھ کھو بیٹھے"۔

یہ کہہ کر انہوں نے عبدالدّار کے عثمان بن طلحہؓ کو بلوایا اور چابیاں اُن کے حوالے کر کے اُن کے خاندان کے اس قدیمی منصب کی بھی توثیق کردی۔ عثمانؓ نے نہایت ادب سے چابی لی اور خانۂ کعبہ کا دروازہ کھولنے چلے گئے۔ اُس وقت میرے ذہن میں دعوتِ اسلام کے اوّلین ایام کا ایک منظر پھر گیا۔ ایک دن حضورؐ نے عثمان بن طلحہؓ سے درِ کعبہ کھولنے کی خواہش کی تھی مگر عثمانؓ نے نہایت سختی سے انکار کردیا تھا۔ اُس دن حضورؐ نے کہا تھا:

"عثمان! ایک دن آئے گا جب یہ کنجی میرے پاس ہوگی اور میں جسے چاہوں گا اُسے تفویض کردوں گا"۔

اس پر عثمانؓ نے کہا تھا:

"شاید اُس دن تمام قریش مرچکے ہوں گے"۔

اور نبیِّ کریمؐ نے جواب دیا تھا:

"نہیں وہ تو قریش کی سچی عزّت کا دن ہوگا"۔

حضورؐ خانۂ کعبہ کی طرف بڑھے تو میں اور اُسامہؓ بھی اُن کے پیچھے پیچھے تھے۔ انہوں نے ہمیں بھی اپنے ساتھ اندر جانے دیا۔ اور عثمانؓ سے کہہ کر اندر سے تالا لگوادیا۔ ہزاروں کے مجمع میں حضورؐ کے ساتھ خانۂ کعبہ کے اندر جانے کا شرف ہمارے حصے میں آیا۔ میرے لئے خانۂ کعبہ میں داخل ہونے کا یہ پہلا موقع تھا۔ چاروں طرف دیواروں پر

بتوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی مورتیں بھی بنی ہوئی تھیں۔ اُن کے ہاتھوں کے پاس پانسے کے تیر رکھے تھے جن سے کفارِ مکّہ فال نکالتے تھے۔ انہیں دیکھ کر رسول اللہؐ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ ان کافروں کو برباد کرے۔ واللہ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ دونوں نے کبھی تیروں سے فال نہیں نکالی"۔

یہ کہہ کر انہوں نے عثمانؓ کو حکم دیا کہ ساری دیواریں صاف کردی جائیں اور دونوں پیغمبروں کی مورتیاں اُسی وقت اٹھواکر دوسرے بتوں کے ساتھ آگ میں پھنکوادیں۔ دوسری اور آخری مرتبہ حجتہ الوداع پر جب مجھے اور اُسامہؓ کو ایک مرتبہ پھر حضورؐ کے ساتھ خانۂ کعبہ کے اندر جانے کی سعادت حاصل ہوئی تو خانۂ کعبہ کی دیواریں اندر سے بالکل صاف ہوچکی تھیں اور جاہلیت کے نقش ونگار کا نشان بھی موجود نہیں رہا تھا۔ چند منٹ اندر ٹھہر کر حضورؐ نے دروازہ کھلوایا اور بابِ کعبہ میں کھڑے ہوکر فتحِ مکّہ کا تاریخی خطبہ دیا۔ میں اور اُسامہؓ، آپ کے پیچھے کھڑے حاضرین اور اُن کے چہروں کے تاثرات دیکھ رہے تھے۔ اس وقت تک حرمِ کعبہ لوگوں سے بھر چکا تھا۔ حضورؐ نے اللہ جلّ شانہ، کی حمد کی، پھر اُس کا شکر ادا کیا کہ اُس نے اسلام کو باطل کی تمام قوتوں کے مقابلے میں سرخرو کیا۔ خطبے میں "لاتثریب علیکم الیوم یغفراللہ لکم وھو الرحم الرحمین" کے الفاظ ادا ہوئے تو چاروں طرف سناٹا چھاگیا۔ وہ ہوگیا جس کی لوگوں کو توقع نہیں تھی۔ اِس سناٹے میں بھی ان الفاظ کی بازگشت سنائی دے رہی تھی بلکہ سناٹا ختم ہونے کے بعد بھی لوگوں کے ذہنوں پر سرورِ کائناتؐ کے ان الفاظ کا طلسم چھایا رہا۔

فتحِ مکہّ کی اذان

خطبہ ختم ہوتے ہی ظہر کا وقت ہو گیا تو رسالت مآبؐ نے پیچھے مڑ کر مجھے اپنے پاس بلایا اور بیت اللہ شریف کی چھت پر چڑھ کر اذان دینے کا حکم دیا۔

صلحِ حدیبیہ کے ایک سال بعد عمرۃ القضا کے موقع پر بھی میں نے رسول اللہؐ کے ارشاد کے مطابق خانہ ٔکعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دی تھی۔ اُس موقع پر ابو قبیس پر بیٹھے سردارانِ قریش کے تاثرات مجھ تک پہنچ گئے تھے مگر آج جب فتحِ مکہّ کے دن مجھے خانہ ٔکعبہ کی چھت پر سے اذان دینے کا حکم ملا تو مجھ میں کسی اور کے تاثرات محسوس کرنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ میں خود اپنے تاثرات کے سمندر میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ میں بلالِ حبشی آج دوسری مرتبہ جدّ الانبیاء ابراہیم علیہ السّلام کے بنائے ہوئے اس مرکزِ توحید کی بلندیوں سے اللہ وحدہٗ لاشریک کی کبریائی اور سیّد الکونین حضرت محمد مصطفٰےؐ کی رسالت کی شہادت دینے والا تھا۔ مسجدِ نبوی میں میری پہلی اذان کو رسالتمآبؐ نے اپنی مسجد کی تکمیل سے تعبیر فرمایا تھا۔

آج خانۂ کعبہ سے میری تکبیرِ الٰہی کو وہ کُل بنی نوعِ انسان کے لئے تطہیرِ کعبہ کا اعلان بنانا چاہتے تھے۔ یہ بلالِ حبشی کی معراج تھی۔

میں بابِ ملتزم کے ساتھ چھت سے لٹکے ہوئے رسوں کے سہارے کعبے کی دیوار پر چڑھنے لگا۔ ہانپتا کانپتا، ہاتھ کبھیاں پاؤں ٹکاتا، آہستہ آہستہ اوپر ہوتا گیا اور آخر کار چھت کی منڈیر پکڑ کر اوپر پہنچ گیا۔ بہت تھک گیا تھا۔ جوانی کا زور اب نہیں رہا تھا۔ پچاس سال کا ہونے والا تھا مگر جوش و جذبہ پہلے سے کہیں زیادہ تھا۔ فوراً لمبے لمبے سانس لے کر اپنے آپ کو سنبھالا اور اذان دینے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

کعبے کے گرد ایک بہت بڑے دائرے میں رکھے ہوئے تین سو ساٹھ بت جن پر ایک سال پہلے میری اذان سُن کر لرزہ طاری ہوا تھا، اِس وقت آگ میں جل چکے تھے۔ اُن سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ کعبہ بتوں سے پاک ہو چکا تھا۔ اس مرکزِ توحید میں بتوں کا وجود ہماری عبادت کی لطافت میں کثافت کے عنصر کی طرح شامل رہتا تھا۔ نیچے لوگوں کا جمِ غفیر تھا۔ دور دور تک جہاں جہاں نگاہ پہنچتی تھی، لوگ ہی لوگ تھے۔ مکے کی شکل سامنے میز پر رکھے ہوئے پیالے جیسی ہے۔ بیچ میں خانۂ کعبہ اور چاروں طرف پیالے کی دیواروں کی طرح اوپر جاتا ہوا پہاڑی سلسلہ جس پر شہر آباد ہے۔ کعبے کی چھت سے اُس دن میری نظر ادھر بھی اٹھ گئی جہاں رباح اور حمامہ رہتے تھے، میرے والدین جن کے یہاں میں کیڑوں مکوڑوں کی سی حیثیت میں پیدا ہوا تھا، جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔

صحنِ کعبہ تو بھرا ہوا تھا ہی چاروں طرف پہاڑیوں کی بلندیوں پر بھی لوگ جمع تھے۔ میں نے اذان شروع کی۔ میرے پہلے ہی لفظ پر نیچے کھڑے ہجوم کا شور تھم گیا۔ دوسری تکبیر کہی تو مکمل سکوت طاری ہو گیا۔ میری اذان میں اُس دن ایک غیر معمولی تاثر تھا۔ یہ میں اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ میری اذان کے الفاظ، سامنے پہاڑیوں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس مجھ تک پہنچ رہے تھے۔ یہ بازگشت مجھے بہت اچھی لگی۔ معلوم ہوتا تھا تمام کائنات میرے

ساتھ توصیفِ ربانی، شہادتِ رسالت اور دعوتِ صلوٰۃ میں شریک ہے۔ وہ حریمِ قدس جسے اسلام کے معمارِ اوّل حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کیا تھا، ہزاروں سال بت کدہ رہنے کے بعد آج پھر ایک حبشی غلام کے نغمۂ توحید سے گونج رہا تھا۔ یہ اذان اسلامی انقلاب کی کامیابی کا اعلان تھی۔

میں نے شہادتِ رسالت دیتے وقت رسول اللہؐ کی طرف اشارہ کیا۔ اُن کا سر تشکر سے جھکا ہوا تھا۔ اس بدرِ کامل کے گرد فرشِ کعبہ پر ستاروں کا ہجوم تھا جن میں سے نہایت روشن ستاروں کا ایک جُھرمٹ حضورؐ کے ساتھ تھا۔ ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، ابوذر غفاریؓ۔ اور بھی بڑی بڑی روشنیاں تھیں، فاصلے فاصلے سے، بغیر کسی ترتیب کے عجب چکا چوندھ کا عالم تھا۔ ایک کہکشاں تھی جو حرم کعبہ کے فرش پر اتر آئی تھی۔ یہی وہ عظیم فتح تھی جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ فتح کی آیت میں فرمایا تھا جو حدیبیہ سے مدینہ جاتے ہوئے راستے میں نازل ہوئی تھی۔ یہ وہی کامیابی تھی جس کی بشارت طریقِ ہجرت پر مدینہ جاتے ہوئے سورۃ القصص کی آیت میں دی گئی تھی۔

میں اکثر رات کو سوتے سوتے چونک کر اٹھ بیٹھتا ہوں اور اُس دن کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں۔ کیا شہر ایسے بھی فتح ہوتے ہیں یا وہ اک خواب تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ واقعہ تھا ہی اتنا عجیب، اتنا حسین، اتنا رُوح پرور کہ اُسے خواب ہی کہا جا سکتا ہے۔ حقیقتیں ایسی کب ہوتی ہیں مگر پھر میں اپنی یادوں کے دریچوں سے ہوتا ہوا وہاں پہنچ جاتا ہوں۔ وہ حقیقت جو خوابوں سے بھی حسین تھی، میرے سامنے آجاتی ہے۔ کیا واقعی یہ سب کچھ ہوا تھا؟ میرے سامنے بالکل ایسے ہی! میری ہی اذان کی بازگشت تھی یا مکے کی پہاڑیاں خود وحدتِ الٰہی اور رسالتِ محمدؐ کا اعلان کر رہی تھیں۔

اس وقت بھی جب میں اپنی دہلیز پر بیٹھا اپنی چھڑی کے دستے پر ٹیک لگائے سامنے پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہوتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا ہوں، میں اپنے آپ سے یہی سوال پوچھ رہا ہوں۔ مگر نہیں یہ خواب نہیں ہے! تاریخ نے واقعی خانۂ کعبہ کی چھت سے میری

اذان سنی ہے۔ آج بھی وقت کے ایوانوں میں فتحِ مکہ کی اُس اذان کی گونج سنائی دے رہی ہے جو فتحِ مکہ کے دن رسول اللہؐ کے حکم پر اللہ کے قدیم گھر میں مجھ بندۂ ناچیز کی آواز میں ادا ہوئی تھی۔

تمام مکہ صحنِ حرم میں اُمڈ آیا تھا۔ ہجوم میں مکے کے تاجر پیشہ حضرات تھے جن میں سے بیشتر حجرِ اسود اور رکن یمانی کے درمیانی علاقے میں تھے اور شاید اس سوچ میں گم تھے کہ جاں بخشی تو ہو گئی مگر یہ واقعہ جو دفعتاً رونما ہوا، اُن کے کاروبار پر کس طرح اثر انداز ہو گا۔ بین الاقوامی شاہراہ پر قائم مکے کا قدیم شہر صدیوں سے ایک اہم تجارتی حیثیت رکھتا تھا۔ کئی ملکوں سے کاروباری رابطے تھے مگر اب مکے کا تجارتی مستقبل کیا ہو گا۔

غریب، مزدور، محنت کش، بے وسیلہ، غلام، بڑی تعداد میں رکن عراقی کے سامنے حطیم کے پاس بیٹھے تھے۔ جو کچھ اُنہوں نے دیکھا اور سنا تھا، اُنہیں اچھا لگا تھا مگر پھر بھی اُن کی سہمی سہمی، حیرت زدہ آنکھوں سے لگتا تھا کہ کوئی خواب دیکھ رہے ہیں جس کے بارے میں انہیں خوف ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے کہیں بکھر نہ جائے۔ کیا واقعی انقلاب کے بعد زندگی کی کوئی سہولت اُنہیں بھی میسر آسکے گی۔

اُن کے سامنے ذرا فاصلے پر بائیں طرف مقامِ ابراہیم کے گرد خانۂ کعبہ کے سائے میں کج کلاہانِ قریش بیٹھے تھے۔ کل تک اُن کی ادنیٰ سے ادنیٰ خوشی پر انسانیت کی ہر قدر قربان کی جاسکتی تھی۔ دولت و ثروت، حکومت، اثر رسوخ، اختیار سب کچھ اُن کی میراث تھا مگر اس تغیر کے بعد جو صورتِ حال اُن کا مقدر بنتی نظر آتی تھی وہ اُن کے لئے پریشان کن تھی۔ وہ بے بس تھے مگر اِس بے بسی کے عالم میں بھی سوچتے تھے کہ اسلامی مساوات کی کڑوی گولی عملاً کس طرح حلق سے نیچے اُترے گی۔

رکنِ عراقی اور مقامِ ابراہیم کے درمیان ان گنت معرکہ آراء، آزمودہ کار صاحبان سیف و کمان تھے جو یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ پشت ہا پشت سے

اُن کے عروج کا گہوارہ، اُن کی عظمت و وقار کا ضامن، اُن کی شان و شوکت اور اقتدار کا محور شہرِ مکہ بغیر غارت گری اور خوں ریزی کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک دن میں کیسے اُن کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ان میں چند شاید یہ بھی سوچتے ہوں گے کہ یہ ایک جزوقتی شکست ہے اور حالات دیر سویر سے پھر اُن کی مرضی کے مطابق ہو جائیں گے۔

اُن کے ساتھ ہی بیٹھے چند صاحبانِ فکر و دانش شاید اس سوچ میں غلطاں تھے کہ نئے حالات میں شہرِ مکہ کی صدیوں پرانی عظمت برقرار بھی رہ سکے گی یا نہیں۔ تمام قبائل کے بُت آگ کا ایندھن بن گئے یا توڑ دیئے گئے تو اب کون آئے گا مکے میں چڑھاوے چڑھانے، منتیں ماننے۔ اُن کے معبود ہی نہ رہے تو تمام رحمتیں اور برکتیں جو اہلِ عرب کے ذہنوں میں مکے سے منسوب تھیں رفتہ رفتہ خیال و خواب ہو جائیں گی۔ پھر کیا رہ جائے گا مکہ کسی کی نظر میں۔ ایسے بھی تھے جن کا ایمان تھا کہ مکے کی حرمت پر حملہ ہوا ہے اور اب قہر نازل ہو کر رہے گا، ویسا ہی جیسا اصحابِ فیل پر ہوا تھا۔ کچھ لوگ یقیناً یہ بھی سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ اتنے بڑے جید خدا جن کی طاقت، اختیار اور قدرت پر اُن کی ساری کائنات کا دار و مدار تھا آن کی آن میں یوں فنا کر دیئے گئے اور کوئی قیامت برپا نہیں ہوئی۔ غرض ذہنوں میں طرح طرح کی سوچیں تھیں مگر نظریں سب کی بابِ ملتزم کی طرف محمد رسول اللہؐ پر تھیں جنہیں اُن میں سے اکثر جانتے تھے اور کئی بے نصیب جانتے ہوئے بھی نہیں جانتے تھے۔ وہ اُن کے رُوئے مبارک کے ہر تاثر سے، اُن کی ہر جنبشِ ابرو، ہر حرکتِ لب میں اپنے ان گنت سوالوں کا جواب تلاش کر رہے تھے۔

کئی نوجوان تھے جو اس سارے منظر کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ساری زندگی اس شہر کے عروج کی، توقیر کی، تقدیس کی داستانیں سنتے رہے تھے، اُس کا فتح ہو کر کسی اور کے قبضے میں چلے جانا اُن کی فہم سے باہر تھا۔ وہ اس واقعے کے محرکات سے تو کچھ حد تک آشنا تھے مگر اس انقلاب کی تاریخی، تہذیبی اور سماجی اہمیت کا اُنہیں کوئی اندازہ نہیں تھا اور نہ وہ یہ

سمجھ پا رہے تھے کہ یہ بدلا ہوا ماحول اُن کی آئندہ زندگی پر کیا اثرات مرتب کرے گا۔ یہ بے فکرے، بڑوں سے ہٹ کر، چاہِ زمزم کے نزدیک اپنا الگ پرا جمائے بیٹھے تھے۔ میں نے سنا، ان میں ایک عتاب نامی نوجوان کو میری اذان اچھی نہیں لگی۔ اُس نے پاس بیٹھے اپنے ایک مشرک ساتھی سے کہا شکر ہے آج میرا باپ زندہ نہیں ہے ورنہ وہ برداشت نہ کر سکتا کہ کعبے کی چھت پر ایک حمارِ سیاہ یوں ریکے۔

دُنیا ہر قسم کے انسانوں سے مل کر بنی ہے اور اللہ جل شانہٗ جس کو جب چاہے ہدایت سے سرفراز کر دے۔

اسی ٹولے سے میری اذان کے دوران میں کسی نے ازرہِ تمسخر میری اذان کی نقل اُتارنے کی کوشش کی۔ نہایت دھیمی آواز میں، جسے چند لوگوں نے سنا، اور بات آئی گئی ہو گئی۔ چند ثانیوں بعد اُسی ٹولے سے کسی اور نے میری اذان کی نقل کی۔ اسے بھی زیادہ لوگوں نے نہیں سنا اور جنہوں نے سنا بھی وہ ماحول کی سنجیدگی کی وجہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ چند لمحے گزرے کہ اسی جماعت کے کسی اور لاابالی نوجوان نے یہی صورت دہرائی مگر تینوں آوازیں اتنی مدھم تھیں کہ اُنہیں صرف قریب کے لوگوں نے سنا اور جب ان پر کہیں سے کوئی ردعمل نہیں ہوا تو ہر ایک نے یہ سمجھ کر سکھ کا سانس لیا کہ دانستہ شرارت کا یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا اور اب کسی باز پرس کی نوبت نہیں آئے گی۔ مگر ہوا یہ کہ اذان ختم ہوتے ہی حضورِ اکرمؐ نے اعلان فرمایا کہ وہ جس نے سب سے پہلے بلال کی اذان کی نقل کی تھی، سامنے آئے۔ حاضرین میں کھلبلی مچ گئی۔ ہر شخص پریشان کہ اب کیا ہو گا۔ اتنے میں ایک پندرہ سولہ سالہ نوجوان چاہِ زمزم کی سمت سے ملتزم کی طرف، راستہ بناتا ہوا، آتا دکھائی دیا۔ پاس آیا تو عمرؓ نے بڑھ کر اُس کا ہاتھ تھام لیا اور اُسے لوگوں کی صفوں سے باہر نکل کر، باب ملتزم کے پاس، حضورؐ کے سامنے لے آئے۔ بہت سوں کو اُس کی نوعمری پر ترس آیا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد حضورؐ زیرِ لب مسکراتے ہوئے اُس نوجوان کی طرف بڑھے اور

اُسے انتہائی شفقت سے کہا کہ وہ بلال کی اذان کی نقل دوبارہ سنائے۔ نوجوان کچھ دیر نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ پھر اُس نے حاضرین کی سمت دیکھا اور خالقِ کائنات کی تکبیر اور رسالت کی شہادت کے کلمات اپنی بھرپور آواز میں ادا کئے اور اِس خوش الحانی اور اعتماد کے ساتھ کہ تمام حاضرین دم بخود رہ گئے۔ اکثر کے منہ سے بے ساختہ سبحان اللہ اور جزاک اللہ کے الفاظ نکلے۔ خود نبیِ کریمؐ نے تعریف کی اور اُسے دِرہموں کی ایک تھیلی انعام میں دی۔ اُس کے سر، پیشانی اور سینے پر دستِ مبارک پھیرا۔ نوجوان کا شرحِ صدر ہوا، تو، بقول اُس کے، اُسے ایسا لگا جیسے کسی نے منوں بوجھ اُس کے سر سے اتار پھینکا ہے۔ اُس نے بآوازِ بلند سب کے سامنے کلمۂ شہادت پڑھا اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ حضورؐ نے اُسے دُعا دی اور اُس سولہ سالہ نوجوان کو تاحیات بیتِ عتیق کا مؤذن مقرر فرمادیا۔ ہم اس نوجوان کو ابو محذورہ جمحی کے نام سے جانتے ہیں۔

ابو محذورہ واپس اپنی صفوں کی طرف جانے لگے تو اُن صفوں سے ایک اور آواز اُبھری:

"یا محمد! میں عتاب بن اُسید ہوں، آپ کا مشہور دشمن!"

یہ کہتے ہی اُس بیس سالہ نوجوان نے نہایت بلند آواز سے کلمۂ شہادت ادا کیا۔ حضورؐ نے بھرے مجمع میں اپنے منہ بولے دشمن سے ایمان کی شہادت سنی تو فوراً اعلان فرمایا:

"میں تمہیں مکّے کا امیر مقرر کرتا ہوں"

ساتھ ہی دینی تعلیم کے لئے اُنہوں نے معاذ بن جبلؓ کو اُن کے ساتھ مامور کر دیا۔ عتاب بن اُسیدؓ کا مشاہرہ ایک درہم یومیہ مقرر ہوا۔ اُس سال فریضۂ حج اُنہی کی قیادت میں ادا ہوا۔

ایک لمحے پہلے کا دشمن دیں، اسلام کے مفتوحہ شہر کا مطلق العنان والی بن گیا،

ایک لمحے پہلے کا غیر سنجیدہ، شریر نوجوان کائنات کی سب سے محترم عبادت گاہ کا مؤذن مقرر ہو گیا۔ یہ تھا عفو و درگزر کا وہ سبق جو ہادیِ برحقؐ نے دنیاوی اور مادّی مصلحتوں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو سکھایا۔ پھر عتابؓ اور ابو محذورہؓ ہی کیا، محسنِ انسانیتؐ کی رحمتِ بے پایاں کا نفسیاتی اثر یہ ہُوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے پورا علاقہ ایمان کی روشنی سے منور ہو گیا۔

ابھی چند روز پہلے میں اپنے ایک بزرگ دوست کے یہاں اُنہیں عمرے کی مبارکباد دینے حاضر ہُوا تھا۔ مکے کا حال احوال سننے کا بھی شوق تھا، کہ آخر مکہ میری جائے پیدائش تھا اور وہاں کے ایک ایک ذرے سے میری ہزار ہزار یادیں وابستہ تھیں۔ باتوں باتوں میں معلوم ہُوا کہ ابو محذورہؓ آج بارہ سال بعد بھی مسجد الحرام میں مؤذن کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور اہل مکہ میں اُن کا بڑا احترام ہے۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں ہمیشہ شاد کام رکھے۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔

خطبۂ عرفات

دس ہجری، ذی الحج کی نو تاریخ، جمعہ کا دن، مقام: منیٰ۔ علی الصبح ربیعہ بن کعبؓ نے حضورؐ کے لیے وضو کا انتظام کیا اور میں نے فجر کی اذان دی۔ ہم نے حضورؐ کے ساتھ نماز ادا کی اور جب سورج ذرا نکل آیا تو آپ نے مجھے وادیِ نمرہ میں اپنے لیے خیمہ نصب کرنے کا حکم دیا۔ میں نے یہ ہدایت لوگوں تک پہنچا دی۔ حضورؐ منیٰ سے روانہ ہوئے۔ جاہلیت کے زمانے میں قریش کا یہ دستور تھا کہ وہ عرفات پہنچنے سے پہلے مزدلفہ میں مشعر الحرام کے قریب قیام کرتے تھے۔ چنانچہ خیال یہ تھا کہ حضورؐ عرفات جاتے ہوئے مزدلفہ میں قیام فرمائیں گے، لیکن حضورؐ اس دستور کے برعکس براہِ راست وادیِ نمرہ میں تشریف لائے اور سنت ابراہیمی کے مطابق اعلان فرمایا:

"اپنے مقدس مقامات پر ٹھہرو کیونکہ تم اپنے باپ ابراہیم کی میراث پر ہو۔"

حضورؐ کے لیے کوہِ ثبیر کے ایک غار کے دہانے پر سرخ اونی کپڑے کا ایک خیمہ نصب کر دیا گیا۔ آپ نے دن ڈھلے تک خیمے میں قیام فرمایا اور عبادات میں مصروف رہے۔ پھر اپنی اونٹنی قصواء پر سوار ہوئے اور وادیِ عرفات میں جبل الرحمت کی طرف بڑھے۔ میں پاپیادہ قصواء کی مہار تھامے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ فرزندانِ توحید نے حضورؐ کو جبل الرحمت کی طرف جاتے دیکھا تو سب کے سب بصد اشتیاق اس چھوٹی سے پہاڑی کے گرد اکٹھے ہونے لگے۔ قصواء خراماں خراماں قدم اٹھاتی ہوئی اپنے عظیم المرتبت سوار کو پہاڑی کے اوپر لے گئی۔ ہمارے نیچے وادی میں ایک لاکھ سے بھی کہیں زیادہ کا اجتماع تھا۔ احرام میں ملبوس فرزندانِ توحید کا اتنا بڑا اجتماع چشمِ فلک نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

چاروں طرف مُکبّر تعینات تھے کہ حضورؐ کے لبِ مبارک سے ادا ہونے والے ایک ایک جملے کو اس طرح دُہراتے جائیں کہ ایک ایک لفظ ہر شخص کے کانوں تک پہنچ جائے۔

حمد و ثناء کے بعد آپ نے فرمایا:

"جاہلیت کے تمام دستور میرے قدموں تلے ہیں۔

اے لوگو! بیشک تمہارا رب ایک ہے، اور بیشک تمہارا باپ ایک ہے۔

کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، کسی سرخ کو سیاہ پر اور کسی سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں ہے، اگر کوئی فضیلت ہے تو محض تقویٰ کی بنیاد پر۔

سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

جو خود کھاؤ وہی اپنے غلاموں کو کھلاؤ، جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔

آج جاہلیت کے تمام خون معاف کر دیئے گئے اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کے ربیعہ بن حارث کا خون معاف کرتا ہوں۔

جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبدالمطلبؓ کا سود منسوخ کرتا ہوں۔

عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔ تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔

تمہارا خون، تمہارا مال تاقیامت اسی طرح حرام ہے جس طرح اس مہینے میں اور اس جگہ آج کا دن حرام ہے۔

میں تم میں ایک چیز چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر تم نے اس کو مضبوطی سے تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ وہ چیز کیا ہے، اللہ کی کتاب!

اللہ نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے۔ اب کسی کو وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں۔

بچہ اس کا ہے، جس کے بستر پر پیدا ہوا اور زناکار کے لیے پتھر ہے اور اس کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔

جو اپنے باپ کے سوا کسی اور کے نسب سے ہونے کا دعویٰ کرے اور جو غلام اپنے آقا کے سوا کسی اور طرف اپنی نسبت کرے، اس پر اللہ کی لعنت۔

عورت کو اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر کسی کو کچھ دینا جائز نہیں۔

قرض ادا کیا جائے، عاریتاً لی ہوئی ہر چیز واپس کی جائے، عطیے کا بدلا عطیہ ہے اور ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے۔"

میدانِ عرفات میں چاروں طرف پھیلے ہوئے مُکبّر آپ کا ایک ایک لفظ نشر کر رہے تھے اور

حُجاج ہمہ تن گوش، نہایت غور سے آپ کا خطبہ مبارک سُن رہے تھے۔ خطبہ کے بعد آپ نے حاضرین سے دریافت فرمایا:

"تم سے اللہ کے ہاں میری نسبت پوچھا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے؟"

مجھ سمیت سب نے بیک آواز عرض کیا:

"یارسول اللہؐ! ہم کہیں گے کہ آپ نے اللہ کا پیغام ٹھیک ہم تک پہنچا دیا"

اس پر آپ نے اپنی انگشتِ مبارک آسمان کی طرف بلند کی اور تین مرتبہ یہ الفاظ دُہرائے:

"اے اللہ تو گواہ رہنا کہ یہ لوگ کیسی صاف صاف گواہی دے رہے ہیں۔"

خطبہ تمام ہوا تو آپ نے مجھے اذان دینے کا حکم دیا۔ چند ہی لمحوں میں ساری وادی میری آواز سے گونج رہی تھی۔ میں سراپا آواز بن چکا تھا، ایسی آواز، جو ہر طرف پہنچ رہی تھی اور عرفات کی پہاڑیوں سے ٹکرا کر واپس مجھ تک آ رہی تھی۔ آپ نے آج سیاہ و سفید کی تمیز مٹا کر مجھ سیاہ فام کو وہ توانائی بخش دی تھی کہ میری آواز نور کا ایک سیل بن کر سارے عرفات میں موجزن تھی۔ اذان کے بعد حضورؐ نے امامت فرمائی اور دو رکعت نماز ظہر اور پھر ساتھ ہی دوسری اقامت کے ساتھ دو رکعت نمازِ عصر قراءت کے ساتھ ادا کی۔ دونوں نمازیں قصر کے ساتھ پڑھیں۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ اپنے خیمے کے پاس تشریف لائے، کچھ دیر جبل مشاۃ کے سامنے صخرات کے پاس قبلہ رخ کھڑے رہے اور رب العزت کے حضور دعائیں مانگتے رہے۔ پھر قصواء سے اترے اور خیمے میں داخل ہو گئے۔ آخری وحی اسی خیمے میں نازل ہوئی جو سورۃ مائدہ کی تیسری آیت کی شکل میں محفوظ ہے۔ یہ وحی ہمارے دین کی تکمیل کا اعلان تھی۔ وہ دین جو پیغمبرِ اول سے شروع ہو کر نبی آخرالزماں پر مکمل ہوا۔

غلامی

دمشق بہت بڑا شہر ہے۔ دنیا کا شاید قدیم ترین شہر۔ کئی قدیم و جدید تہذیبوں کا سنگم۔ صدیوں سے تجارت کا عظیم مرکز۔ یہاں بھانت بھانت کے لوگ رہتے ہیں۔ ایک سے ایک نکتہ داں، بال کی کھال کھینچنے والا۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنہیں صرف نکتہ چینی سے سروکار ہے۔ میں نے کچھ لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ اسلام نے غلامی کے رواج کو بُرا کہتے ہوئے بھی اُسے روا رکھا اور زمانۂ جاہلیت کی دیگر مذموم رسوم کی طرح اُسے یک قلم منسوخ کرنے کی جائے اصل مسئلے سے چشم پوشی برتی۔ طبع آزمائی ہر شخص کا حق ہے لیکن فکر کا توازن اللہ کی دین ہے۔ مَیں، جس نے غلامی کے ہر دُکھ کو اپنی جان پر جھیلا ہے، شاید اس موضوع پر کچھ کہنے کا زیادہ حق رکھتا ہوں۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ ہر رسم کا ایک سماجی یا معاشرتی پس منظر ہوتا ہے۔ ہر رسم کی ابتدا کسی معقول وجہ سے ہوتی ہے۔ کچھ عرصے تک اُس کی معقولیت اور جواز قائم رہتا ہے، بعد میں انسان کی وقتی ضروریات یا اُس کا نفسیاتی عدم توازن اُس کی شکل بگاڑ دیتا ہے اور وہ اس

حد تک مسخ ہو جاتی ہے کہ اُس کا بنیادی مقصد ہی نظروں سے او جھل ہو جاتا ہے اور پھر سب بغیر سوچے سمجھے لکیر پیٹتے رہتے ہیں۔ یونان کے قدیم فلسفیوں نے تو آزاد لوگوں کو بھی مستقل طبقات میں تقسیم کرنے کی سفارش کی تھی۔ اُن کا منشا تھا کہ انسانوں کے پیشے مقرر کر کے ابد آباد تک اُن کی اور اُن کی آنے والی نسلوں کی سماجی حیثیت متعین کر دی جائے۔ کم وبیش ان ہی خطوط پر ہندومت نے مذہب کی آڑ میں آزاد لوگوں کو الگ الگ اکائیوں میں بانٹ کر اُن کے خون، خاندان، نسل اور نسب کے اعتبار سے اُن کی ذاتیں بنا رکھی ہیں جن میں کچھ کو کچھ پر دائمی فوقیت حاصل ہے۔ وہ ایسی آہنی دیواروں کے پیچھے قید کر دئے گئے ہیں کہ اپنی تمام تر بشری خوبیوں اور صلاحیتیوں کے باوجود وہ انہیں پھلانگ نہیں سکتے، گویا یہ خود ساختہ سماجی زنجیریں قیامت تک کے لئے اُن کا مقدر بنا دی گئی ہیں۔ ایسے معاشروں میں غلاموں اور نیچ ذات کے لوگوں کو اپنے آقاؤں یا اونچی ذات والوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر اُن کی من مانیوں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ اُن پر چھوٹے چھوٹے انسانی خدا مسلط کر دئے گئے ہیں جن کے ہاتھوں میں اُن کی ساری خوشیاں، ساری خواہشات، ساری آرزوئیں دے دی گئی ہیں کہ وہ انہیں جس طرح چاہیں روندتے پھریں۔

رومن دور میں یہی کم تر انسان اپنے آقاؤں کی خدمت گزاری کے علاوہ اُن کے بیمار ذہنوں کو تفریح بھی مہیا کرتے تھے۔ جب ذرا شغل کو جی چاہا تو دو چار نہتے غلاموں کو بُھوکے شیروں کے آگے ڈال دیا۔ وہ چیختے چلاتے رہتے، منّتیں کرتے، ساجتیں کرتے، بھاگ بھاگ کر خونی درندوں سے زندگی کے چند اور لمحے مانگتے رہتے، خوں خوار شیروں کے پے در پے حملوں سے لہولہان ہو کر رحم کی بھیک مانگتے مانگتے نڈھال ہو کر گر پڑتے۔ اور درندوں کا نوالہ بن جاتے۔ اُن کی دردناک چیخیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتیں۔ اُن کے آقا یہ سارے مناظر ایک دلچسپ کھیل، ایک تماشے کی طرح دیکھتے رہتے اور اپنی بیویوں بچوں اور مہمانوں سمیت

قہقہے لگاتے رہتے۔

عربستان میں بھی غلاموں کا رواج تھا۔ غلاموں کی اصل وجہ تو شاید وہی جنگل کا قانون ہے کہ ایک طاقت ور اپنی طاقت کے بل بوتے پر ایک کمزور کو اپنے حکم کا پابند بنا لیتا ہے اور کمزور اپنی جان کے خوف سے اُس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ طاقت خواہ جسمانی ہو، خواہ مال و متاع کی، خواہ خاندانی شرف یا حسب نسب کی برتری کی۔ دوسری صورت میں غلامی ایک سزا تھی جو ناکام حملہ آوروں کے گرفتار شدہ افراد پر عائد کر دی جاتی تھی تاکہ وہ اپنی طالع آزمائیوں کا خمیازہ بھگتیں اور اُن کی حالتِ زار دیکھ کر دوسرے ایسی زیادتیوں سے باز رہیں۔ اس سے پہلے شکست پانے والوں کو قتل کر دینے کا رواج تھا۔ اب اُن کی افادیت ڈھونڈ لی گئی۔ ان غلاموں سے مختلف کام لئے جانے لگے تو یہ اپنے آقاؤں کی ضرورت بن گئے۔ رفتہ رفتہ ان کا وجود عزت و امارت کی علامت بن گیا۔ اب زمانۂ امن میں بھی ان کی خرید و فروخت شروع ہو گئی۔ اُن کی خرید پر رقم خرچ ہونے لگی تو اُن کے لئے ایسے سخت قوانین وضع کر دئے گئے کہ وہ حکم عدولی یا فرار ہو جانے کا تصوّر بھی دل میں نہ لا سکیں۔ چونکہ اس حمام میں سبھی ننگے تھے، اس لئے ان قوانین پر سارے بااختیار طبقے کا اتفاقِ رائے ہو گیا۔ غلام جب ہر طرح کی سختیاں برداشت کرنے لگے تو آقاؤں کی ہوس اور بڑھ گئی اور یہ قوانین زیادہ سے زیادہ سخت گیر ہوتے ہوتے ظلم و تعدی کی آخری حدود میں داخل ہو گئے۔

عرب میں، جہاں تک مجھے علم ہے، پہلے پہل حبشہ کے لوگوں کو باقاعدہ غلام بنایا گیا تھا اور یہ اس لئے کہ یہ لوگ سمندر پار سے آکر عربوں پر حملے کرتے رہتے تھے اور اُن کے علاقوں میں آئے دن لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ بعد میں بے گناہ حبشیوں کو بھی غلام بنایا جانے لگا بلکہ حبشی اور غلام تقریباً ہم معنی الفاظ ہو کر رہ گئے۔ پھر غلاموں کی ضرورت اور بڑھی تو کمزور عرب قبیلوں کے لوگوں کو، بے سہارا افراد کو، یہاں تک کہ نہتے مسافروں کو بھی پکڑ پکڑ کر غلام بنایا جانے

لگا۔ سلمان فارسیؓ کے ساتھ بعینہ یہی صورت پیش آئی تھی، وہ اللہ لوگ، تلاشِ حق میں اپنے مرشد کی وصیّت پر موصل سے حجاز کے سفر کو روانہ ہوا تو کچھ رقم دے کر بنو کلب کے ایک قافلے میں شامل ہو گیا۔ چند بھیڑ بکریاں جو اُس کا کل مال و متاع تھا، اُس کے ساتھ تھیں۔ قافلے والوں نے بد معاملگی کی۔ راستے میں پہلے تو اس کی بھیڑ بکریاں کھالیں اور وادی القُریٰ پہنچ کر خود اُسے بھی ایک یہودی کے ہاتھ غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیا۔ اُس یہودی نے اُسے کچھ عرصہ اپنے پاس رکھ کر مدینے کے بنو قریظہ میں اپنے ایک رشتے کے بھائی عثمان بن الاشہل کو بیچ دیا۔ اس طرح یہ مردِ حق مدینے میں وارد ہوا جہاں تاریخ نے اُس کے لئے لازوال عظمت و جلالت کا تاج تیار کر رکھا تھا۔ میرے والد اور والدہ تو شاید محض حبشی ہونے کے ناتے غلام بنالئے گئے تھے۔ شُقران صالحؓ اور عامر بن فہیرہؓ کا بھی اتنا ہی قصور تھا کہ وہ حبشی نژاد تھے۔

زیدؓ کے والد حارثہ یمن کے ایک نہایت معزز قبیلے قضاعہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کی والدہ سعدیٰ مشہورِ زمانہ حاتم طائی کے قبیلے کی ایک شاخ بنو معَن سے تھیں۔ ایک دفعہ وہ اپنے بچےّ کو لئے کر میکے جارہی تھیں کہ راستے میں بنو قین کی ایک جماعت نے غارت گری کی اور زیدؓ کو غلام بنا کر مکےّ لے آئے اور عکاظ کے میلے میں چار سو درہم کے عوض بیچ دیا۔ حکیم بن حزامؓ اُن کے پہلے آقا تھے۔ ثوبانؓ اور یاسرؓ کا تعلق بھی یمن سے تھا۔ یاسرؓ کا ایک بھائی لاپتہ ہو گیا تھا۔ وہ اُس کی تلاش میں اپنے دو بھائیوں حارث اور مالک کے ساتھ مکےّ آئے۔ بھائی تو واپس یمن چلے گئے مگر وہ خود مکےّ میں رہ پڑے، بنو مخزوم کے حلیف ہو کر۔ اُسی قبیلے کے ابو حذیفہ بن المغیرہ کی جاریہ، سُمیّہ بنت خُبّاطؓ سے شادی کر لی۔ انہی کے بطن سے عمارؓ پیدا ہوئے۔ سُمیّہؓ کی نسبت سے یاسرؓ اور عمار کا شمار بھی غلاموں میں ہونے لگا۔ سالمؓ، مولیٰ ابی حُذیفہؓ بھی سلمانؓ فارسیؓ کی طرح فارس نژاد تھے۔ صہیب بن سنانؓ عرب تھے۔ اُن کے والد شاہ فارس

کی طرف سے شہر موصل کے پاس دریائے دجلہ کے کنارے ایک مقام ابلہ میں حاکم تھے۔ رومیوں نے اُن پر شب خون مارا اور صہیبؓ کو جو اُس وقت بچےّ تھے، پکڑ کر لے گئے۔ وہ وہیں رومیوں کے ساتھ پلے بڑھے۔ بعد میں قبیلۂ کلب کے لوگوں نے انہیں خرید لیا اور مکےّ لا کر فروخت کر دیا۔ خبّاب بن ارتؓ بنو تمیم کے اور ابو فکیہہؓ قبیلۂ ازد کے تھے۔ انہیں بھی باہر سے لا کر مکےّ میں فروخت کیا گیا تھا۔

اب غلامی کی حیثیت سزا کی نہیں رہ گئی تھی بلکہ ذی مرتبہ لوگوں کی ضرورت بن کر اُس نے ایک معاشرتی حقیقت کی صورت اختیار کر لی تھی۔ سزائیں تو دیر سویر سے ختم ہو جاتی ہیں مگر اب جو غلامی کا طوق کسی کی گردن میں پڑتا تو پھر موت ہی اُسے اُس بدھن سے آزاد کراتی اور اس نجات دہندہ کے لئے غلاموں کی نظریں اور ہاتھ ہر وقت آسمان کی طرف اُٹھے رہتے۔ غلامی کے اس ہمہ گیر رواج میں تاریخی اور جغرافیائی عوامل کے علاوہ علاقائی اور قبائلی عصبیتیں اور آقاؤں کے ذاتی مزاج کی بداعتدالیاں بھی شامل ہوتی گئیں اور رفتہ رفتہ یہ ایک ایسا ہم رنگِ زمیں جال بن گیا جو کسی کو نظر بھی نہیں آتا تھا، محسوس بھی نہیں ہوتا تھا۔ مراعات یافتہ طبقہ اُسے اپنی روزمرّہ زندگی کا معمول سمجھ کر اُس پر غور بھی نہیں کرتا تھا مگر جن کے لئے یہ جال بچھا تھا اُن کی زندگی میں زہر گھولے رہتا تھا۔ مسئلے کی نوعیّت یوں ہو تو اصلاحِ احوال کا کیا محل ہے۔ حل تو اُس چیز کا ڈھونڈا جاتا ہے جو حل طلب ہو۔ غلامی تو کسی کے نزدیک کوئی مسئلہ تھا ہی نہیں اور جن کے نزدیک تھا وہ مجھ جیسے بے نوا، بے سہارا لوگ تھے جو وقت کے معاشرتی تناظر میں کوئی آواز نہیں رکھتے تھے۔

مکےّ میں، صہیب رومیؓ اپنے روم کے قیام کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ روم میں جبر و استبداد سے تنگ آ کر غلاموں نے اپنے آپ کو ایک غلام کی قیادت میں منظم کیا اور اپنے آقاؤں کے خلاف بغاوت کر دی۔ رومیوں نے اُن کی سر کوبی

کے لئے کئی لشکر روانہ کئے لیکن سر فروش غلاموں کی فوج اس بہادری سے لڑی کہ اُنہیں شکست دے دی، مگر آخری لڑائی میں باوسیلہ آقاؤں کی فوج فتح یاب ہوئی اور غلام ہار گئے۔ غلاموں نے یہ جنگ اپنی آنکھوں میں آزادی کا خواب سجا کر لڑی تھی کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ وہ رومیوں سے نجات حاصل کر کے اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے جائیں گے۔ لیکن ان کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا اور آزادی کی اُس تگ ودو میں ہزاروں غلام اپنی جان کی بازی ہار گئے۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ انسان اکثر رات کی تاریکی میں سانپوں، بچھوؤں اور مہلک حشرات الارض کے قریب سے گزر جاتا ہے مگر چونکہ وہ اُسے دکھائی نہیں دیتے اس لئے، اُس کے دل میں کسی قسم کا خوف نہیں پیدا ہوتا مگر دن کے اُجالے میں اگر وہ ان موذی کیڑوں مکوڑوں کو دیکھ لے تو چھلانگ لگا کر الگ ہو جائے اور مارے خوف کے تھر تھر کانپنے لگے۔ یہی حال غلامی کے انسانیت سوز ماحول کا تھا۔ زمانۂ جاہلیت کی ظلمت میں اس رواج کی ہولناکیاں کسی کو نظر نہیں آتی تھیں مگر جب اسلام کا سورج طلوع ہوا تو اس رواج کے گھناؤنے خدوخال سے بے حسی کا پردہ ہٹ گیا اور اس کی تمام تر کراہت کھل کر سامنے آ گئی۔ انسانوں کے ہاتھوں انسانیت کی تذلیل، اشرف المخلوقات پر اس کے اپنے بھائی بندوں کا جبر، اللہ کی برگزیدہ مخلوق پر غیر اللہ کی حاکمیت، یہ انسانی تاریخ کا وہ شرمناک باب تھا جس کا ہر صفحہ لہولہان تھا، جس کی ہر سطر سے انسانیت کا خون رس رہا تھا۔

مرض کی تشخیص ہو گئی تو اس کا علاج بھی لازم ہو گیا۔ علاج بالضد بھی ہوتے ہیں بالمثل بھی۔ اللہ کے رسول نے مرض کی نوعیت کے پیشِ نظر، چند تحفظات کے ساتھ، علاجِ بالمثل تجویز فرمایا۔ ایک بین بین علاج جس سے مخالفین کو اُس کے خلاف متحد ہو کر صف آرا ہونے کا موقع نہ مل سکے اور مرض رفتہ رفتہ لیکن حتمی طور پر رفع ہو جائے۔ دوسری

صورت یعنی علاج بالضد میں بھی اصلاحِ احوال تو ہو جاتی اور شاید جلدی بھی ہو جاتی مگر دیرپا یقیناً نہ ہوتی۔ روزمرہ کی زندگی میں رچی بسی اس رسم کے خلاف محض ایک حکم امتناعی جاری کر دینے سے، اس رواج سے فائدہ اٹھانے والے بااثر طبقے میں ایک ہیجان برپا ہو جاتا، ایک معاشرتی بحران پیدا ہو جاتا، اُن کے معمولات میں فرق آ جاتا اور غلام آزاد ہو جانے کے بعد بھی ایک معتوب اور قابلِ نفرت اکائی بن کر رہ جاتے۔ اربابِ اختیار کا غصہ انہیں ہمیشہ کے لئے ایک کم تر طبقہ بنا کر رکھ دیتا اور انہیں مکمل ذہنی آزادی دلانے اور اُن کی عام انسانوں کی سی فکری نشوونما کرنے کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو پاتا۔ یہ نوزائیدہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی رسم نہیں تھی کہ یکسر منسوخ کر دی جاتی اور اُس پر کوئی خاص لے دے بھی نہ ہوتی۔ اُس رسم کا تو کسی کے پاس کوئی معقول جواز تھا ہی نہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی بہت سے اہلِ درد اُسے برا سمجھتے تھے مگر اتنی اخلاقی جرأت نہیں رکھتے تھے کہ اُس کے خلاف آواز اٹھائیں۔ غلامی کا معاملہ دوسرا تھا۔ یہ امرا اور مراعات یافتہ طبقے کی عادت ہو گیا تھا۔ اُن کی ضرورت بنا ہوا تھا۔ اُن کے مرتبے اور حیثیت کا اعلان اور اُن کی تسکینِ نخوت کا ذریعہ تھا۔ اس کی اصلاح کے لئے ذہنوں کی اصلاح ضروری تھی۔ اس کے لئے سارے معاشرے کا فکری ارتقا لازم تھا۔ یہ لوگوں کے ضمیر جھنجوڑنے کی بات تھی۔ اُن کے اندر ایک جوت جگانے کا جتن تھا، لہٰذا جو اقدامات یکے بعد دیگرے کئے گئے، اُن کے اثرات گو بتدریج مرتب ہوئے مگر انہیں دوام اور استقلال حاصل ہوا۔ ارشادِ نبوی ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزوں میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اُسے غلاموں کی آزادی سے زیادہ عزیز ہو۔

غلام کو آزاد کرنا ثواب قرار پایا تو لوگوں نے نہ صرف اپنے غلاموں کو آزاد کرنا شروع کر دیا بلکہ خرید خرید کر انہیں آزاد کرانے لگے۔ اُن سے حُسنِ سلوک کا حکم ہوا تو اُن کے لئے لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھرنے لگیں۔ وہ اسلامی مساوات کے رشتے میں پروئے گئے تو عرب کے معزز قبیلوں سے اُن کی رشتہ داریاں اور قرابت داریاں استوار ہو گئیں۔ اُن کے

ساتھ جب انسانوں کا سا تعلق پیدا ہوا تو اُن کا معاشرے کے معزز افراد میں شمار ہونے لگا۔ اُن کی ذہنی تربیت اور نشوونما کی راہیں کھلیں تو انہوں نے اپنی علمیت، اپنی شجاعت، اپنے تقوے اور اپنی قربانیوں سے اسلامی تاریخ کے دفتر بھر دئے۔ انہیں امامت سونپی گئی اور بڑے بڑے ذمہ دار عہدوں پر مامور کیا گیا۔ اُنہیں اسلام کے عظیم معرکوں میں لشکروں کی قیادت عطا ہوئی۔ اُن کی دلجوئی کے لئے حضورؐ نے ابوبکرؓ جیسی مقتدر ہستی کو وعید سنائی۔ اُن کی قدرومنزلت کے اعلان کے لئے آیاتِ قرآنی نازل ہوئیں اور پھر فتح بیت المقدس کے موقع پر چشمِ عالم نے یہ منظر بھی دیکھا کہ غلام اونٹ پر سوار ہے اور عمرِ فاروقؓ، فاتح قوم کے سب سے بڑے امیر اونٹ کی مہار تھامے پیدل شہر میں داخل ہو رہے ہیں۔

غلام

انسانیت اختیار کا نام ہے۔ فعل اور ترکِ فعل دونوں پر برابر قدرت رکھنے کو انسانیت کہتے ہیں۔ غلامی کے دور میں ہماری بے اختیاری نے ہمیں دائرۂ انسانیت ہی سے خارج کر رکھا تھا۔ آزادی کے بعد، بلکہ کئی دن بعد جب آہستہ آہستہ ہمیں اُس کا شعور حاصل ہونے لگا تو ہمارے محسوسات کچھ ایسے تھے جیسے ہم من مانیاں کرنے والے، قدرت کے لاڈلے، بگڑے ہوئے بچے ہوں جو بغیر روک ٹوک کے جو چاہیں کرتے پھریں۔ ایک عجیب احساس تھا جیسے سر پر رکھا ہوا پہاڑ کسی نے اتار کر رکھ دیا ہو اور ہم ہوا کے جھونکوں کی طرح، فضاؤں میں پرواز کرتے ہوئے پرندوں کی طرح، آسمانوں پر تیرتے بادلوں کی طرح اللہ تعالیٰ کی کائنات میں جدھر چاہیں جائیں، جو چاہیں کریں۔ کبھی خوف محسوس ہوتا تھا کہ کہیں ہم اپنی حدود سے تجاوز نہ کر جائیں۔ کبھی ایسا لگتا تھا کہ کہیں یہ سب کچھ ایک سہانا خواب نہ ہو جو صبح ہوتے ہی بکھر جائے۔ میرے ذہن میں اختیار کی پہلی کرن پھوٹنے پر میرے جو

محسوسات تھے، اُن کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ کوئی بھی شخص جس نے خود غلامی کی بیڑیاں نہ پہنی ہوں، اُن محسوسات کا ادراک نہیں کر سکتا۔ میں خود بھی اگر چاہوں کہ آج اتنے عرصے کے بعد اُن کا اعادہ کروں تو شاید نہ کر سکوں۔ بس اتنا یاد ہے کہ اُس شعور کے بیدار ہوتے ہی اللہ کی ساری کائنات مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے لگی جیسے میں واقعی اُس کا حصّہ ہوں، جیسے اُس میں کچھ میرا بھی حصّہ ہے۔ ہر شے وہی تھی مگر نئی نئی لگتی تھی۔ مجھے پہلی بار لگا جیسے میں بھی انسان ہوں اور میری تخلیق کا شاید کوئی مقصد بھی ہے۔ مقصد کیا ہے؟ یہ جاننے میں ابھی کچھ دیر تھی۔

یہ جن لوگوں کے نام میں رواروی میں لے رہا ہوں، کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں۔ ان میں سے ہر شخص اوّلین اشاعتِ اسلام کا ایک ایسا روشن منارہ ہے جس سے جادۂ اسلام کا چپّہ چپّہ منوّر ہے۔ ان میں سے ہر ایک فضیلت و شرف کی رفعتوں پر لہراتا ہوا ایک دائمی پرچم ہے جس نے تاریخِ اسلام کے ہر باب پر سات رنگوں کی دھنک بکھیر رکھی ہے۔

زید بن حارثہؓ، دعوتِ حق پر لبیک کہنے والے پہلے غلام اور پہلے ہی نوجوان، نو دفعہ اسلامی لشکروں کے سپہ سالار بنا کر بھیجے گئے۔ عائشہؓ نے ایک دفعہ کہا تھا جس فوج کشی میں زیدؓ شریک ہوتے تھے، اُس میں امارت کا عہدہ اُن ہی کو عطا ہوتا تھا۔ موتہ کی مہم میں جہاں انہوں نے شہادت پائی، جعفر طیارؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ جیسے جلیل القدر صحابی اُن کے جلو میں تھے۔ رسول اللہؐ نے انہیں اپنا منہ بولا بیٹا بنایا۔ اُن کا خصوصی شرف یہ ہے کہ تمام صحابۂ کرام میں وہ واحد شخص ہیں جن کا نام قرآنِ کریم میں آیا ہے۔ موتہ کی دوسری مہم کے لئے سرورِ کائناتؐ نے اُن کے بیٹے اُسامہؓ کو صغر سنی کے باوجود جیشِ اسلامی کی امارت سونپی جبکہ عمرؓ جیسے اجل صحابی اُن کی فوج میں شامل تھے۔ عمرِ فاروقؓ نے خلافت کا عہدہ سنبھالا تو اُسامہؓ کا وظیفہ اُپنے صاحب زادے عبداللہؓ سے زیادہ رکھا۔ عبداللہؓ نے وجہ دریافت کی تو عمرؓ نے فرمایا:

"یہ اس لئے کہ رسولِ کریمؐ اسامہؓ کو تجھ سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور اس کے والد اُنہیں تیرے والد سے زیادہ محبوب تھے۔"

غزوۂ مریسیع کے موقع پر حضورؐ نے زیدؓ کو مدینے میں اپنی جانشینی کا شرف بخشا۔

عامر بن فہیرہؓ نے ہجرت کے پُر خطر تاریخی سفر میں ان کے ساتھ رہ کر اُن کا وہ اعتماد حاصل کیا جو رہتی دنیا تک سب کے لئے باعثِ رشک رہے گا۔ اُن کی تربیت کا یہ عالم تھا کہ جب سانحۂ بیر معونہ میں جبّار بن سُلمیٰ کلابی کا نیزہ اُن کے سینے سے پار ہوا تو بے ساختہ منہ سے نکلا:

فُزْتُ وَاللّٰہ،

یعنی خدا کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔ جبّار جو اس موقعے پر اپنے آپ کو کامیاب سمجھ رہا تھا کچھ نہ کہہ پایا۔ یہ الفاظ اس جوشِ ایمانی اور جذبۂ یقین کے ساتھ کہے گئے تھے کہ اُن کی گونج اُس وقت تک قاتل کے ذہن کے پردوں سے ٹکراتی رہی جب تک وہ ضحاک بن سفیانؓ سے اُن الفاظ کا مفہوم جان کر مسلمان نہیں ہو گیا۔

شقرانؓ صالحؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے غلام تھے۔ انہوں نے رسولِ کریمؐ کی نذر کر دیا تو حضورؐ نے انہیں آزاد فرما دیا مگر شقرانؓ اپنی خوشی سے حضورؐ کی خدمت پر مامور رہے۔ حضورؐ اُن کی خدمات سے اس قدر خوش تھے کہ وفات کے وقت بطورِ خاص اُن سے حسنِ سلوک کی وصیّت فرمائی۔ رسولؐ کے اہلِ خانہ میں اُن کا مقام یہ تھا کہ خیر الانامؐ کی تجہیز و تکفین میں وہ گھر والوں کے ساتھ شامل رہے۔ جو چادر اُس وقت حضورؐ کے زیبِ بدن تھی، شقرانؓ اُس کو حضورؐ کے جسدِ اطہر کی تدفین تک اپنے ہاتھوں میں تھامے رہے یہاں تک کہ روشنی غروب ہو گئی۔

رسول اللہؐ نے ایک بار فرمایا تھا:

"لوگو! ابوبکر اور عمر کی اقتدا کرو اور عمار کی روش سیکھو"۔

ایک اور موقع پر انہوں نے ارشاد فرمایا تھا:

"اگر عمار کو دو باتوں کے درمیان اختیار دیا جائے تو وہ اُسی بات کو اختیار کریں گے جو بہتر ہوگی"۔

میں نے عبداللہ بن عباسؓ سے سُنا ہے کہ قرآنِ کریم کی یہ آیت عمارؓ ہی کی شان میں نازل ہوئی تھی کہ وہ شخص جو راتوں کو سجدے اور قیام کر کے عبادت کرتا ہے اور آخرت کے خوف سے اپنے رب سے رحمت کی اُمید رکھتا ہے، گناہ گاروں کے برابر نہیں ہو سکتا۔

عمارؓ نے بھی بڑی منزلت پائی۔ ابھی چند روز قبل میں نے سُنا کہ انہیں کوفے کا والی مقرر کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر قدم پر اُن کی رہنمائی فرمائے۔

سلمان فارسیؓ جنہوں نے جنگِ احزاب میں خندق کھودنے کا مشورہ دیا تھا، رہتی دنیا تک افقِ اسلام پر ایک تابندہ ستارے کی طرح جگمگاتے رہیں گے۔ اب تو کسی کو یاد بھی نہیں کہ کبھی وہ غلام بھی تھے۔ سارے صحابہ میں اُن کا بے حد احترام ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے ایک بار فرمایا تھا:

"جنت تین شخصوں کی مشتاق ہے۔ علی، عمار اور سلمان"۔

علیؓ نے ایک بار کہا تھا:

"سلمان ایسا سمندر ہیں جو کبھی خشک نہیں ہوتا"۔

حضورؐ انہیں سلمان الخیر کہا کرتے تھے۔

معاذؓ ابن جبلؓ جیسے جید عالم نے ایک موقع پر اپنے ایک شاگرد سے کہا تھا:

"میرے بعد چار آدمیوں سے علم حاصل کرنا"۔

ان چار میں سلمانؓ کا بھی نام تھا۔ چند ماہ قبل تک تو سلمانؓ مدینے ہی میں تھے لیکن

آج کل سُنا ہے عراق چلے گئے ہیں۔ اُن کے ساتھ گزرا ہوا وقت میری زندگی کا حسین سرمایہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اُن کی راہوں میں خوشیاں بکھیرے رکھے!

ابو فکیہہؓ میری طرح خاندانِ اُمیہ کے غلام تھے۔ یہ کوئلوں کے داغ جو میری پیٹھ پر آپ کو نظر آ رہے ہیں، اُن کی پیٹھ پر بھی تھے۔ اُمیہ نے کوئی ستم مجھ پر ایسا نہیں ڈھایا جو اُس نے ابو فکیہہؓ پر بھی نہ آزمایا ہو۔ اُن کو بھی ابوبکرؓ نے اُس حال میں خرید کر آزاد کرایا جب اُمیہ انہیں کوڑے مار مار کر مردہ سمجھ بیٹھا تھا۔ وہ دوسری ہجرتِ حبشہ میں شامل تھے لیکن سخت ترین مصائب جھیلنے کی وجہ سے اُن کے اعضا میں اضمحلال پیدا ہو گیا تھا اور وہ غزوۂ بدر سے پہلے ہی انتقال کر گئے مگر ہمیشہ کے لئے اپنی پامردی اور استقامت کی مثال چھوڑ گئے۔

سالمؓ، مولیٰ ابی حذیفہؓ قرأت اور صوت کے امام تھے۔ خوش الحانی کا یہ عالم تھا کہ خود زبانِ نبوت نے اُن پر فخر کیا۔ ایک دفعہ عائشہؓ صدیقہ آنحضرتؐ کے پاس آ رہی تھیں کہ راہ میں رک گئیں۔ حضورؐ نے دیر سے آنے کا سبب دریافت فرمایا تو کہنے لگیں ایک شخص تلاوتِ قرآن کر رہا تھا میں اُس کو سننے لگی۔ حضورؐ کو بھی اشتیاق ہوا اور ردائے مبارک شانوں پر ڈال کر باہر تشریف لے گئے۔ دیکھا تو سالمؓ قرأت کر رہے تھے، انہیں سُن کر حضورؐ نے ارشاد کیا:

"ساری تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے میری اُمت میں تم جیسے لوگ پیدا کئے ہیں"۔

اُن کی قدر و منزلت کا اندازہ اس سے بھی لگایئے کہ ایک دفعہ عمرِ فاروقؓ نے اپنے چند ساتھیوں سے کہا کہ تم لوگ کسی چیز کی تمنا کرو۔

ایک نے کہا:

"میری تمنا ہے کہ یہ گھر سونے سے بھرا ہو اور میں اُسے راہِ حق میں صدقہ کر

دوں"۔

دوسرے نے کہا:

"کاش! یہ گھر جواہرات سے بھر جائے اور میں انہیں اللہ کی راہ میں لٹا دوں"۔

پھر امیر المومنین نے پوچھا: "کوئی اور تمنا، تو سب خاموش ہو گئے۔ اس پر عمرؓ نے کہا:

"میری تمنا ہے کہ یہ گھر ابو عبیدہ بن الجراحؓ، معاذ بن جبلؓ، حذیفہ بن الیمانؓ اور سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہؓ جیسے بزرگوں سے بھرا ہو"۔

امتِ مسلمہ میں سالمؓ کے علم و فضل کی یہ پذیرائی تھی کہ وہ مسجدِ قبا کے پیش امام تھے جہاں اجلّ صحابہ اکثر اُن کے اقتدار میں نماز ادا کرتے تھے۔ ان میں ابو بکرؓ اور عمرؓ جیسی ہستیاں بھی شامل تھیں۔

ثوبانؓ بھی میری طرح ہمیشہ بارگاہِ نبوی میں رہتے تھے۔ حضورؐ اُن کو اپنے اہلِ بیت میں شمار کرتے تھے۔ آنحضرتؐ کے وصال کے بعد وہ کچھ دن مدینے میں رہے، پھر شام چلے آئے اور آج کل یہیں رملہ کے علاقے میں رہتے ہیں۔ حضورؐ کی نسبت سے اُن کا اس قدر احترام ہے کہ ایک دفعہ حمص میں بیمار پڑ گئے۔ وہاں کا گورنر اُن کی عیادت کو نہ آیا تو اُسے شکوے کا خط لکھ بھیجا۔ گورنر اُن کی تحریر دیکھ کر لرز گیا اور جس حالت میں بیٹھا تھا اُسی حالت میں اٹھ کر اُن کے گھر گیا اور دیر تک مزاج پُرسی کرتا رہا۔

دعوتِ توحید پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے بزرگوں میں جہاں ابو بکرؓ اور عثمانؓ جیسے بزرگانِ قریش کے نام آتے ہیں، وہاں چند ایسے غلاموں کا بھی ذکر ہے جن کے اعمال و اطوار ہمارا سرمایۂ افتخار ہیں۔ صہیب بن سنانؓ انہیں میں سے ایک ہیں۔ اُن کے رومی لہجے کی وجہ سے حضورؐ ازراہِ التفات فرمایا کرتے تھے:

"صہیب روم کا پھل ہے"۔

وہ تیر اندازی اور شمشیر زنی کے بہت بڑے ماہر مانے جاتے ہیں۔ سارے غزوات میں حضورؐ کے ہمرکاب رہے۔ ایک دفعہ صہیبؓ، سلمانؓ اور میں کھڑے تھے کہ ابو سفیان کا اُدھر سے گزر ہوا۔ یہ ان کے اسلام لانے سے پہلے کی بات ہے ہمارے مُنہ سے بے ساختہ نکلا:

"اللہ کی تلوار نے پتا نہیں کیوں اب تک اس دشمنِ دیں کی گردن نہیں اڑائی"۔

ابو بکرؓ بھی اُدھر سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے ہماری بات سُن کر کہا:

"تم لوگ قریش کے بزرگوں کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہو"۔

یہ کہہ کر وہ حضورؐ کے پاس گئے اور اُنہیں سارا ماجرا سنایا۔ حضورؐ نے فرمایا:

"ابو بکر، تم نے شاید انہیں خفا کر دیا ہے اور اگر یہ سچ ہے تو تم نے اپنے اللہ کو ناراض کر دیا"۔

یہ سُن کر ابو بکرؓ الٹے پاؤں ہمارے پاس آئے اور جب تک ہم نے یہ نہیں کہہ دیا کہ ہم ناراض نہیں ہوئے، واپس نہیں گئے۔ یہی وہ وعید تھی جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔

ایسے ہی ایک مرتبہ مدینے میں، میں، سلمانؓ، صہیبؓ، عمارؓ اور خبابؓ بن ارتؓ رسولِ کریمؐ کے پاس بیٹھے تھے کہ الاقرع بن حابس التمیمی اور عیینہ بن حصن الفزاری اپنے وفود کی آمد کی اطلاع لے کر حاضر ہوئے۔ ہمیں دیکھ کر وہ حقارت سے پیچھے ہٹ گئے اور حضورؐ سے کہنے لگے ہم اس بات میں شرم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ آنے والے عرب شرفا آپ کو ان غلاموں کے ساتھ بیٹھا دیکھیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ جب ہمارے وفود یہاں پہنچیں تو یہ لوگ آپ کے پاس نہ ہوں۔ ہم لوگ یہ سُن کر فوراً وہاں سے اُٹھ کر کچھ فاصلے پر جا بیٹھے۔ اُسی وقت سورۃ انعام کی یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

"اُن لوگوں کو نہ نکالئے جو اپنے پروردگار کو صبح وشام پکارتے ہیں،
محض اُس کی رضا کے لئے۔
آپ کے ذمے اُن کا ذرا بھی حساب نہیں
اور نہ اُن کے ذمے آپ کا ذرا بھی حساب ہے
جس سے آپ انہیں نکالنے لگیں
اور آپ کا شمار بے انصافوں میں ہو جائے"۔

اس کے بعد حضورؐ نے ہم پر سلامتی بھیجی اور ہمیں بلا کر پھر پاس بٹھا لیا۔ اتنے قریب کہ ہمارے گھٹنے اُن کے گھٹنوں کو چھونے لگے۔ خاصی دیر پاس بٹھائے رکھنے کے بعد وہ اٹھ کر جانے لگے تو جبریل امین دوبارہ حاضر ہوئے اور سورۂ کہف کی آیت نازل ہوئی۔

"آپ اپنے آپ کو اُن لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجیے
جو اپنے پروردگار کو محض اُس کی رضا جوئی کے لئے پکارتے ہیں۔
اور دنیاوی زندگی کی رونق کے خیال سے اپنی آنکھوں کو اُن پر سے نہ ہٹائیے۔
اور اُس کا کہنا مانئے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے۔
وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے۔
اُس کا معاملہ حد سے بڑھا ہوا ہے۔
اور آپ کہہ دیجئے کہ حق پروردگار کی طرف سے آچکا ہے۔
جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کافر رہے"۔

اس کے بعد ہم حضورؐ کی ہدایت پر ہمیشہ اُن کے بالکل قریب ہو کر بیٹھنے لگے۔

صہیبؓ مکے سے ہجرت کرنے والوں میں آخری مرد تھے جو علیؓ کے ساتھ آئے۔ سخت گرمیوں کے طویل سفر کی صعوبتیں سہتے سہتے جب وہ قُبا پہنچے تو اُن کی ایک آنکھ آشوب کر

آئی تھی۔ حضورؐ سے ملنے کے لئے کلثوم بن ہدمؓ کے مکان پر پہنچے تو کھجوروں کا نقل ہو رہا تھا۔ صہیبؓ کئی دن کے فاقے سے تھے، بھوک کی شدت سے بیتاب تو تھے ہی، جلدی جلدی کھجوریں کھانی شروع کر دیں۔ حضورؐ اُن سے بہت التفات فرماتے تھے۔ انہوں نے دیکھا تو ازرہِ تلطف فرمایا:

"صہیب، تمہاری آنکھ آئی ہوئی ہے اور تم کھجوروں پر کھجوریں کھائے چلے جا رہے ہو"۔

صہیبؓ نے جن کی حِس مزاح بہت تیز تھی، برملا جواب دیا:

"حضورؐ میں اُس آنکھ کی طرف سے کھا رہا ہوں جو ٹھیک ہے"۔

اس حاضر جوابی پر حضورؐ بے ساختہ ہنس پڑے۔

اُن کی باتیں چھڑ گئی ہیں تو اِس وقت وہ بہت یاد آرہے ہیں کیا باغ و بہار شخصیت پائی ہے۔ خدا انہیں ہمیشہ اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ اُن سے آخری ملاقات مدینے میں ہوئی تھی، جب میں حضورؐ کے روضے پر حاضری دینے گیا تھا۔

ابو رافعؓ، جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، عباسؓ کے غلام تھے، اُنہوں نے رسالت مآبؐ کی خدمت میں پیش کر دیا تو حضورؐ نے اُنھیں آزاد کر دیا۔ آزادی کے بعد بھی انہوں نے میری طرح اپنی زندگی کا بہترین مصرف یہی سمجھا کہ خود کو سرورِ عالمؐ کی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔ حضورؐ نے اُن سے اتنا پیار کیا، اتنی فضیلت عطا کی کہ انہیں اپنے خاندان کا فرد بنا لیا۔ آج بھی جس کا جی چاہے مدینے جا کر دیکھ لے کہ ایک سابق غلام کا کیا احترام ہے۔ کیسے لوگ اُن کی راہوں میں آنکھیں بچھا رہے ہیں۔

میں خود آپ کے سامنے ہوں۔ ہجرت مدینہ کے کچھ عرصہ بعد میں نے اپنا گھر بسانا چاہا مگر حالت میری یہ تھی کہ شادی کی مطلق استطاعت نہیں تھی۔ نہ زمین، نہ مکان،

نہ مال و دولت، نہ آمدنی کا کوئی مستقل وسیلہ۔ میرا حسنِ ظاہری تو آپ کے سامنے ہے۔ سیاہ فام رنگت، موٹے موٹے ہونٹ، لاغر بدن، عمر بھی چالیس سال سے بڑھ چکی تھی لیکن جوں ہی میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو مجھ حبشی زادے کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ تمام مہاجرین اور انصار نے جو شرفائے عرب کی جان تھے، اپنے دیدہ و دل میرے لئے فرشِ راہ کر دئے، یہاں تک کہ میرے لئے رشتے کا انتخاب کرنا مشکل ہو گیا۔ رنگ و نسل اور حسب نسب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے عرب معاشرے میں یہ ایک عظیم انقلاب تھا جس کا چند برس پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

رسول کریمؐ کے وصال کے بعد ہمیں اُن کے بغیر مدینے کے گلی کوچے سُونے لگنے لگے تو میں نے اور عبداللہ بن مسعودؓ نے کہیں اور جا بسنے کی باتیں شروع کر دیں۔ ابن مسعودؓ بھی گزشتہ دس سال سے حضورؐ کی خدمت میں تھے اور مجھے اپنے مواخاتی بھائی ابو رویحہؓ کی طرح عزیز تھے۔ وہ تو کہیں نہیں گئے، وہیں مدینے ہی میں عزلت نشیں ہو گئے، مگر میں نے سوچا کہ اسلام میں جہاد کا بڑا ثواب ہے کیوں نہ باقی زندگی اسی کارِ خیر میں گزار دی جائے، چنانچہ میں خلیفۂ وقت ابو بکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن سے جہاد پر جانے کی رخصت طلب کی۔ میرے اور ابو بکرؓ کے تعلق کا تو آپ کو علم ہے، میں تفصیل سے بتا چکا ہوں۔ اس تعلق کے تناظر میں میری بات پر ذرا غور کیجئے گا اور یہ بھی یاد رکھئے گا کہ وہ خلیفۂ وقت تھے۔ تمام اسلامیانِ عالم کے سربراہ! انہوں نے جو مجھ پر ہزار حق جتا سکتے تھے، محض اپنی ضعیفی کا واسطہ دے کر مجھے روکا۔ کہنے لگے بلال، مجھے اس عمر میں تمہاری رفاقت کی ضرورت ہے۔ نہ اپنے جلیل القدر منصب کا استعمال فرمایا، نہ اپنا کوئی ذاتی احسان جتایا۔ یہ تھا محمدؐ کی تعلیم کا اثر کہ سلطنتِ اسلامیہ کا سب سے مقتدر شخص، ایک ادنیٰ غلام کو اپنی رائے رکھنے کا مکمل حق دے رہا تھا۔ اپنی بات منوانے کے لئے اسے برابر کا درجہ دیتے ہوئے منت سماجت کا لہجہ اختیار کر رہا تھا۔ عبداللہ بن مسعودؓ، میں نے سُنا ہے، ابھی چند روز ہوئے کوفے کے قاضی مقرر ہو گئے ہیں۔ یہ اُن کے تبحرِ علمی کا اعتراف ہے اور اس بات کا بھی کہ اسلام میں فضیلت کا معیار تقویٰ اور محض تقویٰ ہے۔ نہ نسلی برتری، نہ خاندانی شرف۔

شام کے معرکوں میں ایک موقع پر عمر فاروقؓ اپنے سپہ سالاروں کے ساتھ بیٹھے تھے اور چند اہم فوجی معاملات پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میں بھی موجود تھا۔ میرے ذہن پر کچھ بوجھ تھا۔ میں نے انہیں پکار کر کہا:

"یا امیر المومنین! یہ لوگ جو آپ کے دائیں بائیں بیٹھے ہیں، واللہ یہ لوگ عیش پرستی میں پڑ گئے ہیں۔ یہ پرندوں کا گوشت کھاتے ہیں جبکہ عام مسلمانوں کو دو وقت کا کھانا بھی میسّر نہیں"

عمرؓ نے میری آواز سنی تو مجھ سے مخاطب ہوئے۔ قیس بن ابی حازمؓ میرے سامنے کھڑے تھے۔ خلیفۃ المومنین کو مجھ سے مخاطب ہوتے دیکھا تو سامنے سے ہٹ گئے۔ امیر المومنین فرمانے لگے:

"یا بلال، بیشک آپ سچ کہتے ہیں۔ میں اُس وقت تک یہاں سے نہیں اٹھوں گا جب تک ہر مسلمان کے لئے مٹھی بھر جو، سرکہ اور زیتون کے تیل کا بندوبست نہیں ہو جاتا"

اُن کے مُنہ سے یہ الفاظ سنتے ہی اطراف میں بیٹھے ہوئے اُمرا نے اس کفالت کو قبول کر لیا۔ کس نے دی تھی ایک غلام زادے کو یہ جرأت کہ وہ بھرے دربار میں یوں امیر المومنین سے مخاطب ہو۔ کس نے دیا تھا حاکمِ وقت کو یہ حوصلہ کہ وہ اُس کا اعتراض اس خندہ پیشانی سے سُنے۔

یہ باتیں جو میں کر رہا ہوں کوئی قصۂ پارینہ نہیں، دورِ حاضر کی جیتی جاگتی کہانی ہے۔ عصرِ رواں کی ایک زندہ روایت ہے۔ میں دمشق کے نکتہ دانوں ہی کو نہیں، کُل اہلِ نظر کو غلامانِ اسلام کی زندگیوں کا بغور مطالعہ کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ وہ خود دیکھیں کہ اسلامی معاشرے نے سابق غلاموں کو کس طرح پروان چڑھایا، اُن کی کشتِ فکر کی کس طرح آبیاری کی، اُن کی شخصیتوں کو کیسی جلا بخشی، کس طرح اُن کی ذہنی نشوونما کی اور کس کس انداز سے اپنی محبت، اپنا خلوص اور اپنا اعتماد اُن پر نچھاور کیا۔ ہر شخص خود اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ سابقہ غلاموں کی زندگی میں کوئی ایک لمحہ، کوئی ایک چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی ایسا دکھائی دیتا ہے جہاں اُن سے کسی قسم کا کوئی تعصب برتا گیا ہو، کوئی خصوصی برتاؤ، کوئی سلوک جو مساواتِ محمدی کے اصولوں کے منافی محسوس ہو! جس نے اپنے آپ کو جس شرف کا اہل ثابت کر دیا، وہ اُسے عطا ہو گیا اور بالکل ایسے جیسے کسی برابر والے کو اُس کا حق دیا جاتا ہے۔ ایسے نہیں کہ اُس میں کسی لطفِ خاص یا بخششِ بے جا کا شائبہ ہو، جس سے اُن کی توقیر میں اُن کی تذلیل کا پہلو نکلتا ہو۔ یہ بھی نہیں ہوا کہ اُن کا جائز مقام دینے میں کوئی حیل وحجت ہوئی ہو یا کسی قسم کا کوئی ذہنی تحفظ برتا گیا ہو۔

دوسرے معاشروں میں بھی آقا خوش ہو کر غلاموں کو انعام واکرام سے نوازتے رہتے ہیں مگر ہزار عنایات کے باوجود غلاموں کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا جاتا کہ وہ اُن کے برابر ہو گئے ہیں۔ اسلام کی صورتِ حال یہ ہے کہ ہم غلاموں میں سے کوئی اگر عادتاً بھی خود کو کمتر بنا کر پیش کرتا تو اُسے ہر طریقے سے یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی کہ اُس میں اور دیگر انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ کوشش اُس وقت تک جاری رہتی جب تک کہ ہم واقعی اپنے آپ کو آزاد سمجھ کر اپنے طرزِ عمل سے اس کا ثبوت نہ مہیا کر دیتے اور سب کو یقین نہ ہو جاتا۔ معاشرتی دھارے میں ہم غلاموں کا اس طرح گھل مل جانا، زندگی کے سفر

میں سب کے ساتھ یوں شانہ بہ شانہ چلنا، سماجی ماحول میں مکمل مساوات کے ساتھ رچ بس جانا، غلاموں کے بارے میں اسلام کی حکمتِ عملی کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ راہ کٹھن تھی مگر حضورؐ کی تربیت نے ایسی مشعلیں روشن کر دیں کہ آسان ہو گئی۔ اسلام کے پرچم تلے جمع ہونے والے مجھ ایسے مسکینوں، غلاموں کو ہمارے دشمن اکثر طنزاً کہا کرتے تھے:

"یہ ہیں وہ ہستیاں جنہیں عرب وعجم کی حکمرانی سونپی جائے گی؟ یہ لوگ بنیں گے مصر وروم کے سردار؟"

ہزار طرح کی جاہلانہ عصبیتیں ابھاری جاتی تھیں مگر ایمان والوں کے قول وفعل سے ریت کے یہ گھروندے اپنے آپ گرتے گئے۔ کسی نے اُن کی باتوں کا اثر نہیں قبول کیا۔ زیردستوں پر اسلام کے نظامِ عدل واحسان کے فیوض وبرکات کا سایہ بدستور قائم رہا اور ہمارے بدخواہوں نے اپنے استہزاء کا جواب خود تاریخ کی زبان سے سُن لیا۔

میں رہن رکھا گیا

غزوات کا سلسلہ شروع ہوُا تو بدر سے لے کر تبوک تک مجھے اِن کی ہمرکابی کا شرف حاصل رہا۔ عیدین اور استسقا کے موقعوں پر میں نیزہ لے کر اُن کے آگے آگے چلتا۔ میں اُن کے گھر کا مدار المہام تھا۔ سودا سلف لانا، اُن کے مہمانوں کی خاطر تواضع کرنا میری ذمے داری تھی۔ کئی بار گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہوتا اور نہ کوئی ایسی چیز جس کو بیچ کر یا گروی رکھ کر خورد و نوش کا سامان لایا جاسکے۔ ایسے موقعوں پر وہ فاقے رہتے اور اُن کے ساتھ میں بھی فاقہ کرتا۔

مدینے میں وفود کی آمد کا سلسلہ لگا رہتا تھا۔ آئے دن کسی نہ کسی وفد کی آمد ہوتی۔ بعض وفود بہت اہم ہوتے تھے۔ ان سب کی خاطر مدارات اور مہمان داری میں مجھے عام حالات سے زیادہ تگ و دو کرنی پڑتی تھی۔ ایک مرتبہ آج سے کوئی دس سال پہلے نجران سے ایک وفد رسولِ کریمؐ سے چند اہم امور پر بات چیت کے لئے آیا تو آپ نے مجھے اُن کے

کھانے پینے کا انتظام کرنے کا حکم دیا۔ حکم مل چکا تھا، تعمیل لازم تھی۔ گھر میں رقم کا ہونا یا نہ ہونا سرورِ عالمؐ کے لئے کوئی قابلِ اعتنا مسئلہ نہیں تھا۔ اور نہ ہی اُن چیزوں سے وہ کوئی سروکار رکھتے تھے جو روپے پیسے سے خریدی جاتی ہیں۔ یہ میرا کام تھا۔ اِس وقت گھر کی مالی صورت یہ تھی کہ کوئی چیز ایسی موجود نہیں تھی جن سے مہمانوں کی تواضع ہو سکے اور نہ ہی کوئی رقم، کہ بازار سے کچھ لے آتا۔ گھر کا جو جو سامان گروی رکھا جا سکتا تھا پہلے ہی سے مدینے کے مشہور مشرک تاجر لُبیہہ کے پاس رہن تھا۔ لُبیہہ نے ایک بار مجھے کہا تھا کہ بلال تمہیں جب قرض کی ضرورت ہو مجھ سے لے لیا کرو۔ چنانچہ میں اُسی کے پاس چیزیں رہن رکھ کر حسبِ ضرورت قرض لیتا رہتا تھا۔ اس وقت مشکل یہ آن پڑھی تھی کہ رہن رکھنے کو کچھ نہ تھا۔ خیر، میں ہمت کر کے اُس کے پاس گیا اور اُس سے اُدھار کی درخواست کی مگر اُس نے ضمانت کے بغیر قرض دینے سے صاف انکار کر دیا۔ منت سماجت کا بھی کوئی اثر نہ ہؤا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ میرے اپنے پاس کیا تھا جو میں ضمانت کے طور پر پیش کرتا۔ میں نے اپنے آپ کو اُس کے پاس گروی رکھ دیا اور سودا سلف خرید لایا۔ شرط یہ طے ہوئی کہ اگر ایک ماہ کے اندر رقم واپس نہ ہوئی تو میری ذات پر اُس کا حق ہوگا۔

مہمانوں کی دعوت ہو گئی۔ میرے انتظامات کو سراہا گیا اور شکر ہے وقت ٹل گیا مگر ساتھ ہی مجھے اپنی فکر لگی ہوئی تھی۔ دن یونہی ایک ایک کر کے گزرتے گئے۔ کہیں سے قرض چکانے کا بندوبست ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ میں اندر ہی اندر سخت پریشان تھا مگر حضورؐ سے ذکر نہیں کیا تھا۔ ایک دن میں عشا کی اذان کے لئے وضو کر رہا تھا کہ لُبیہہ اپنے چند دوستوں سمیت اُدھر سے گزرا اور اُس نے نہایت درشت، حقارت آمیز لہجے میں مجھے پکارا:

"ارے او حبشی!"

میں نے اس بدکلامی کی وجہ دریافت کی تو کہنے لگا:

"پتا ہے کتنے دن رہ گئے ہیں ایک مہینے میں، صرف چار راتیں باقی ہیں۔ چار راتیں! پھر میں تجھ سے وہ حاصل کروں گا جو میرا تیری طرف نکلتا ہے اور کسی خوش فہمی میں نہ رہنا۔ میں کوئی لحاظ مروت نہیں کروں گا۔ نہ تجھ سے نہ تیرے صاحب سے۔ میں نے تجھے قرض دیا ہی اس لئے تھا کہ تو چکا نہ سکے اور غلام بن جائے جیسا تو پہلے تھا۔ پھر میں تجھ سے اپنی بھیڑ بکریاں چرواؤں گا۔ یاد رکھنا بلال، مجھ سے کسی رورعایت کی توقع نہ رکھنا"۔

یہ کہہ کر وہ تو چلا گیا مگر میں بہت زیادہ فکر مند ہو گیا۔ رسولِ کریمؐ اور صحابۂ کرامؓ کے ساتھ رہتے رہتے مجھے اس قسم کی بد اخلاقی اور بدتمیزی کی باتیں سننے کی عادت نہیں رہی تھی۔ طبیعت پر بہت بوجھ محسوس ہونے لگا۔ وہاں سے اٹھ کر میں نے اذان دی۔ دو نفل ادا کئے اور سوچنے لگا کہ حضورؐ کو کن الفاظ میں اپنی مصیبت کا حال سُناؤں۔

عشا کی نماز کے بعد جب رسول اللہؐ گھر جانے لگے تو میں نے اُن سے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ میں نے اُن سے یہ بھی درخواست کی کہ اگر وہ اجازت دیں تو میں راتوں رات مدینے سے باہر چلا جاؤں اور صحرا میں روپوش ہو جاؤں۔ انہوں نے ہنستی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور کہا:

"تم جاؤ اور سو جاؤ، کہیں جانے کی ضرورت نہیں"۔

سونے کو تو میں سو گیا مگر نیند میں بھی پریشانی رہی۔ دوسری رات پھر میں نے اِن سے وہی درخواست کی۔ اس مرتبہ بھی انہوں نے وہی جواب دیا۔ تیسری رات بھی یہی ہؤا۔ اب صرف ایک دن باقی تھا اور ایک رات۔ رقم کا حال مجھ سے زیادہ کون جانتا تھا۔ کہیں سے فوری کچھ آنے کی توقع نہیں تھی۔ دن تو جوں توں کام کاج میں گزر گیا مگر شام ہوتے ہوتے

میری حالت خاصی دگرگوں ہوگئی۔ مغرب کے بعد دُعا مانگی، عشا کے بعد دُعا مانگی اور پھر اپنی فکر میں ڈوب گیا۔ حضورؐ سے بھی ہر روز ایک ہی بات کئے جانے کی ہمت نہیں تھی۔ عشا کے بعد وہ کچھ دیر مسجد میں ٹھہرے اور جاتے جاتے جیسے انہوں نے میرے چہرے سے میرا سوال پڑھ لیا۔ کہنے لگے: "جاؤ بلال آرام کرو"۔

اُن کے حکم کے مطابق میں آکر اپنے بستر پر لیٹ گیا مگر نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ کیا واقعی آج کی رات میری آزادی کی آخری رات تھی۔ پھر میں نے اپنے آپ کو اپنی غلامی کے دور میں محسوس کیا۔ اب میرا آقا لبیبہ تھا۔ وہی ظلم، وہی تشدد، وہی میری کس مپرسی۔ پھر خیال آتا کہ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کو اگر یہ منظور ہوتا تو مجھے آزادی عطا ہی کیوں کرتا۔ اسی ادھیڑبن میں رات گزر گئی۔ علی الصبح بلکہ اس سے بھی پہلے ابھی رات کا آخری پہر ہی تھا کہ ایک آدمی نے مجھے آواز دے کر باہر بلایا۔ یہ آدمی حاکمِ فدک کی طرف سے رسولِ کریمؐ کے لئے تحائف لے کر آیا تھا جو چار اونٹوں پر لدے ہوئے تھے۔ تحائف میں کپڑا اور اجناس کے علاوہ کچھ رقم بھی تھی۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے حضورؐ کو بے وقت ہی جگا کر انہیں اطلاع دے دی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا:

"الحمد للہ، لبیبہ کی رقم ادا کر دو اور کچھ زیادہ بھی دے دینا کیونکہ اُس نے بہت انتظار کیا ہے"۔

اونٹوں سے سامان اُتارتے اُتارتے اذان کا وقت ہو گیا۔ فجر کی نماز کے بعد میں بقیع کی سمت نکل گیا اور زور زور سے اعلان کیا کہ جس جس کو حضورؐ سے کوئی قرض وصول کرنا ہو وہ لے جائے۔ ایک ایک قرض خواہ کی ایک ایک پائی چکانے کے بعد میں رسولِ کریمؐ کے پاس گیا۔ وہ مسجد میں محرابِ نبویؐ کے پاس ابوبکرؓ سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے تمام قرض چکا دیئے ہیں اور اب کسی کا کچھ واجب الادا نہیں ہے۔ حضورؐ

نے اللہ اکبر کہا اور فرمانے لگے:

"کچھ باقی بھی بچا ہے۔؟"

میں نے کہا:

"دو دینار"

فرمایا:

"انہیں بھی اللہ کی راہ میں خرچ کر دو"۔

یہ واقعہ میں نے ابھی چند روز قبل حلب میں عبداللہؓ الھوزنی کو بھی سنایا تھا۔ وہ مجھ سے حضورؐ کے 'انفاق' کے کچھ واقعات پوچھنے آئے تھے۔

اپنی ناداری کے باوجود جہاں کہیں سے جو کچھ مجھے میسّر آجاتا اُس کا ایک حصّہ میں ضرور مُحسنِ عالمؐ کے لئے بچا کر رکھتا تھا۔ ایک دفعہ وہ انسؓ سے محوِ گفتگو تھے۔ اسلام کے اولین دنوں میں کفّار کے مظالم کا ذکر ہو رہا تھا۔ فرمانے لگے:

"ایک موقع پر تیس راتیں اور تیس دن مجھ پر ایسے گزرے ہیں کہ میرے اور بلال کے پاس کھانے کی کوئی چیز ایسی نہ تھی جسے کوئی جاندار کھا سکے، سوائے اُس کے جو بلال کہیں نہ کہیں سے لا کر رکھ ڈھک چھوڑتا تھا"۔

ایک مرتبہ میں نے کچھ برنی کھجوریں اُن کی خدمت میں پیش کیں۔ یہ کھجوروں کی ایک نہایت خوش ذائقہ قسم ہے جو عام طور پر نہیں ملتی۔ انہوں نے دیکھا تو حیرت سے کہنے لگے:

"بلال یہ کہاں سے؟"

میں نے عرض کیا:

"میرے پاس دو صاعہ عام کھجوریں تھیں، اُن کے عوض کسی سے یہ

ایک صاعہ کھجوریں لی ہیں، آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے"۔

سُن کر فرمانے لگے :

"ارے بلال تم نے تو غضب کردیا۔ یہ تو رِبا ہو گیا۔ تمہیں چاہئے تھا کہ پہلے تم اپنی کھجوروں کو بیچتے، پھر اُن کی قیمت سے یہ خریدتے"۔

کتنا سیدھا سچا طریقہ تھا اُن کا تعلیم دینے کا، بات سمجھانے کا۔ ایک ایک لفظ دل میں گھر کر جاتا تھا اور طبیعت پر کوئی بوجھ نہیں محسوس ہوتا تھا۔

ایسے ہی ایک بار حضورؐ میرے پاس میرے حجرے میں تشریف لائے تو دیکھا کہ میرے پاس کھجوروں کا ڈھیر رکھا ہے۔ فرمانے لگے :

"بلال یہ کیا؟"

میں نے عرض کیا :

"مہمان داری کے لئے جمع کی ہیں"۔

کہنے لگے :

"بلال تمہیں جہنّم کی آگ سے ڈر نہیں لگتا۔ جاؤ انہیں اللہ کی راہ میں خیرات کرو اور یہ خیال دل میں نہ لاؤ کہ تمہارے پاس کوئی کمی ہو جائے گی"۔

حضورؐ کے خاندان کے علاوہ غریب الدیّار نو مسلموں کے کھانے پینے کا بندوبست بھی میرے ذمّے تھا۔ ان لوگوں کے لئے مسجدِ نبویؐ کے ایک حصّے میں ایک چبوترا بنا دیا گیا تھا۔ ان کا کوئی ذریعۂ معاش نہیں تھا اور یہ دیگر اہلِ ایمان کے عطیات، خیرات اور صدقات پر گزر کرتے تھے۔ یہ لوگ اہلِ صُفّہ کہلاتے تھے اور اکثر اوقات فاقوں سے دوچار رہتے تھے۔

ایسے موقعوں پر حضورؐ خود بھی اُن کے ساتھ فاقہ فرماتے تھے۔ دراصل اصحابِ صُفّہ کی کفالت سارے مسلمانوں کے ذمّے تھی مگر رسالت مآبؐ انہیں اپنے اہلِ خاندان جیسا ہی سمجھتے تھے اور ہر ممکن طور پر اُن کی دیکھ بھال فرماتے تھے۔ اُن کو اپنے گھر سے کھانا کپڑا وغیرہ بھجواتے رہتے تھے۔ مالِ غنیمت میں بھی اُن کا باقاعدہ حصّہ رکھتے تھے۔ حضورؐ نے میرے علاوہ فاطمہؓ کو بھی ان کی خبر گیری پر مامور کیا ہوا تھا۔ ہم ہر روز حضورؐ کو اُن کے مسائل اور مشکلات سے آگاہ کرتے اور حتی الوسع اُن کی خدمت انجام دیتے رہتے۔ فاطمہؓ کے عقد کے بعد اس ذمّے داری میں میرے ساتھ اُم ایمنؓ اور اُم کلثومؓ پیش پیش تھیں۔ اُن کے علاوہ اُمِ سُلیمؓ اور اُن کے بیٹے انسؓ، ابو طلحہؓ، ابن مسعودؓ، ابو رافعؓ اور عثمان بن مظعونؓ کی بیوہ خولہؓ بھی اس کام میں ہاتھ بٹاتے رہتے تھے۔

رسولِ کریمؐ کو اہلِ صفّہ کا اتنا خیال تھا کہ ایک مرتبہ جب فاطمہؓ نے روز کی محنت مشقت سے تنگ آکر اُن سے ایک غلام کا سوال کیا تو انہوں نے فرمایا :

"یہ ممکن نہیں۔ میں آج کل اصحابِ صفّہ کے کھانے پینے کے سلسلے میں فکر مند ہوں۔ میں کچھ کر سکتا تو پہلے اُن کی مدد کرتا۔ تم رات کو سوتے وقت، سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر کی تسبیح پڑھا کرو۔ پریشانی ختم ہو جائے گی"۔

فاطمہؓ جو اہلِ صفّہ کی فاقہ کشی اور مفلوک الحالی سے خود بھی واقف تھیں، خاموش ہو رہیں۔

حضورؐ کے گھر کا پانی بھرنا بھی میرا کام تھا۔ کبھی کبھار کھانا پکانے میں بھی مدد دے دیا کرتا تھا۔ اور آٹا تو اکثر میں ہی گوندھا کرتا تھا۔ حضورؐ خود بھی کبھی کبھی آٹا گوندھ دیا کرتے تھے۔ بلکہ وہ اکثر اُمہات المومنین کے ساتھ گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ اللہ کے رسولؐ کے گھر کا کوئی چھوٹا بڑا کام ایسا نہیں تھا جس کے کرنے کی سعادت مستقلاً

یا کسی نہ کسی وقت اس غلام کے حصے میں نہ آئی ہو۔ ان ذمے داریوں سے عہدہ برا ہونے میں مجھ سے بہت سی کوتاہیاں بھی ہوئی ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے!

میں بلال سیہ فام، غلام ابن غلام، نبیِ عالی مقامؐ کا مدار المہام، اُن کا بے دام غلام، اُن کا معتمدِ خاص، داروغۂ مطبخ، باورچی، ہرکارہ، سقہ، چوب دار، چوکیدار، عصابردار، پیش کار، مہماندار، ذاتی خدمت گزار، معلّم، خازن، ہر صبح اُن کو نماز کے لئے بیدار کرنے والا اور اُن کا مؤذنِ خاص تھا۔ مؤذن کی حیثیت سے میں ہر وقت خانۂ خدا میں رہتا تھا اور خادمِ رسولؐ کی حیثیت سے ہر وقت نبیِ رحمتؐ کے قدموں میں۔ کیا وظیفہ تھا میرا، اللہ کا گھر اور محمدؐ کی چوکھٹ۔

اشاعتِ اسلام

میں نے دمشق میں کچھ لوگوں کو یہ بھی کہتے سُنا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ کیسی حماقت کی بات ہے! وہ لوگ یہ چھوٹا سا نکتہ نہیں سمجھتے کہ دین فصل کاٹنے کا نہیں، فصل بونے کا نام ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ فصل کاٹتا ہے۔ اُس سے ڈرنا چاہئے۔ ایسی غیر سنجیدہ، سطحی باتیں ذہنی عیاشی کے دائرے میں تو آجاتی ہیں لیکن منصفانہ، ذمہ دارانہ سوچ کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتیں۔

مجھ جیسے لوگوں کو جنہوں نے اسلام کو ایک بیج سے تناور درخت بنتے ہوئے دیکھا ہے، ایسی باتیں بڑی بچگانہ محسوس ہوتی ہیں۔ کہاں ہماری تربیت کی احتیاطیں کہ زبان کٹ جائے جو ایک لفظ بھی اِدھر کا اُدھر ہو جائے۔ لفظ تو لفظ لہجہ بھی غلط ہو جائے تو گرفت میں آجائیں اور کہاں یہ اللّے تللّے کہ جو جی میں آیا بغیر سوچے، بغیر سمجھے، بغیر تصدیق کئے کہہ ڈالا۔

دراصل ہماری تربیت میں احتیاط کا عنصر ہمارے دین کا صدقہ ہے۔ یہ اللہ کا کلام ہے، یہ کلمات اللہ کے رسولؐ کے ہیں۔ یہ بات اللہ کے رسولؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت کی ہے۔ یہ قول اُن کی اپنی ذاتی حیثیت میں ہے، یہ فرض ہے، یہ واجب ہے، یہ حرام ہے، یہ سنت ہے، یہ مستحب ہے، یہ مباح ہے، یہ مکروہ ہے۔ کس قدر التزام سے ہمیں ان کے فرق سمجھائے جاتے تھے۔ کلامِ الٰہی کے بیان کرنے کے، پڑھنے کے، سننے کے اور اُن پر عمل کرنے کے آداب الگ بتائے جاتے تھے اور رسولِ کریمؐ کے الفاظ کو کلامِ الٰہی سے واضح طور پر الگ کر کے اُن پر عمل کرنے اور اُن کی اشاعت کرنے کے آداب الگ سکھائے جاتے تھے۔ ہم اللہ تعالیٰ کے الفاظ کی توجیہہ اپنے نبیؐ کی زبان سے سنتے اور اُن کے عمل میں دیکھتے۔ اُن کا بغور مطالعہ کرتے اور جو دیکھتے، سنتے اُسے ذہنوں میں محفوظ کر لیتے اور اُسی طرح حرف بہ حرف لوگوں کو منتقل کر دیتے۔ ہمیں نہ صرف اُن پر غور و فکر کی اجازت تھی بلکہ حکم تھا۔ لیکن کسی قسم کی رائے زنی اور حاشیہ آرائی گناہِ عظیم کے زمرے میں آتی تھی اور ہم سب کو اپنی عاقبت عزیز تھی۔

رسولِ کریمؐ کے اپنے ارشادات کی وضاحت کبھی تو اُس سیاق و سباق ہی سے ہو جاتی جن میں وہ الفاظ کہے جاتے، کبھی ہم سب بیٹھ کر اُس پر فکر کرتے اور جب تک اپنے اخذ کئے ہوئے نتیجے کی تصدیق خود حضورؐ سے نہ کر لیتے، انہیں کسی کے آگے دہرانے کی جرأت نہ کرتے۔ نبیِ کریمؐ کا اس سلسلے میں واضح ارشاد ہے کہ جو شخص کسی سنی سنائی بات کو بلا تصدیق کسی اور کے سامنے دہرائے، وہ کاذب ہے۔ بعض دفعہ ایک ایک لفظ کی تشریح و توجیہہ اور اُس کے محلِّ استعمال پر کئی کئی دن صرف ہو جاتے۔ ان سب احتیاطوں کے باوجود جو لفظ ہم اللہ اور رسولؐ کی طرف منسوب کرتے، اللہ تعالیٰ سے اپنے ممکنہ بشری سہو کی ہزار ہزار معافیاں مانگ کے اور جس کے سامنے بیان کرتے اُس کو بھی تلقین کرتے کہ وہ مزید

تصدیق کر لے۔ یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ مسلمان اپنے ہر قول و فعل کے لئے صرف اور صرف اپنے اللہ کو جواب دہ ہے اور وہ کسی صورت میں بھی اللہ کی گرفت میں نہیں آنا چاہتا۔

میرے دمشق کے دوستوں پر کبھی ایسی ذمّے داری پڑی ہی نہیں۔ اُن پر تحقیق و تصدیق کے دور گزرے ہی نہیں۔ اس لئے مجھے اُن کی باتوں پر غصّہ نہیں، ترس آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بنی نوعِ انسان کو اُس کی فکری سطحیت کے شر سے محفوظ رکھے۔

میں جب اُن سے پوچھتا ہوں کہ کوئی ایک فرد، ایک شہر، ایک قبیلہ مثال کے طور پر پیش کریں جسے اسلام لانے پر مجبور کیا گیا ہو تو اس کا اُن کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ انہیں غالباً یہ علم بھی نہیں کہ اگر کوئی مسلمان کسی کو زبردستی اسلام لانے پر مجبور کرے تو وہ شاید نہیں، حتمی طور پر دوزخ میں جائے گا۔ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کا انتباہ مختصر، مگر دو ٹوک ہے:

لا اکراہ فی الدین

یعنی دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ کوئی تلوار، کوئی دھمکی، کوئی دھونس، کوئی لالچ، کوئی دباؤ، کوئی رشوت انسان کو اہلِ ایمان نہیں بنا سکتی۔ اس فیصلے کا تو بندہ مجاز ہی نہیں ہے۔ یہ ذاتِ وحدہٗ لاشریک ہے جو طے کرتی ہے کہ کسے ایمان لانے کی توفیق دی جائے گی۔

سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ تمام انسانوں سے، دمشق کے دانشوروں سمیت، یہ سوال پوچھتا ہے:

'اگر آپ کا پروردگار چاہتا
تو روئے زمین پر جتنے بھی لوگ ہیں
سب کے سب ایمان لے آتے،
سو کیا آپ لوگوں پر جبر کر سکتے ہیں
جس سے وہ ایمان لے آئیں۔

کسی شخص کو یہ قدرت حاصل نہیں
کہ وہ ایمان لے آئے
بجز مشیّتِ الٰہی کے'۔

(آیات ۹۹ اور ۱۰۰)

پھر کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا لیکن آپ کسی بات کو کسی بھی حد تک ناممکن ثابت کر دیں، پھر بھی آپ کو ایسے لوگ ہمیشہ مل جائیں گے جو اُسے یقینی کہتے رہیں گے۔ اس قسم کی باتیں کرنے سے پہلے انہوں نے اتنا تو التفات فرمایا ہوتا کہ اگر اسلام کو تلوار ہی کے ذریعے پھیلانا مقصود ہوتا تو استدلال کی کیا ضرورت تھی جو قرآنِ کریم کے دو تہائی سے زیادہ حصّے پر پھیلا ہوا ہے۔

اتنا ضرور ہوا کہ ہمیں تشدّد کے خلاف جہاد کا حکم مل گیا اور تشدّد کی بھی یہی وجہ تھی کہ دشمنانِ اسلام کے پاس اسلام کے دلائل کا کوئی جواب نہیں تھا اور وہ زِچ ہو کر ہمیں اپنی طاقت سے کچلنا چاہتے تھے۔

بعض حالات جنگ پر مجبور بھی کر دیتے ہیں۔ توریت کا خدا بھی قرآن کے خدا سے زیادہ نرم دل نہیں تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ایک مرتبہ گرجا گھر میں زرِ مبادلہ کا لین دین کرنے والے بیوپاریوں کے ساتھ سختی برتنا پڑی تھی لیکن جنگ کی صورت میں بھی انسان کو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اصولوں اور ضابطوں کا پابند رہنا چاہئے۔ انسان، جنگل کے قانون کو اپنی تہذیب کی ضد کے طور پر پیش کرتا نہیں تھکتا مگر اُس قانون میں بھی جو سختی نظر آتی ہے وہ جانوروں کی جسمانی ضروریات کے تقاضوں کے تحت ہوتی ہے۔ جانور کبھی کسی پر ظلم نہیں کرتے، کبھی کمینگی کا مظاہرہ نہیں کرتے، کبھی ہوائے نفس یا خودسری کی خاطر اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود نہیں پھلانگتے۔ یہ صرف انسان ہی ہے جو کرتا ہے تو

اَسفَلُ السّٰافِلِین ہو جاتا ہے۔

پیغمبرانِ سلف اور الہامی کتابوں پر ایمان لائے بغیر جن کا دین ہی مکمل نہیں ہو سکتا اُن سے غیر مذہبوں کے پیروکاروں پر جبر کی توقع سراسر بدگمانی ہے۔ ہم نے اسلام ظلم و تشدد سے نہیں پھیلایا، محبت اور اصولوں سے لوگوں کے دل جیتے ہیں۔

نبیؐ کی وفات

اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبرؐ کی وفات کو آسان بنا دیا۔ انہوں نے ۶۳۲ سن عیسوی میں انتقال فرمایا۔ سارے شہر میں سناٹا تھا۔ گھر گھر سے سسکیوں کی آواز ابھر رہی تھی۔

انسان مرگِ انبوہ میں وفات پائے، ہزاروں لوگوں کے ساتھ جنگ میں جان دے یا کسی وبائی مرض میں مبتلا ہو کر اس دارِ فانی سے رخصت ہو، اُس کی موت، اُس کی اپنی موت ہوتی ہے۔ موت میں شراکت نہیں ہوتی۔ کسی کو کسی اور کی موت کو سمجھنے کی توفیق نہیں دی جاتی۔ لوگ محض دوسروں کی وفات کی تفصیل بتا سکتے ہیں یا اُن وجوہ اور امراض کا ذکر کر سکتے ہیں جن سے موت واقع ہوئی جیسا کہ میں کر رہا ہوں۔

رسول اللہؐ کے آخری لمحات کے بارے میں، میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اُن کی وفات نہ تو اچانک ہوئی نہ متوقع تھی۔ نہ اسے کاملاً پر سکون کہا جا سکتا ہے، نہ سختی اور شدت لئے

ہوئے۔ نہ یہ ایک عام واقعہ تھا اور نہ اسے غیر معمولی کہا جاسکتا ہے۔ پھر بھی یہ ایک پیغمبر کی وفات تھی۔ جس قادرِ مطلق نے عرشِ معلیٰ پر اُن کے نور کی شمع جلائی تھی، اُسی نے انہیں اپنے پاس بلالیا۔

میں نے حسبِ معمول صبح انہیں بیدار کیا۔ وہ باہر تشریف لائے مگر اُن کی حرکات و سکنات میں روزمرہ جیسی چستی نہیں تھی۔ سر درد کی شکایت کر رہے تھے۔ مجھے کہا میں اُن کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھوں، کہیں بخار تو نہیں۔ میں نے عرض کی کہ پیشانی گرم ہے۔ حضورؐ آرام فرمائیں لیکن انہوں نے میرے ساتھ مسجد جانے پر اصرار کیا۔ چلنے لگے تو نقاہت محسوس کر رہے تھے۔ میرا بازو تھام لیا۔ میں انہیں اپنے ساتھ لگا کر چلنے لگا۔ چلتے چلتے وہ اچانک رک گئے اور کہنے لگے:

"بلال تمہیں یاد ہے جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اُس دن بھی ہم ایسے ہی چل رہے تھے لیکن اُس دن میں نے تمہیں سہارا دیا ہوا تھا"۔

یہ کہہ کر وہ ہنس پڑے۔ میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا:

"بائیس سال پہلے کی بات ہے"۔

انہوں نے فرمایا:

"نہیں بلال نہیں، کل کی، کل کی بات ہے"۔

سارا دن بخار تیز ہوتا گیا۔ دوسرے دن صبح اور بھی زیادہ تھا مگر پھر بھی وہ بستر سے اٹھے اور اپنی آواز کی نقاہت اور ہاتھوں کی لرزش کے باوجود امامت فرمائی۔ تیسرے اور چوتھے دن بھی صورتِ حال ایسی ہی رہی۔ پانچویں دن جب میں نے صبح دروازے پر دستک دی تو دروازہ عائشہؓ نے کھولا۔ چہرے پر بہت پریشانی تھی۔ اُن کے عقب سے رسولِ کریمؐ کے کراہنے کی آواز آرہی تھی۔ انہیں سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ عائشہؓ نے مجھے ایک

بالٹی دی اور ٹھنڈا پانی لانے کے لئے کہا۔

میں بالٹی لیتے ہی دوڑ پڑا۔ ایک کنواں، دوسرا کنواں، تیسرا، چوتھا چھوڑتا ہوا میں اُس کنوئیں پر پہنچ گیا جس کا پانی مدینے میں سب سے ٹھنڈا تھا۔ بالٹی رسّی سے باندھ کر جلدی سے کنویں میں ڈالی تو کنوئیں کی تہ میں ایک چھپاکا ہوا، مجھے وہ آواز آج بھی یاد ہے۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اس پانی کی ٹھنڈک فوراً ہی حضورؐ کے جسم کی حدت ختم کر دے گی۔ پانی لے کر جلدی سے واپس گیا اور عائشہؓ کے حوالے کیا۔ میرے پاس اتنا ہی وقت تھا کیونکہ دن چڑھنے سے پہلے مجھے اپنے فرض سے سبکدوش ہونا تھا۔ میں جانتا تھا اگر حضورؐ کے کانوں میں اذان کی آواز نہ پڑی تو وہ اپنی بیماری کی تکلیف سے بھی زیادہ تکلیف محسوس کریں گے۔

اذان دے کر میں نے پھر عائشہؓ کے حجرے پر دستک دی۔ چہرے کی پریشانی کچھ کم تھی۔ میرے دل کو بھی ذرا اطمینان ہوا۔ عائشہؓ نے کہا رسول اللہؐ نے تمہارے لئے یہ پیغام دیا ہے کہ آج سے بہتر اذان تم نے کبھی نہیں دی۔

ذاتی طور پر مجھے اس سے اتفاق نہیں تھا۔ میرے خیال میں، میں نے کئی بار اس سے زیادہ تاثر میں ڈوبی ہوئی اذانیں دی تھیں۔ اُس صبح تو ہوا بھی اتنی تیز تھی اور درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ نے بھی میری آواز کی بہت سی خوبیوں کو دبا دیا تھا۔ میری آواز میں وہ رچاؤ ہی پیدا نہیں ہونے پایا تھا جو میں اکثر محسوس کیا کرتا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا میں ہوا کو ساکن کر دوں، پتوں کی سرسراہٹ روک دوں۔ پھر شہادتِ رسالت کے الفاظ پر میرے ذہن میں اپنے نبیؐ کی تکلیف کا خیال آگیا تھا جس نے مجھے پریشان کر دیا تھا لیکن ہر مؤذن کو یہ جاننا ضروری ہے کہ اُس کی اذان کا حسن کانوں سے نہیں دل سے پرکھا جاتا ہے۔ کان تو محض ایک بیرونی آلہ ہیں۔ دل انسان کا باطن ہے۔ اگر سرورِ کائناتؐ نے ارشاد فرمایا کہ یہ میری بہترین اذان تھی تو واقعی وہ بہترین تھی۔

دو دن تک اُن پر غشی کے دورے پڑتے رہے۔ کبھی ہوش آجاتا کبھی بے ہوشی طاری ہو جاتی۔ میں اس تمام عرصے میں اُن کی چوکھٹ پر بیٹھا رہا۔ جب مجھے پانی لانے کے لئے کہا جاتا، میں دوڑ پڑتا۔ دوڑنے سے مجھے اپنے ذہن کا بوجھ ہلکا ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ لگتا تھا میرا ہر قدم اُن کی بیماری دور کر رہا ہے۔ یہ میں نہیں جانتا تھا کہ ہر قدم پر منزل دور ہوتی جا رہی ہے۔ میں ہر دفعہ ایک نئے کنویں سے پانی لے کر آتا۔ اس خیال سے کہ اگر ایک کنویں کے پانی سے بیماری دور نہیں ہوئی تو شاید دوسرے کنویں کے پانی میں کوئی ایسی تاثیر ہو جس سے افاقہ ہو جائے۔ اس طرح ایک ایک کر کے میں نے مدینے کے سات کنوؤں کا پانی لا کر دیا۔ عائشہؓ نے یہ پانی الگ الگ سات برتنوں میں رکھ لئے تھے۔ یہ برتن دیگر ازواجِ مطہرات کے حجروں سے آئے تھے۔ عائشہؓ باری باری اُن میں کپڑا بھگو بھگو کر حضورؐ کے بدن پر رکھتیں تاکہ بخار کی حدت کم ہو۔

آٹھویں دن حضورؐ کی حالت میں اچانک ایک تبدیلی آئی۔ صبح انہوں نے دروازہ خود کھولا اور باہر تشریف لائے۔ سر پر سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔

اتنے میں عبید اللہ بن عبداللہؓ آئے اور حضورؐ سے عرض کی کہ لوگ آپ کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے بے تاب ہیں۔ حضورؐ نے مجھے فرمایا کہ میں ابوبکرؓ سے نماز کی امامت کے لئے کہوں۔ یہ حکم سُن کر میں چلنے ہی والا تھا کہ عائشہؓ نے اُن سے عرض کی:

"میرے والد بہت رقیق القلب ہیں۔ اُن کی آواز بھی بہت دھیمی ہے۔
ویسے بھی قرآن کی تلاوت کرتے وقت اُن پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔
وہ آپ کی جگہ محرابِ نبوی میں کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھا سکیں گے"۔

یہ سُن کر محسن عالمؐ نے مجھے دوبارہ حکم دیا کہ میں ابوبکرؓ کو اُن کا پیغام پہنچا دوں۔ اس

پر ایک مرتبہ پھر سب نے عرض کی:

"آپ اُن کی طبیعت سے واقف ہیں، وہ تو آپ کی علالت ہی کی وجہ سے اپنے ہوش و حواس گنوائے بیٹھے ہیں۔ وہ یہ ذمے داری نہیں نبھا پائیں گے"۔ اس مرتبہ انہوں نے مجھے زور دے کر کہا:

"تم ابوبکر سے کہو کہ وہ امامت کریں"۔

یہ نبیؐ کا فیصلہ تھا۔ ہم سب نماز کے لئے روانہ ہو گئے۔ ابوبکرؓ حسبِ حکم امامت کے لئے کھڑے ہو گئے اور نماز شروع ہو گئی۔ اتنے میں حضورؐ، علیؓ اور فضل بن عباسؓ کے شانوں پر ہاتھ رکھے مسجد میں تشریف لائے اور ابوبکرؓ کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ ابوبکرؓ نے انہیں دیکھ کر فوراً اُن کے لئے جگہ چھوڑنا چاہی مگر حضورؐ نے انہیں اشارے سے حکم دیا کہ وہ نماز پڑھاتے رہیں، اور خود اُن کی امامت میں نماز ادا فرمائی۔

اسی طرح ایک مرتبہ حضورؐ نے تبوک کے سفر میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی امامت میں بھی نماز ادا فرمائی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ حضورؐ کو وضو میں دیر ہو گئی تھی اور نماز کا وقت نکلا جا رہا تھا، چنانچہ لوگوں نے نماز قضا ہونے کے خوف سے ابن عوفؓ کو امامت کے لئے کہا۔ ابھی انہوں نے ایک ہی رکعت پڑھائی تھی کہ حضورؐ تشریف لے آئے۔ ابن عوفؓ نے انہیں اپنی جگہ دینی چاہی مگر اُس دن بھی حضورؐ نے انہیں اشارے سے روک دیا اور اُن کی امامت میں نماز ادا کی۔ سب کے سلام پھیر لینے کے بعد انہوں نے اپنی ایک باقی رکعت ادا کی۔ نماز پڑھ کر انہوں نے فرمایا:

"آپ لوگوں نے اچھا کیا کہ ابن عوف کے پیچھے نماز پڑھ لی۔
ہر نبی کو اپنی موت سے پہلے کم از کم ایک نماز اپنے کسی متقی پیروکار کی امامت میں ادا کرنا ہوتی ہے"۔

اُس دن جب مسجد نبوی میں یہ واقعہ دہرایا گیا تو حضورؐ کے دو سال پہلے کے یہ الفاظ یاد کر کے میرا دل بیٹھ گیا۔ آج ان لفظوں کے معنی ہی کچھ اور ہو گئے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر انہوں نے اُحد کے شہدا کے لئے دُعا فرمائی اور پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گھر تشریف لے گئے۔ لگتا تھا چلنے میں انہیں بہت تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔ مجھ سے اُن کی یہ حالت دیکھی نہ گئی تو میں دوسری سمت دیکھنے لگا۔ مجھ جیسے کم فہم کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وقت قریب ہے، سب چہروں پر یہی تاثر تھا۔ ہر ایک کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

اس رات جب تاریکی گہری ہو گئی، تو حضورؐ نے جنت البقیع جانے کا ارادہ کیا۔ میں اور علیؓ بھی ساتھ ہو لئے، اس خیال سے کہ کہیں ضعف کی وجہ سے گر نہ پڑیں مگر ہم نے دیکھا کہ اُن کے قدم نہایت مضبوطی سے پڑ رہے تھے۔ چلتے چلتے وہ قبروں تک پہنچ گئے اور بلند آواز میں فرمانے لگے :

"اے قبر کے رہنے والو تمھیں سلام،
خوشی مناؤ کہ تم زندہ لوگوں سے بہتر ہو،
وہ صبح جو تمھیں جگاتی ہے،
اُس صبح سے بہتر ہے،
جو زندہ لوگوں کو جگاتی ہے"۔

گہری تاریکی میں اُن کا روئے مبارک مجھے نظر نہیں آرہا تھا مگر اُن کے کلمات کا ایک ایک حرف میرے دل پر نقش ہو گیا۔

بقیع سے واپس تشریف لائے تو انہوں نے عائشہؓ سے پوچھا کہ گھر میں کتنی رقم ہے۔ عائشہؓ کو اس سوال کا جواب دینے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ فوراً بولیں :

"سات درِہم"۔

حضورؐ نے فرمایا :

"انہیں ابھی خیرات کر دو۔ میں اس رقم کے ساتھ اللہ کو کیا مُنہ دکھاؤں گا"۔

اس کے بعد وہ صرف ایک بار اور مسجد میں تشریف لائے۔ میرے لئے یہ اُن کا آخری دیدار تھا۔ صرف چند گھنٹوں کی زندگی باقی تھی مگر چہرے سے پژمردگی کی کیفیت بالکل دور ہو چکی تھی۔ انسؓ نے جو میرے قریب کھڑے تھے، آپ کو دیکھ کر کہا کہ میں نے کبھی اُن کا چہرہ اتنا حسین نہیں دیکھا۔ اُن کا چہرہ دمک رہا تھا۔ بہت آہستہ آہستہ کلام فرما رہے تھے :

"اگر میری وجہ سے کسی کو کوئی دکھ پہنچا ہو تو وہ مجھے معاف کر دے۔
قرآنِ حکیم ہدایت کا سرچشمہ ہے اسے سینے سے لگا کر رکھنا"۔

جب انہیں سہارا دے کر اٹھایا گیا تو انہوں نے کھڑے ہو کر چاروں طرف نظر دوڑائی اور فرمایا :

"میں تم سے رخصت ہو رہا ہوں لیکن یاد رکھنا تمھیں میرے پیچھے آنا ہے"۔

اب جو میں بیان کرنے لگا ہوں وہ میں نے دیکھا نہیں سُنا ہے۔ نزع کے عالم میں حضورؐ کا سرِ مبارک عائشہؓ کی گود میں تھا۔ انہوں نے آپ کو اپنے بازوؤں میں سنبھال رکھا تھا۔ کسی نے مسواک پیش کی تو کچھ دیر مسواک کرتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ آخری لمحے میں عائشہؓ نے انہیں یہ کہتے سُنا۔

"اے اللہ حشر کے دن مجھے غریبوں کے ساتھ اٹھانا"۔

اور پھر کچھ اور الفاظ فرمائے جو سنائی نہیں دئے یا سمجھ میں نہیں آئے یا یاد نہیں رہے یا ہمارے لئے تھے ہی نہیں۔ اُس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے مخاطب تھے۔ پھر اچانک انہوں نے سر اٹھایا اور یہ لفظ ادا کئے :

اَلرَّفِیْقُ الْاَعْلٰی

باہر بیٹھے ہم نے حضرت عائشہؓ کے رونے کی آواز سنی تو ہمیں پتا چل گیا کہ حضورؐ انتقال فرما گئے ہیں۔ عمرؓ جلدی سے اندر گئے، مگر اُن کی آنکھوں نے صرف یہ دیکھا کہ حضورؐ استراحت فرما رہے ہیں۔ غم نے اُن کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔ اُن کے ذہن نے یہ قبول ہی نہیں کیا کہ حضورؐ اب ہم میں نہیں ہیں۔ وہ نہایت غیظ و غضب کے عالم میں باہر نکلے۔ ہوا میں مکّے لہراتے ہوئے اور زور زور سے چلّاتے ہوئے کہ اگر کسی نے کہا محمدؐ فوت ہو گئے ہیں تو وہ اپنے انجام کے لئے تیار ہو جائے۔ ہم کئی لوگوں نے مل کر انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر انہوں نے ہمیں دھکا دے کر پرے کر دیا۔ پھر خود ہی اپنے موقف کی توجیہ کرنے لگے۔ اُن کا استدلال یہ تھا:

"موسیٰ علیہ السّلام کا قصہ یاد ہے جب وہ کوہِ سینا پر اللہ کے پاس گئے تھے تو یہودیوں نے مشہور کر دیا تھا کہ وہ وفات پا گئے ہیں لیکن کیا ہوا، چالیس دن کے بعد وہ زندہ سلامت واپس تشریف لے آئے۔ محمدؐ بھی چالیس دن بعد انہی کی طرح واپس آجائیں گے"۔

بے چارے نیک دل عمرؓ۔ وہ صحنِ مسجد کے وسط میں کھڑے تھے۔ اُن کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ کبھی اِدھر مڑ کے کچھ کہتے کبھی اُدھر۔ اُن کا غم حقیقت کی تلخی سے نبرد آزما تھا، جیسے کوئی دیوانہ چاند پر پتھر پھینک رہا ہو۔

ابوبکرؓ بھی حضرت عائشہؓ کے حجرے میں تشریف لے گئے۔ انہوں نے آپ کا روئے مبارک دیکھا۔ دیکھتے ہی انہیں حضورؐ کی وفات کا یقین ہو گیا۔ انہوں نے حضورؐ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور چادر سے چہرہ ڈھانپ دیا۔

وہاں سے ابوبکرؓ مسجد میں تشریف لائے۔ آتے ہی اُس حلیم الطبع انسان نے ایک

ہاتھ بلند کر کے سب سے خاموشی کی درخواست کی۔ آج اُن کے لہجے میں، اُن کی آواز میں، اُن کے الفاظ میں ساری دنیا کا اختیار جھلک رہا تھا۔

"اگر ہم میں سے کوئی ایسا ہے جو محمدؐ کو معبود سمجھتا ہے تو وہ جان لے کہ محمدؐ کا انتقال ہو چکا ہے"۔

یہ کہہ کر انہوں نے اس دردناک حقیقت کے دلوں میں اترنے کے لئے جتنا وقفہ ضروری تھا، دیا اور پھر اعلان کیا:

"لیکن جو اللہ کو اپنا معبود سمجھتا ہے، اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا"۔

اُس کے بعد آلِ عمران کی یہ آیت پڑھی جو جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی تھی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ○

اور محمد تو صرف (اللہ کے) پیغمبر ہیں
ان سے پہلے بھی کئی پیغمبر ہو گزرے ہیں
بھلا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں
تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟
اور جو الٹے پاؤں پھر جائے گا،
تو اللہ کا کچھ نقصان نہیں کر سکے گا
اور اللہ شکر کرنے والوں کو ثواب دے گا۔

یوں لگتا تھا جیسے لوگوں نے اس آیت کا مفہوم پہلی مرتبہ سمجھا تھا۔

عمرِ فاروقؓ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور زور زور سے رونے لگے۔ گریہ وزاری کے عالم میں کھڑے نہ رہ سکے تو بیٹھ گئے، اُسی طرح چہرہ چھپائے زارو قطار روتے رہے۔ اُن کا سارا جسم لرزے کے عالم میں تھا۔ پھر مدینہ اس طرح گریہ کناں ہوا کہ معلوم ہوتا تھا ساری کائنات رو رہی ہے۔ میں نے آمدِ رسولؐ پر مدینے کی خوشی کی انتہا دیکھی تھی، آج مدینے کے غم کی انتہا دیکھ رہا تھا۔

تدفین کے بعد قبر پر چھڑکاؤ کرنے کی سعادت بھی میرے حصے میں آئی۔ میں آہستہ آہستہ قبر پر چھڑکاؤ کرتا جاتا تھا اور سوچتا جاتا تھا کہ آج کیسا آفتاب غروب ہو گیا۔ کیا سعادت ہے اس زمین کی، مٹی کے ان ذروں کی، جنھوں نے اس آفتاب کو اپنی آغوش میں لیا ہے۔ مٹی بیٹھ گئی تو میں نے ہاتھوں سے تھپک تھپک کر اُسے ہموار کیا۔ رخصت ہوتے ہوئے مڑ کر دیکھا تو ساری قبر پر میرے آبوسی ہاتھوں کے نشان بنے ہوئے تھے!

اُن کے بعد

اُس دن کے بعد میں نے اذان دینا بند کر دی۔ یہ نہیں کہ میرا جی نہیں چاہتا تھا۔ میں اللہ کے آخری رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نامزد مؤذن آج بھی دل میں وہی تڑپ رکھتا تھا۔ اُن کے تعریفی کلمات آج بھی میری حیات کا عزیز ترین سرمایہ تھے۔ اُن کا فرمان آج بھی میرے لئے ہر چیز پر مقدم تھا۔ ثواب کا آج بھی میں اتنا ہی مستحق تھا، جتنا آج سے پہلے۔ اشاعتِ دین میں میرا حقیر سا حصہ آج بھی میری روح کی تسکین کا سامان تھا۔ میں بھی وہی تھا۔ میری آواز بھی وہی تھی۔ آج بھی میرے سُروں میں وہی گونج تھی۔ میرے لہجے میں وہی کھنک اور اسلام کے اوّلیں دنوں کا وقار اور دبدبہ تھا۔ اذان کے الفاظ آج بھی لہو کی طرح میری رگوں میں رواں تھے۔ اُس کا لحن آج بھی میرے سارے وجود کو مترنم کئے ہوئے تھا۔ آج بھی میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ میں بلند آواز سے توصیفِ الٰہی بیان کروں، رسالتِ محمدؐ کی شہادت دوں، ایمان والوں کو نماز کے لئے پکاروں، نیکی کی طرف

بلاؤں۔ مگر نہ جانے کیا ہو گیا تھا، ایسے لگتا تھا کچھ اندر سے ٹوٹ گیا ہے۔ کوئی ایسی چیز جس کے ٹوٹنے سے میری ساری صلاحیتیں چھن گئی ہیں اور جو کچھ ٹوٹا ہے دوبارہ جڑ نہیں سکتا۔ اب سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں تھا۔ اب اسی اثبات و نفی کے عالم میں زندہ رہنا میرا مقدر تھا۔ میں بے بس تھا۔

ایک دن علیؓ اور ابوذرؓ نے بہت زور دے کر مجھے اذان کے لئے چھت پر چڑھا دیا۔ میری ٹانگیں ساتھ نہیں دے رہی تھیں مگر دونوں نے سہارا دیا۔ ابھی میرے مُنہ سے 'اللہ اکبر' ہی نکلا تھا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مجھے الفاظ کا دروبست بھول گیا تھا۔ کبھی کوئی لفظ نکلتا، کبھی کوئی۔ سب الفاظ آگے پیچھے ہو رہے تھے۔ حضورؐ کا نام مبارک آتے ہی مجھ پر رقت طاری ہو گئی۔ میں اٹک گیا۔ پھر دوبارہ شروع سے اذان دینے لگا، پھر محمدؐ کا نام آتے ہی رک گیا۔ چار دفعہ میں نے اذان شروع کی اور چاروں مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ میں لفظ محمدؐ، اکثر اُن کو دیکھ کر ادا کیا کرتا تھا۔ وہ سامنے ہوتے تھے یا پاس ہوتے تھے تو میں اُن کی طرف اشارہ کر کے اُن کی رسالت کی شہادت دیا کرتا تھا۔ آج میری آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ زبان ساتھ دے رہی تھی نہ ذہن۔ آخر علیؓ اور ابوذرؓ دونوں نے ترس کھایا اور مجھے نیچے اُتار لائے۔

آخری اذان

جن جن موقعوں پر میں نے اہلِ دین کو نماز کے لئے پکارا ہے، اگر یکجا کر دیئے جائیں تو اسلام کی اوّلین تاریخ مرتب ہو جاتی ہے۔ جنگِ اُحد کے موقع پر شیخین کی اذانِ مغرب ہی لیجیے۔ رسول اللہؐ کی قیادت میں مدینے سے مارچ کرتا ہوا لشکرِ اسلام اُحد سے نصف فاصلے پر شیخین تک پہنچا تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ نبی کریمؐ سکب نامی گھوڑے پر سوار تھے۔ سکب کا مطلب ہے 'آبِ رواں'۔ اُس گھوڑے کی خصوصیات کے اعتبار سے یہ نام اُس کے لئے بہت موزوں تھا۔ حضورؐ کے سر پر خود تھا جس کے گرد سیاہ عمامہ بندھا ہوا تھا۔ چمڑے کی پیٹی میں تلوار لگی تھی۔ پشت پر ڈھال، شانے پر کمان، ہاتھ میں نیزہ۔ اور دوہری زرہ۔ سکب کے علاوہ ایک گھوڑا اور بھی تھا جس پر ابو بردہؓ سوار تھے، باقی سب پیدل چل رہے تھے۔ تین نیزے فضا میں بلند تھے جن پر علم لہرا رہے تھے۔ اُوس کا علم اُسیدؓ کے ہاتھ میں تھا، خزرج کا خبابؓ کے پاس اور مہاجرین کا پرچم مصعب بن عمیرؓ کے سپرد تھا۔

شیخین پہنچتے پہنچتے سورج غروب ہو گیا تو مجھے اذان کا حکم ملا۔ ایک ہزار جاں نثاروں کو جو اپنی زندگی کے ایک عظیم جہاد میں شامل ہونے کے لئے گھر سے نکلے تھے، دعوتِ نماز دیتے ہوئے مجھ پر عجب کیفیت طاری تھی۔ ان میں نہ جانے کتنے تھے جن کی یہ آخری نمازِ مغرب تھی۔ ان میں دو روشن چہرے مجھے کبھی نہیں بھولیں گے۔ شام کے دھندلکے میں بھی لگتا تھا اُن پر دھوپ پڑ رہی ہے۔ اذان دیتے وقت بار بار میری نظریں اُن کی طرف اٹھ جاتیں۔ یہ دو نوجوان تھے۔ چودہ چودہ، پندرہ پندرہ سال کے۔ رفیع بن خدیجؓ اور نجد کے ایک قبیلے کے یتیم سمورہ بن جُندبؓ۔ حضورؐ نے کم عمری کی وجہ سے دونوں کو جنگ میں شرکت کی اجازت نہیں دی تھی مگر کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ رفیعؓ بہت اچھے تیر انداز ہیں بلکہ کئی نامور تیر اندازوں سے بہتر ہیں۔ اس پر حضورؐ نے انہیں اجازت دے دی۔ سمورہؓ یہ فیصلہ سُن کر بول اُٹھے:

"اگر رفیع لڑ سکتا ہے تو میں بھی لڑ سکتا ہوں۔ میں اس سے زیادہ طاقتور ہوں، کشتی کروا کے دیکھ لیجیے"۔

حضورؐ نے تبسّم فرمایا اور نماز کے بعد مقابلہ ہوا تو سمورہؓ نے واقعی رفیعؓ کو ہرا دیا۔ اس طرح وہ بھی مجاہدینِ اُحد میں شامل ہو گئے۔

جنگِ احزاب میں دشمن کے راتوں رات فرار ہو جانے کے بعد جب میں نے فجر کی اذان دی تو خندق کے کنارے لگے ہوئے خیموں سے نکلتے ہوئے مجاہدین کے چہروں پر شکر کے جو تاثرات تھے، وہ مجھے کبھی نہیں بھولیں گے۔ نماز کے بعد ہم نے دیکھا تو میدان خالی پڑا تھا۔ ایک اور یقینی شکست فتح میں تبدیل ہو گئی تھی اور ہمارے دل گواہی دینے لگے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں عربستان کی مجموعی طاقت کے خلاف سرخرو کیا ہے تو اب انشاء اللہ فتح ہر قدم پر ہمارے پاؤں چومے گی اور پھر تاریخ نے ہمارا یہ اندازہ صحیح ثابت کر دکھایا۔

دو تاریخی موقعوں پر میں نے حضورؐ کے حکم پر خانۂ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دینے کی سعادت حاصل کی۔ فتحِ مکہ کے دن جس کا احوال میں سُنا چکا ہوں اور اُس سے ایک سال پہلے عمرۃ القضاء کے موقع پر جب ہم اپنے ہتھیار پیچھے چھوڑ کر قریش کی خاص اجازت سے عمرہ کرنے گئے تھے۔ اُس دن پہلی مرتبہ جب میں خانۂ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوا تھا اور میں نے صحنِ کعبہ میں چاروں طرف سفید احراموں میں ملبوس اہلِ ایمان کا سیلِ بے کراں دیکھا تھا تو میری آنکھیں خوشی سے بھر آئی تھیں۔ تین دن کے لئے ہی سہی مگر ان دنوں میں یہ کعبہ ہمارا تھا۔ اہلِ ایمان سے آباد۔ اس کے اطراف گو تین سو ساٹھ بُت موجود تھے مگر مجھے خوشی تھی کہ میں بلالِ حبشی، جو کبھی خود اُن کا غلام تھا آج انہیں معبودِ لاشریک کا اعلان سنانے والا تھا۔ ابُو قُبیس کی پہاڑی پر قریش کے سردار، خانۂ کعبہ پر نظریں جمائے مسلمانوں کو عمرہ کرتے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اسی دوران میں ایک حبشی غلام کو بھی خانۂ کعبہ کی چھت پر کھڑے دیکھا۔ کعبے کی رفعتوں سے خالقِ حقیقی کی تکبیر اور محمدؐ کی رسالت کی شہادت پہاڑیوں میں گونجی تو انہیں اندر ہی اندر خوف پیدا ہو گیا تھا کہ وہ یہ بازی ہارتے جا رہے ہیں۔ حدیبیہ میں انہوں نے ایک سال پہلے جو معاہدہ کیا تھا اب انہیں اُس کی شرائط اپنے حق میں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک ریت کا گھروندا بنایا تھا جو اُن کی نظروں کے سامنے گرتا جا رہا تھا۔

بیت المقدس کی تسخیر کے موقعے پر جب امیر المومنین حضرت عمرِ فاروقؓ نے جابیہ میں عیسائیوں سے صلح کا معاہدہ کیا تو اُس موقع پر انہوں نے ایک نہایت جامع اور بلیغ خطبہ دیا۔ سامعین میں میں بھی تھا۔

تقریر ختم کر کے انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا:

"اے ہمارے سردار بلال! آج اسلام کے قبلۂ اوّل پر اسلام کا پرچم لہرایا ہے۔"

اس تاریخی موقع پر اگر آپ اذان دیں تو بہت مناسب ہوگا“۔

عمرؓ کا یہ کہنا تھا کہ ایک لمحے میں کتنی ہی باتیں میرے ذہن میں پھر گئیں۔ مجھ پر وہ ہمیشہ بڑی شفقت فرماتے تھے۔ جب ملتے مجھے ’سیدنا‘ کہہ کر مخاطب کرتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا تھا:

”ابوبکر سیدنا و اعتق سیدنا یعنی بلالاً“

ابوبکر ہمارے سردار ہیں جنہوں نے ہمارے سردار بلال کو آزاد کرایا۔

ایک اور موقع پر جب وہ خلافت کے منصب پر فائز تھے تو قریش کے سرداروں کا ایک وفد اُن سے ملاقات کے لئے آیا۔ میں بھی کسی کام کے سلسلے میں اُن کے پاس حاضر ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے اُن سے پہلے اندر بلوایا تو اکابرِ قریش کو بہت ناگوار گزرا۔ انہوں نے کہہ بھی دیا کہ شرفائے قریش تو انتظار کر رہے ہیں اور ایک حبشی کو اندر بلا لیا گیا ہے۔ اس موقع پر سہیل بن عمروؓ نے یہ کہہ کر بات سنبھالی کہ دعوتِ حق ہم سب کو ایک ساتھ ملی تھی مگر بلال ہم پر سبقت لے گئے۔ یہی اوّلیت اُن کا شرف ہے۔ ہمیں شکایت کا کوئی حق نہیں۔

اُس دن جب ہم مدّت بعد ملے تھے اور میں نے عمرؓ کی زبان سے اپنا نام سُنا تو میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میں نے نہایت ادب سے عرض کی:

”امیر المومنین آپ جانتے ہیں میں نے رسول اللہؐ کی وفات کے بعد کبھی اذان نہیں دی لیکن اگر آپ کا حکم ہے تو میں تعمیل کروں گا“۔

میں اذان دینے کھڑا ہوا تو فتحِ مکہ کی اذان کا نقشہ میرے ذہن میں اُبھر آیا۔ قبلۂ اوّل پر مسلمانوں کا قبضہ بھی ایک ویسا ہی باعظمت موقع تھا۔ ہزاروں فرزندانِ توحید جمع تھے اور سب کے دل بارگاہِ الٰہی میں اسلام کی اس تاریخی کامیابی پر شکر سے لبریز تھے۔ میرے سامنے کئی صحابۂ کرام بیٹھے تھے، میرے مُنہ سے ’اللہ اکبر، اللہ اکبر‘ کے الفاظ کا نکلنا تھا کہ

محفل پر رقت طاری ہو گئی۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔ شہادتِ رسالت دی تو صحابۂ کرام کا حال دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہزاروں کے مجمع میں صرف حضورِ اکرمؐ کے صحابی بیٹھے ہیں اور میں جابیہ میں نہیں مسجد نبوی میں اذان دے رہا ہوں۔ عمرؓ کی تو روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ آخری بار میں نے انہیں حضورؐ کی وفات پر اس طرح زار و قطار روتے دیکھا تھا۔ یہی حال ابو عبیدہؓ کا تھا۔ بار بار اپنا ہاتھ فرش پر مارتے اور روتے جاتے۔ ایک طرف معاذ بن جبلؓ، جن کا حسین و جمیل چہرہ صرف ہنسنے کے لئے بنا تھا، اِس شدت سے گریہ وزاری کر رہے تھے کہ بے حال ہوتے جا رہے تھے، ساتھ بیٹھے ہوئے لوگ انہیں سنبھال رہے تھے۔ ہر شخص فراقِ رسولؐ میں تڑپ رہا تھا، ہر صحابی کے ذہن میں دورِ نبوی کی تصویر کھنچ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے حضورؐ ابھی ابھی ہم سے رخصت ہوئے ہوں۔ اذان ختم ہونے کے دیر بعد لوگوں کو قرار آیا۔

حضورؐ کی وفات کے بعد ابوبکرؓ خلافت کے منصب پر فائز ہوئے اور رفتہ رفتہ تمام کاروبارِ حیات معمول کے مطابق چلنے لگا مگر میری اپنی یہ حالت تھی کہ میری نظریں اب بھی حضورؐ کو تلاش کرتی رہتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ابھی کہیں سے آ جائیں گے، اُسی طرح مسکراتے ہوئے۔ انہیں سامنے نہ پا کر میں بھری دنیا میں تنہا ہو گیا تھا۔ میری زندگی میں ایسا خلاء پیدا ہو گیا تھا کہ مجھے شب و روز کا ہوش نہیں رہا تھا۔ اذان کے علاوہ میرے معمولات وہی تھے مگر لگتا تھا جیسے زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہا۔ جیسے میں کسی خزاں رسیدہ شاخ سے گرا ہوا ایک پتہ تھا جسے ہوائیں اِدھر اُدھر اڑائے پھر رہی تھیں، جس کی اپنی کوئی منزل نہیں تھی۔ زندگی میں اگر کچھ تھا تو اُن کی یادیں، اُن کی تربیت، اُن کے ارشادات، اُن کی دی ہوئی تعلیم اور ان کی بے پناہ شفقت کا احساس۔

ابوبکرؓ کے انتقال کے بعد میں عمرِ فاروقؓ کی خلافت کے ابتدائی دور میں جہادِ شام

میں شریک ہو گیا اور رومیوں کے خلاف کئی معرکوں میں حصہ لیا۔ یہ معرکے ختم ہوئے تو یہیں شام ہی کے علاقے خولان میں سکونت اختیار کر لی۔ ایک رات رسول اللہؐ کو خواب میں دیکھا۔ فرما رہے تھے:

"بلال، کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تم ہمیں ملنے آؤ"۔

میں تڑپ کر رہ گیا اور فوراً رختِ سفر باندھ لیا۔ مدینے میں داخل ہوا۔ بے تابی عروج پر تھی۔ سیدھا روضۂ اقدس پر پہنچا اور اس قدر رویا کہ لگتا تھا اب یہاں سے اٹھنا نہیں ہو گا۔ حضورؐ کے نواسے حسنؓ اور حسینؓ بھی میری خبر سُن کر روضۂ رسولؐ پر پہنچ گئے۔ اُن کو دیکھ کر کیا کیا یاد آ گیا۔ اُن کا مُنہ، سر، ماتھا چوما اور بار بار انہیں سینے سے لگا کر پیار کیا۔ انہوں نے خواہش کی کل صبح آپ حرمِ نبوی میں اذان دیں۔ مَیں اپنے آقاؐ کے جگر گوشوں کی خواہش کیسے ٹال سکتا تھا۔ سارے شہر کو خبر کر دی گئی کہ بلال کل فجر کی اذان دیں گے۔ صبح اذان دی تو سارا مدینہ اذان سننے کے لئے اُمڈ آیا۔ روتے روتے لوگوں کی ہچکیاں بندھ گئیں، اُن کی بھی جنہوں نے دورِ نبویؐ میں میری اذانیں سنی تھیں اور اُن کی بھی جنہوں نے صرف میرا نام سُن رکھا تھا۔ میں خود بھی زار و قطار رو رہا تھا۔ اذان دیتے وقت جب میں نے شہادتِ رسولؐ کے کلمات کہتے ہوئے روضۂ مبارک کی طرف انگشتِ شہادت کا اشارہ کیا تو گویا یہ اشارہ میری آواز میں شامل ہو گیا۔ گھروں میں بیٹھی ہوئی خواتین بھی جو میری اذان سن رہی تھیں، بے تاب ہو کر گھروں سے نکل آئیں۔ لوگوں نے کہا نبیؐ کریمؐ کے یومِ وفات کے بعد مدینے میں ایسا دلدوز منظر کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ میری آخری اذان تھی۔ میری اذان کی ابتدا بھی اسی مسجد سے ہوئی تھی، انتہا بھی وہیں ہوئی۔

فتحِ شام

ابو بکر صدیقؓ کی خلافت کے ابتدائی دور ہی میں جگہ جگہ فتنۂ ارتداد نے سر اٹھا لیا تو خلیفہ اول نے اس کا قلع قمع کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ پوری تندہی سے دس ماہ اس فتنے کا سر کچلنے میں مصروف رہے۔ ہر ممکن تدبیر اختیار کی۔ جہاں سمجھانے بجھانے سے بات بنی وہاں نہایت بردباری اور کمال فراست سے لوگوں کے وسوسے دور کیے اور جہاں سختی ناگزیر تھی وہاں پوری طاقت سے اس فتنے کی بیخ کنی کی، یہاں تک کہ امن وامان ہو گیا۔ ابو بکر صدیقؓ کو ہم لوگ نہایت متین، خاموش طبع، نرم خو اور بہت دھیمے مزاج کے انسان کی حیثیت سے جانتے تھے مگر اس معرکے میں ان کے کردار کا ایک آہنی پہلو بھی سب کے سامنے آیا جو حد سے گزر جانے والوں کے لئے کسی رورعایت کا متحمل نہیں تھا۔ اسی عرصے میں شام کی طرف سے کچھ لوگوں کو شہ ملی اور ادھر سے مسلمانوں کے خلاف پے در پے چھوٹی چھوٹی معرکہ آرائیاں شروع ہو گئیں۔ دشمنانِ اسلام شاید سمجھتے ہوں کہ اسلام کے سربراہ تو اپنی پریشانیوں میں مبتلا ہیں کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔

ابو بکر صدیقؓ نے اس صورتِ حال کا بغور جائزہ لیا اور اپنے چند مقتدر اور صائب الرائے ساتھیوں کے مشورے سے طے کیا کہ شام کو من مانیوں کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ فراستِ صدیقی یہ گوارہ نہیں کر سکتی تھی کہ شام کے مختلف علاقوں سے رومی اپنی طاقت کے بل بوتے پر مسلمانوں کو مرعوب کرتے رہیں۔ چنانچہ ابو بکر صدیقؓ نے شام پر مختلف اطراف سے لشکر کشی کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا۔ کئی لشکر ترتیب دیے اور ان کے امیروں کو ہدایت کی کہ اگر میدانِ جنگ میں کبھی سب کو یکجا ہونا پڑے تو ابو عبیدہ بن الجراحؓ ان کے سپہ سالارِ اعلیٰ ہوں گے۔

ابو عبیدہؓ اپنے مختصر سے لشکر کے ساتھ شام میں داخل ہوئے تو انہوں نے رومی جنگ بازوں کو ہر جگہ جنگ کے لیے تیار پایا۔ اس کے باوجود وہ بُصریٰ اور مآب کو تسخیر کرتے ہوئے جابیہ پہنچ گئے اور وہاں سے رومیوں کی زبردست جنگی تیاریوں کے بارے میں ایک تفصیلی خط مدینے روانہ کیا۔ خط ملتے ہی ابو بکر صدیقؓ نے امدادی فوج بھیجنے کا اہتمام کیا۔ سیف اللہ خالد بن ولیدؓ کو حکم دیا کہ فوراً عراق سے شام پہنچیں۔ اردگرد کے دوسرے محاذوں یزید بن ابی سفیانؓ، شرجیل بن حسنہؓ اور عمرو بن العاصؓ کو بھی اپنے اپنے لشکر لے کر ابو عبیدہؓ کے پاس جانے کی ہدایت کی۔ یہ سب لشکر جابیہ پہنچ گئے تو ابو عبیدہؓ نے اِجنادَین کا رخ کیا جہاں رومیوں کا ایک بہت بڑا لشکر مسلمانوں پر حملے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اِجنادَین کے قریب فریقین کے درمیان گھمسان کا رَن پڑا اور بالآخر رومیوں کی عددی قوت مسلمانوں کے جوشِ جہاد کے آگے سرنگوں ہو گئی اور وہ میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ جب یہ خبر مدینے پہنچی تو میں صدقات اور خیرات کی تقسیم کے سلسلے میں خلیفہ اسلام کی خدمت حاضر تھا۔ یہ خوشخبری سنتے ہی انہوں نے بآوازِ بلند اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور سجدۂ شکر بجا لائے۔ اس عظیم الشان، تاریخی کامیابی پر سارے مدینے میں جیسے خوشیوں کی بارش ہو گئی۔

اِجنادَین کی فتح کے فوراً بعد ابو عبیدہؓ اور خالد بن ولیدؓ کے لشکروں نے دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ ابھی جاری تھا کہ خلیفہ اول نے وفات پائی اور عمر بن خطابؓ مسند نشینِ خلافت ہوئے۔

عہدِ فاروقی کے اوائل میں ایک روز خالد بن ولیدؓ موقع پا کر فصیلِ شہر پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اندر سے شہر کا پھاٹک کھول دیا۔ ابو عبیدہؓ فوراً اپنے لشکر سمیت شہر کے اندر داخل ہو گئے۔ اہلِ دمشق نے ہتھیار ڈال دیے اور صلح کے طالب ہوئے۔ یوں دنیا کے قدیم ترین شہر دمشق پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ دمشق رومیوں کے ہاتھوں سے چلا تو گیا مگر صحرا نشینوں کے ہاتھوں شکست رومیوں کی انا کے لیے بہت بڑا چیلنج بن گئی۔ رومی پچاس ہزار کا لشکر لے کر اپنی پوری تیاریوں کے ساتھ بیسان میں جمع ہو گئے۔ مسلمانوں کی تعداد نصف سے کم تھی لیکن ان کا جذبہ جہاد پھر کام آیا۔ انہوں نے رومیوں پر اس قدر شدید حملے کیے کہ چند گھنٹوں کے اندر اندر ان کا غرور خاک میں ملا دیا۔ مسلمانوں کا حوصلہ بڑھا تو انہوں نے یکے بعد دیگرے مرج الروم، حمص، حماۃ، شیزر، معرۃ النعمان اور کئی دوسرے مقامات پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ابو عبیدہؓ کی قیادت میں مسلمانوں کا لشکر رومیوں کے مضبوط مرکز لاذقیہ کی طرف بڑھا جہاں ابو عبیدہؓ کا حسنِ تدبیر کام آیا اور اس شہر پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ پے در پے شکستوں سے قیصر روم تلملا اٹھا۔ اس نے اپنے تمام مقبوضات سے فوجیں طلب کر کے انطاکیہ میں جمع کر لیں۔ اب یہ رومی لشکر تقریباً دو لاکھ فوجیوں پر مشتمل تھا۔ اس کے مقابلے کے لیے مسلمانوں نے بھی شام کے مختلف شہروں سے فوجیں بلوا لیں اور ساتھ ہی مدینے سے کمک طلب کر لی۔ شام میں موجود مسلمان فوجیں دریائے یرموک کے کنارے ایک مقام پر جمع ہو گئیں۔ اسی عرصے میں مدینے سے کمک بھی آ پہنچی لیکن اب

بھی ہماری تعداد تیس اور چالیس ہزار کے درمیان تھی۔

رومی نہایت بے جگری سے لڑے، باربار مسلمانوں پر حملے کیے اور ایک بار تو ہماری فوجوں کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب بھی ہو گئے لیکن اہلِ ایمان کی سرفروشی اور مہارتِ جنگ نے صورت حال کو سنبھال لیا اور اس غضب کا جوابی حملہ کیا کہ رومی لشکر میں افراتفری پھیل گئی۔ ان کے تقریباً ستر ہزار آدمی مارے گئے اور جو زندہ بچے، وہ بھاگ نکلے۔ خود قیصر روم جان بچا کر قسطنطنیہ چلا گیا۔

یرموک کی فتح کے بعد ابو عبیدہؓ قنسّرین، حلب اور انطاکیہ کو تسخیر کرتے ہوئے بیت المقدس پہنچے گئے۔ عمرو بن العاصؓ نے پہلے ہی اس شہر کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ ابو عبیدہؓ کا لشکر بھی بیت المقدس جا پہنچا تو نصاریٰ نے اس شرط کے ساتھ صلح کی درخواست کی کہ مسلمانوں کے امیر المومنین بہ نفسِ نفیس بیت المقدس آئیں اور صلح کے معاہدے کی تکمیل کر کے اپنے ہاتھوں سے کلیدِ شہر وصول کریں۔ ابو عبیدہؓ نے خلیفۂ ثانی کو نصاریٰ کی اس شرط سے مطلع کیا تو عمر فاروقؓ چند مہاجرین اور انصار کے ہمراہ بیت المقدس کے لیے روانہ ہو گئے۔

ابو بکر صدیقؓ کے کہنے پر میں نے جہاد کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ ان کی زندگی میں میں نے ان کی خواہش کا پورا پورا احترام کیا۔ انہوں نے وفات پائی تو عہدِ فاروقی میں مجھے جہاد کی اجازت مل گئی۔ میں نے فوراً رختِ سفر باندھا اور جہادِ شام میں حسبِ مقدور حصہ لیا۔ عمر فاروقؓ جابیہ کے مقام پر پہنچے تو ابو عبیدہؓ، خالد بن ولیدؓ، یزید بن ابی سفیانؓ اور فوج کے دیگر افسران نے ان کا استقبال کیا۔ میں بھی ان کے خیر مقدم کے لیے وہاں موجود تھا۔ عیسائیوں کے نمائندے بھی جابیہ پہنچ گئے، معاہدہ ضبطِ تحریر میں لایا گیا اور اس پر فریقین کے دستخط ہو گئے۔ اس کے بعد عمر فاروقؓ جابیہ سے چل کر بیت المقدس پہنچے اور

وہاں اس جگہ نماز پڑھی جہاں آج کل مسجدِ عمر ہے۔ اس موقع پر خلیفہ دوم کے حکم پر میں نے مدت کے بعد اذان دی جس کی تفصیل میں آپکو بتا چکا ہوں۔ اس وقت میں معرکۂ شام کے چند غازیوں اور شہیدوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

حدیبیہ میں قریش کے نمائندے سہیل بن عمروؓ ہمارے شانہ بشانہ اس جہاد میں شریک تھے۔ ان کے علاوہ دشمنِ اسلام ابو جہل کے بھائی حارث بن ہشامؓ اور اس کے بیٹے عکرمہؓ بھی تھے اور ہر معرکے میں ایسی جانبازی سے لڑے کہ قبولِ اسلام کا حق ادا کر دیا یہ تینوں فتح مکہ کے بعد اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ ایک معرکے میں تو عکرمہؓ رومیوں کے صفوں میں اتنی دور تک چلے گئے کہ سارا جسم زخموں سے چھلنی ہو گیا۔ ان کے ساتھیوں نے کہا:

"عکرمہؓ خدا کا خوف کرو، یوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ جوش اچھا لیکن اس کو ہوش پر غالب نہ آنے دو۔"

عکرمہؓ نے لڑتے لڑتے جواب دیا:

"میں لات و عزیٰ کی خاطر جان پر کھیلا کرتا تھا۔ آج اللہ اور رسول کے لیے جان پر نہ کھیلوں۔ خدا کی قسم ایسا ہرگز نہ ہوگا۔"

جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑتے لڑتے عکرمہؓ نے جنگِ یرموک میں شہادت کا درجہ حاصل کیا۔

ان کے چچا حارث بن ہشامؓ مکے میں تھے کہ عمر فاروقؓ نے انہیں خط لکھ کر جہاد میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ انہوں نے مردانہ وار لبیک کہا اور مجاہدین میں شامل ہو کر شام پہنچ گئے۔ کئی خون ریز معرکوں میں سرفروشانہ حصہ لیا اور اپنے بھتیجے عکرمہ کے ساتھ جنگِ یرموک میں شہادت پائی۔

سہیل بن عمروؓ نے غزوہ حنین کے بعد جعرانہ میں اسلام قبول کیا اور اس عہد کے

ساتھ کہ جس قدر مشرکین کے ساتھ مل کر جنگ کی ہے اسی قدر اب مسلمانوں کے ساتھ ہو کر جنگ کروں گا اور جتنا مال مشرکین پر خرچ کیا ہے اس سے دگنا مسلمانوں پر خرچ کروں گا۔ وہ بھی کمال شجاعت سے لڑتے ہوئے جنگ یرموک میں شہادت کے رتبے پر فائز ہوئے۔

ابو عبیدہ بن الجراحؓ نہ صرف فاتحِ شام تھے بلکہ ان کے اور بھی کئی اعزاز ہیں۔ انہیں زبانِ رسالتؐ سے امین الامت کا بے مثال لقب عطا ہوا۔ وہ سابقون الاولون، مہاجرین اولین، اصحابِ بدر، عشرۂ مبشرہ اور اصحاب الشجرہ میں سے ایک تھے۔ ان کا اصل نام عامر تھا مگر شہرت اپنی کنیت، ابو عبیدہ سے پائی۔ چہرہ نورانی، دراز قد، صاحبِ سیف و علم، بڑی پروقار شخصیت کے مالک تھے۔ سارے شام میں عموماً اور دمشق میں خصوصاً جگہ جگہ قائم اسلامی درس و تدریس کے حلقے' ایک خاص علمی فضا جو آپ دیکھ رہے ہیں اور یہ سارے مدرسے جن میں صحابہ کرامؓ لوگوں کو قرآن حکیم کی تعلیم دیتے اور فقہی مسائل سمجھاتے ہیں، یہ سب کچھ ابو عبیدہؓ ہی کا فیضان ہے۔

مجھے یاد ہے نو ہجری میں نجران سے اسلام کی سن گن لے کر ایک وفد مدینے آیا تھا۔ انہوں نے رسول پاکؐ کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسلام قبول کیا تو حضورؐ نے انہیں دینی تعلیمات پر بہتر طور پر روشناس کرانے کے لیے ابو عبیدہؓ کو ان کے ساتھ نجران بھجوا دیا تھا۔ اس موقع پر رسالت مآبؐ نے ان کے علم کے پیشِ نظر امین الامت کے لقب سے سرفراز فرمایا تھا۔ نجران میں ان کا تدریسی سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ اسی رعایت سے بیت المقدس کی فتح کے بعد عمرِ فاروقؓ نے انہیں سارے شام کا والی مقرر کر دیا جہاں انہوں نے اپنے سابقہ تدریسی تجربے کی روشنی میں جگہ جگہ اسلامی درسگاہیں قائم کر دیں جن کے طفیل دمشق آج کل علم کا مرکز بنا ہوا ہے۔

حضورؐ کی خدمت میں

میں نے اُمیہ کے ظلم سے چھٹکارا پانے کے بعد خود کو ہمہ تن رحمتِ عالمؐ کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ یہ میری سعادت تھی کہ دکھ میں سکھ میں، سفر میں حضر میں، زہد میں فقر میں، فتح میں شکست میں، رزم میں بزم میں، مَیں ہمیشہ اُن کی خدمت میں حاضر، اُن کی شخصیت کے سحر میں گم، اُن کی ذات کے مقناطیسی دائرے میں، اُن کے لب و ابرو کی ہر جنبش میں اپنے لئے احکام کی تلاش کرتا رہتا تھا۔ ہر لمحہ میری یہ کوشش رہتی تھی کہ نظریں ان کے روئے مبارک پر جمی رہیں۔ اُن کی شخصیت، اُن کا کردار، اُن کی تعلیم عالمِ انسانیت پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان تھی۔ وہ صداقت، وجاہت، ذہانت، شرافت، شجاعت، استقامت، امانت، سخاوت، فصاحت، بلاغت، وقار، انکسار اور عالی ظرفی کا اتنا حسین مرقع تھے کہ انہیں اَحْسَنِ تَقْوِیْم کی دلیل کہا جا سکتا ہے۔ ہر خوبی بدرجہِ اتم اور ساری صفات آپس میں اس میزان کے ساتھ گندھی ہوئی کہ اُن کی دید ہی اُن کی صداقت کی شہادت تھی۔ عبداللہ بن

سلامؓ نے جب پہلی بار اُن کو دیکھا تو معاً اُن کے مُنہ سے نکلا کہ یہ چہرہ کسی جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔ قبیلہ تیم کے ابو رمثہؓ اپنے بیٹے کو لے کر آئے تو انہیں دیکھتے ہی کہنے لگے کہ واقعی یہ اللہ کے نبی ہیں اور ایمان لے آئے۔ ایک مرتبہ مدینے میں ایک قافلہ وارد ہوا اور شہر سے باہر ٹھہرا۔ حضورؐ کا اتفاقاً اُدھر سے گزر ہوا تو انہوں نے قافلے والوں سے ایک اُونٹ کا سودا کر لیا اور یہ کہہ کر اونٹ ساتھ لے آئے کہ قیمت بھجوا دوں گا۔ بعد میں قافلے والوں کو تشویش ہوئی تو قافلے کی ایک معزز خاتون نے انہیں تسلّی دی:

"مطمئن رہو۔ میں نے اُس شخص کا چہرہ دیکھا تھا جو چودھویں کے چاند کی طرح روشن تھا۔ وہ کبھی بد معاملگی نہیں کرے گا۔ اگر وہ رقم نہ بھجوائے تو میں اپنے پاس سے ادا کر دوں گی"۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہیں تھیں کہ مدینے سے رقم پہنچ گئی۔ یہ طارق بن عبداللہؓ کا قافلہ تھا جو مدینے سے کھجوریں خریدنے آیا تھا۔ بعد میں یہ لوگ شہر میں آئے۔ حضورؐ سے ملے، لوگوں سے اسلام کے بارے میں کوئی سُن گن لی اور مسلمان ہو گئے۔

میں نے اُن سے زیادہ خوب رو کسی کو نہیں دیکھا۔ چہرے پر واقعی چاند کی سی چمک تھی۔ مسکراتے تو پیشانی پر روشنی بکھر جاتی اور آب دار دانتوں سے شعاعیں پھوٹتیں۔ معلوم ہوتا تھا سورج طلوع ہو رہا ہے۔ آنکھوں میں سُرخ ڈورے تھے۔ پُتلیاں سیاہ۔ پلکیں دراز، سر کے بال سیاہ، گنجان اور تھوڑے تھوڑے گھنگریالے۔ بدن مضبوط، گٹھا ہوا۔ قد درمیانہ مگر مائل بہ درازی۔ مجمع میں کھڑے ہوتے تو دوسروں سے قد ذرا نکلتا ہوا معلوم ہوتا۔ سینہ کشادہ، پیٹ ہموار، کلائیاں چوڑی۔ ہتھیلیاں فراخ۔ تلوے اتنے خمیدہ کہ کھڑے ہوں تو نیچے سے پانی بغیر چھوئے گزر جائے۔ بنو خزاعہ کی امّ معبدؓ کے بقول دُور سے بھی دلفریب، قریب سے بھی کمال حسین۔ نہایت شیریں کلام، واضح الفاظ، کلام کمی و بیشیٔ الفاظ سے مُعرا،

گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پروئی ہو، نہ کوتاہ سخن نہ فضول گو۔ مخدوم و مطاع ایسے کہ اُن کے رفیق اُن کے مُنہ سے بات نکلتے ہی تعمیل کے لئے جھپٹ پڑتے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ عبداللہ بن رواحہؓ نے آپ کے جمالِ جہاں آرا کی کیفیت اپنے ایک شعر میں یوں بیان کی:

"یارسول اللہؐ اگر آپ میں کھلی ہوئی نشانیاں نہ بھی ہوتیں تب بھی آپ کا روئے انور خبر رسالت دینے اور آپ کو رسولِ برحق ثابت کرنے کے لئے کافی تھا"۔

روزمرہ زندگی کے اصول یہ تھے کہ مکان رہنے کے لئے ہے، لباس ستر پوشی کے لئے اور غذا زندہ رہنے کے لئے۔ کچھ بشری رغبتیں بھی تھیں لیکن شانِ رسالت نے کسی کو گلے کا ہار نہیں بنایا۔ موسم، تمدّنی مرّوجات اور وضو نماز کی ضروریات کے پیشِ نظر جو میسّر آ گیا، پہن لیا۔ لباس کو اظہارِ امارت کا ذریعہ بنایا نہ اعلانِ رہبانیت کا۔ اسی طرح غذا سے بھی نہ بلاوجہ اجتناب برتا نہ اُسے لذّتِ کام و دہن کا وسیلہ بنایا۔ یہی حال سفر کا تھا۔ موقع کی مناسبت سے جو سواری مل گئی استعمال کر لی۔ چنانچہ خچر، گھوڑے، گدھے، اونٹ سبھی زیر استعمال رہے۔ رہنے کے حجرے بھی ضرورت کے مطابق۔ اُن میں کسی اسراف کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ پتھر گارے سے بنے ہوئے، دس بارہ فٹ لمبے اور آٹھ دس فٹ چوڑے حجرے جن کی چھتیں اتنی نیچی تھیں کہ کھڑے ہوں تو چھت کو ہاتھ لگ جائے۔ ایک مرتبہ عائشہؓ نے پتھروں کے کھردرے پن کو چھپانے کے لئے اپنے حجرے کی دیواروں پر کپڑا تان دیا تو آپ نے فرمایا:

"عائشہ کپڑا اس لئے نہیں ہوتا کہ پتھروں کو پہنایا جائے"۔

عام لباس، سفید کرتا، سفید تہ بند، سر پر سفید عمامہ یا ٹوپی، شانوں پر سفید چادر جسے کبھی لپیٹ لیتے، کبھی داہنی بغل کے نیچے سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈال لیتے۔

ضرورت پڑنے پر تہ کر کے تکیہ بھی بنا لیتے۔ کوئی خاص ملاقاتی آتا تو اُتار کر اُس کے بیٹھنے کے لئے بچھا دیتے جیسا کہ مجھے یاد ہے غزوۂ حنین کے بعد جب اُن کی آیا حلیمہ سعدیہ کی دختر حذافہ عرف شیما بنو سعد کی قیدی کی حیثیت سے اُن کے سامنے لائی گئی تو اُس کی عزت افزائی کے لئے انہوں نے اس کے بیٹھنے کے لئے اپنی چادر بچھا دی تھی۔ سفید کے علاوہ ہلکا سبز اور ہلکا پیازی رنگ بھی پسندیدہ تھا لیکن دھاریوں کی صورت میں۔ یمن کی بنی ہوئی ہلکے رنگوں والی دھاری دار چادریں اور ہلکے زرد اور مٹیالے رنگ کے لباس بھی پہنتے تھے۔ کپڑے نہ ڈھیلے رکھتے تھے نہ تنگ۔ نہ اُن کی لمبائی علامتِ کبر دکھائی دیتی تھی نہ کوتاہی رہبانیت کا پرچار۔ نئے کپڑے عموماً جمعے کے دن پہنتے تھے، فاضل جوڑے بنوا کر نہیں رکھتے تھے۔ کپڑے پھٹ جاتے تو پیوند لگا لیتے تھے، لیکن صفائی اور نظافت کا حد درجہ خیال رکھتے تھے۔ یہی میانہ روی، یہی تقویٰ، یہی سادگی اُن کا مزاج تھی۔ کبھی کبھی تحفوں میں آئے ہوئے بہت قیمتی کپڑے بھی پہنے لیکن پسند نہیں فرمائے۔ ایک مرتبہ ستائیس اونٹنیوں کے بدلے ایک نہایت قیمتی جوڑا خرید کر پہنا۔ اُس میں نماز بھی پڑھی، پھر کسی کو تحفے میں دے دیا۔ یہ اس لئے کہ اچھے کپڑے سے اجتناب کہیں دین میں حجّت ہی نہ بن جائے اور لوگ خواہ مخواہ چیتھڑے نہ لٹکائے پھریں۔ وہ جہاں فضول خرچی سے روکنا چاہتے تھے وہاں یہ بھی خواہش تھی کہ لوگ جوگیوں، راہبوں اور سادھوؤں کی راہ پر نہ چل نکلیں۔ اصل مقصد یہ تھا کہ صاحبِ بصیرت، خوددار اور زیرک لوگوں کا ایک فعال، متحرک اور متوازن معاشرہ قائم ہو جائے۔

کرتا پہنتے تو پہلے دایاں ہاتھ آستین میں ڈالتے، جوتا پہنتے تو پہلے دائیں پاؤں میں۔ داہنی کروٹ سے لیٹتے اور سوتے وقت داہنا رخسار دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر سوتے۔ کسی کو کوئی چیز دیتے تو دائیں ہاتھ سے، لیتے تو دائیں ہاتھ سے۔ دائیں ہاتھ کی فوقیت اور اچھے کاموں کے لئے داہنے ہاتھ کا استعمال اُن کی سکھائی ہوئی اسلامی ثقافت کا ایک اہم عنصر ہے۔

بائیس برس تک ان کی زندگی کے ہر پہلو کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اُن کی حیاتِ مبارکہ ایک ایسی معیاری اور مثالی زندگی تھی جس کی اقدار میں کوئی تضاد، کوئی خلفشار، کوئی پیچیدگی، کوئی الجھاؤ، کوئی ابہام، کوئی تصادم نہیں تھا۔ وہ ایک ایسے شخص کی زندگی تھی جو اپنی خداداد تمیزِ طبعی کی بنا پر مزاجِ فطرت سے کامل مطابقت رکھتا تھا۔ جس کے احساسات، فطری طور پر، تمام خارجی عوامل کی طرف من حیث العلت رجوع کرتے تھے۔ ہر بات پر اُن کا ردِ عمل اس حد تک حسبِ معمول ہوتا تھا کہ غیر معمولی معلوم ہوتا تھا۔ جب کوئی حل طلب مسئلہ اُن کی خدمت میں پیش ہوتا تو اُن کے اطراف بیٹھے ہوئے ہم سب اپنے اپنے طور پر اُس کا حل سوچنے لگتے کہ اگر یہ مسئلہ ہمیں درپیش ہو تو ہم اسے کیسے سلجھائیں گے۔ صحابہ میں بڑے بڑے جید عالم، معاملہ فہم، جہاں دیدہ اور صاحبانِ عقل و دانش تھے اور مجھ جیسے کوتاہ فہم بھی۔ ہم سب اپنی دانست میں مسئلے کا بہترین حل دریافت کرتے مگر جب وہ فیصلہ صادر کرتے تو ہمیں اپنے حل نہایت سطحی، بچگانہ اور نامناسب معلوم ہونے لگتے۔ ہم سب کو یہ لگتا کہ انہی کا فیصلہ مناسب ہے۔ بالکل سادہ سا فیصلہ ہوتا، بالکل سامنے کی بات لیکن وہی سادہ سی بات اُن کے بتانے سے پہلے کسی کو نہ سوجھتی۔ ہماری مجموعی فراست بھی اُن کے سامنے ہیچ ہوتی تھی۔ اپنی ان گنت دینی اور دنیوی مصروفیات اور ذمے داریوں کے باوجود وہ کبھی اُن کے بوجھ تلے دبے نہیں دکھائی دیتے تھے۔ مزاج میں بردباری اور سنجیدگی کے پہلو بہ پہلو شگفتگی کا عنصر ہمیشہ نمایاں رہتا تھا۔

تین ہجری کی بات ہے۔ بنو غطفان کے ارادے کچھ نیک نہیں لگتے تھے۔ آئے دن خبریں ملتی رہتی تھیں کہ وہ ہمارے خلاف مہم جوئی کی تیاری کر رہے ہیں۔ خطرہ بڑھ گیا تو حضورؐ، مدینے میں عثمانؓ کو قائم مقام بنا کر پانچ سو مسلمانوں کے ساتھ اُن کی سرکوبی کے لئے پہنچ گئے۔ بنو غطفان کو بھی کسی نے اطلاع دے دی اور وہ ہماری آمد سے پہلے ہی پہاڑوں کی

طرف بھاگ نکلے۔ حضورؐ نے واپسی کا حکم دیا۔ ربیع الاوّل کی درمیانی تاریخیں تھیں، موسم نہایت خوشگوار۔ حضورؐ نے خود سب سے پیچھے چلنے کا فیصلہ فرمایا۔ جابر بن عبداللہؓ ویسے تو فوج کے ساتھ تھے مگر اُن کا اونٹ اتنا ضعیف اور لاغر تھا کہ وہ پیچھے رہ گئے اور ہماری ٹولی سے آن ملے۔ یہاں بھی وہ پیچھے رہے جاتے تھے۔ حضورؐ نے دو ایک مرتبہ یہ صورت دیکھی تو جابرؓ سے کہا:

"ذرا نیچے اترو اور اونٹ کو بٹھاؤ"

جابرؓ نے تعمیل کی۔ خود بھی حضورؐ قصواء سے نیچے اُترے اور جابرؓ کے ہاتھ سے ہانکنے کی چھڑی لے کر اُن کے اونٹ کو آہستہ آہستہ تین چار چھڑیاں ماریں اور پھر جابرؓ کو سواری کے لئے کہا۔ اب جو جابرؓ کا اونٹ چلا تو اتنا تیز کہ ہاتھ ہی نہیں آرہا تھا۔

اگلے پڑاؤ پر نمازِ مغرب کے بعد جابرؓ، حضورؐ کے ساتھ بیٹھے تھے۔ بنو غطفان کے آئندہ اقدام پر خیال آرائیاں ہو رہی تھیں کہ اچانک حضورؐ نے فرمایا:

"جابر میں تمھارا اونٹ خریدنا چاہتا ہوں"

جابرؓ نے کہا:

"آپ کی نذر ہے"

حضورؐ نے فرمایا:

"نہیں۔ میں اسے قیمتاً خریدنا چاہتا ہوں"

میں حیران تھا کہ یہ جابرؓ کے اونٹ کا کہاں سے ذکر آگیا اور اُس میں خریدنے کی کون سی بات تھی۔ نحیف و نزار، اپنی جان سے بیزار، کوئی کل سیدھی نہیں تھی۔ جابرؓ نے پھر اپنی پیشکش دہرائی تو رسول کریمؐ نے فرمایا:

"نہیں جابر نہیں۔ مجھ سے سودا کرو۔ بتاؤ اس کے لئے ایک درہم ٹھیک رہے گا"

جابرؓ نے کہا یہ کم ہے تو حضورؐ مسکرائے:

"اچھا چلو دو درہم"

جابرؓ نے پھر کہا کم ہے تو حضورؐ مسکرا مسکرا کر رقم بڑھاتے گئے اور بالآخر چالیس درہم پر بات ختم ہو گئی۔

مدینے پہنچ کر اگلے دن میں نمازِ فجر کے بعد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہُوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضورؐ کے دروازے پر جابرؓ کا اونٹ بندھا ہے اور حضورؐ جابرؓ سے فرما رہے ہیں کہ جاؤ دو رکعت نفل پڑھ کر آؤ۔ جابرؓ چلے گئے تو حضورؐ نے مجھے ارشاد فرمایا:

"بلال جلاؤ چالیس درہم کے برابر سونا تول کر جابر کو دے دو اور ہاں پلڑا ذرا نیچا رکھنا" میں سونا تول کر لایا تو اتنے میں جابرؓ بھی آگئے۔ وہ سونا میں نے اُن کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اُنھوں نے سونا سنبھال لیا اور رخصت چاہی۔ دو چار ہی قدم گئے ہوں گے کہ حضورؐ نے اُنھیں واپس بلایا اور فرمایا:

"ارے جابر اپنا اونٹ یہیں بھولے جا رہے ہو"

یوں جابرؓ سونا بھی لے گئے اور اپنا اونٹ بھی۔ حضورؐ اکثر صحابہ سے اس قسم کا التفاف فرماتے رہتے تھے۔

گفتگو میں الفاظ نہایت ٹھہر ٹھہر کے ادا کرتے۔ تاکید کے لئے کلمات تین بار دہراتے تھے۔ زبان نہایت معیاری ہوتی۔ کبھی کوئی عامیانہ محاورہ یا بازاری لفظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ بات کرتے وقت اکثر چہرے پر مسکراہٹ رہتی۔ ایک مرتبہ عبداللہ بن حارثؓ نے کہا تھا کہ میں نے محمدؐ سے زیادہ مسکراتے کسی کو نہیں دیکھا۔ بات کی وضاحت کے لئے ہاتھوں اور انگلیوں کے اشاروں سے بھی مدد لیتے تھے۔ کسی سمت اشارہ کرتے تو پورا ہاتھ حرکت میں لاتے تھے۔ وہ افصح العرب تھے۔ فصاحتِ زبان و بیاں کے ساتھ ساتھ حسن

گفتار، لہجے کی شائستگی، آواز کی مٹھاس اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی پرو دینا اُن کی گفتگو کی امتیازی شان تھی۔ مثال کے طور پر:

أعقلِ واء کل	(پہلے عقل استعمال کرو پھر توکل کرو)
أسلِمه تَسلِمه	(اسلام لاؤ اور سلامتی پاؤ)
انما الاعمال بالنیات	(اعمال نیتوں پر منحصر ہیں)
الحرب خدعة	(جنگ چالوں سے لڑی جاتی ہے)
اَلْآنَ حَمِیُ الْوَطِیْسُ	(اب تندور گرم ہؤا)
المجالس بالا مانة	(مجالس کے لئے امانت داری لازم ہے)
من لایرحمه، لایرحمه	(جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا، اُس پر بھی رحم نہیں کیا جائے گا)
سید القیومِ خادمھمه	(قوم کا سردار وہ ہے جو اس کی خدمت کرے)
کل ذی نعمة محسوداً	(ہر نعمت پانے والے سے حسد کیا جاتا ہے)

بعثت کے چوتھے سال میں جب تبلیغِ دین کا حکم ہؤا تو آپ ایک دفعہ مجھے اور ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر عکاظ کے میلے میں گئے۔ یہ عربوں کا قومی میلہ تھا جو ہر سال مکّے میں لگتا تھا اور اس میں شرکت کرنے کے لئے عرب کے گوشے گوشے سے لوگ آتے تھے۔ ایک جگہ لوگوں کا اجتماع دیکھا تو اللہ کے رسولؐ نے انہیں دعوتِ حق دینے کی کوشش کی۔ یہ دیکھتے ہی مشرکین کے ایک جمِ غفیر نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور اُن کی باتوں کا اس قدر مذاق اڑایا کہ وہ مزید کچھ نہ کہہ سکے۔ ہم دونوں اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہے تھے مگر بے بس تھے۔ قبیلۂ بنو سلیم کا ایک جواں سال بدوی اس سارے طوفانِ بدتمیزی میں حضورؐ کے صبر و تحمل سے اس درجہ متاثر ہؤا کہ ہجوم کے چھٹ جانے کے بعد وہ اُن کے پاس آیا اور اُن کی دعوت کی تفصیل جاننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اس موقع پر حضورؐ اور اس بدوی کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ سُنیے:

بدوی۔ کیسا ایمان افضل ہے۔؟

حضورؐ۔ جس کے ساتھ پسندیدہ اخلاق پایا جائے۔

بدوی۔ اے اللہ کے رسول میں بھی آپ پر ایمان لاتا ہوں۔

حضورؐ۔ آج کل ہم لوگ مظالم کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔ ان کا برداشت کرنا تمہاری طاقت سے باہر ہے۔ فی الحال اپنے وطن واپس چلے جاؤ۔ جب اسلام کا غلبہ ہو جائے تو میں جہاں ہوں وہاں آجانا۔

یہ خوش نصیب بدوی عمرؓو بن عبسہ تھے اور اُس عظیم ماں کے فرزند تھے جن کے بطن سے جلیل القدر صحابی ابوذر غفاریؓ پیدا ہوئے تھے۔ جو خود بھی کم و بیش اسی آن بان سے اسلام لائے تھے۔ اُس خوش بخت خاتون کا نام رملہ بنتِ وقیعہ تھا۔ عمرؓو فتحِ مکّہ سے کچھ عرصہ قبل مدینے آئے اور فتحِ مکّہ پر جانے والی سپاہ میں شریک ہوئے۔

علیؓ نے ایک مرتبہ آپ سے درخواست کی کہ وہ انہیں اپنے ذاتی مسلک کے بارے میں بتائیں تاکہ سب کی رہبری ہو۔ اس کے جواب میں آنحضورؐ نے اپنے فکر و عمل کی اتنی جامع وضاحت فرمائی کہ اُس کا ایک ایک لفظ ہم سب کو ازبر ہو گیا۔ مجھے وہ ارشاد آج بھی یاد ہے:

"عرفان میرا سرمایہ ہے، عقل میرے دین کی اساس ہے، محبّت میری بنیاد ہے، شوق میری سواری ہے، ذکرِ الٰہی میرا سرمایہ ہے، اعتماد میرا خزانہ ہے، حزن میرا رفیق ہے، علم میرا ہتھیار ہے، صبر میرا لباس ہے، اللہ کی رضا میری سعادت ہے، عجز میرا اعزاز ہے، زہد میرا پیشہ ہے، یقین میری طاقت ہے، صدق میری سفارش ہے، طاعت میرا دفاع ہے، جہاد میرا کردار ہے اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔"

کُھلی کتاب

اللہ کے آخری پیغمبرؐ کی حیاتِ طیبہ ایک بین الانسانی مشن کی داستان ہے اور اُن کا لایا ہوا صحیفہ، ابدی اصولوں کی کتاب ہے جسے عمل کی زبان میں مرتب کیا گیا ہے۔ ولادت سے لے کر وفات تک اُن کی کوئی بات، کوئی عمل کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ اُن کو لوگوں نے ہر حال میں دیکھا ہے۔ بچپن میں، جوانی میں، ادھیڑ عمر میں، ضعیفی میں، تنگدستی میں خوش حالی میں، فتح میں، شکست میں، صحت میں، بیماری میں، اختیار میں، بے اختیاری میں، شوہر کی حیثیت سے، باپ کی حیثیت سے، گھر کے چھوٹے فرد کی حیثیت سے، تاجر کی حیثیت سے، قائدِ انقلاب کی حیثیت سے، منصف و عادل کی حیثیت سے، فرماں روائے حکومت کی حیثیت سے۔ جب سے یہ دنیا قائم ہوئی ہے آج تک کسی پیشوا، کسی شاہ، کسی شہنشاہ، کسی پیغمبر، کسی بھی انسان کی زندگی کے بارے میں اتنی تفصیل موجود نہیں ہے۔ اُن کی زندگی کے ایک ایک دن کا ایک ایک لمحہ محفوظ ہے۔

محمدؐ ایک کھلی کتاب کی طرح سب کے سامنے تھے۔ ہر ادنیٰ، ارفع کے دائرۂ فہم میں، سب کی نظروں کے سامنے۔ اُن سے ہر وقت ملا جا سکتا تھا۔ مدینے کی گلیوں کوچوں میں لوگ اُن سے سلام دُعا لیتے، مصافحے کرتے، معانقے کرتے۔ وہ خود سلام میں پہل کرتے، سب کی خیریت دریافت کرتے، لوگوں کے گھروں میں بیمار پُرسی کے لئے جاتے۔ گلیوں میں کھیلتے ہوئے بچوں سے باتیں کرتے، غریب غربا کے دکھ سنتے، سب سے برابر کی سطح پر ملتے۔ نہ کسی سے کوئی خصوصیت برتتے، نہ اپنے لئے کوئی خصوصیت چاہتے۔ کوئی پکارتا تو 'لبیک' یعنی میں حاضر ہوں کہہ کر جواب دیتے۔ خطاب کرنے والے کی جانب سے اُس وقت تک رُخ نہ پھیرتے جب تک کہ وہ خود منہ نہ پھیر لے۔ کسی کو کوئی پیغام بھجواتے تو سلام ضرور کہلواتے۔ کسی کا سلام اُن تک پہنچایا جاتا تو بھیجنے والے اور لانے والے دونوں کو الگ الگ سلام کہتے۔ نماز میں بھی کوئی سلام کہتا تو اشارے سے جواب دے دیتے تھے۔

ایک دفعہ حضورؐ صحابہؓ کی مجلس میں بیٹھے تھے۔ کسی نہایت سنجیدہ موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک نیم پاگل خاتون، جس کے مرض سے سبھی واقف تھے، آئی اور اصرار کیا کہ حضورؐ تخلئے میں اُس کی بات سُنیں۔ حضورؐ نہایت خندہ پیشانی سے اُٹھے اور اس کے ساتھ باہر گلی میں چلے گئے اور کچھ دیر بعد اُس کی بات سُن کر آگئے۔ مجھے ابو رافعؓ نے بتایا کہ اس سے پہلے بھی وہ دو دفعہ اپنی بے معنی باتیں سنانے کے لئے حضورؐ کے پاس آچکی ہے مگر حضورؐ کسی کی دلآزاری نہیں کرتے تھے۔

صبح اذان سے پہلے مَیں انہیں بیدار کرنے کے لئے اُن کے دروازے پر دستک دیتا تھا۔ وہ خود باہر تشریف لاتے، اکثر آنکھیں ملتے ہوئے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کبھی کبھی صبح کے دھندلکے میں وہ پاؤں سے ٹٹول ٹٹول کر اپنی چپل تلاش کرتے تھے۔ بالکل عام آدمی کی طرح۔ اُن کی صبحوں کا یہ دستور نہ تھا کہ تمام اہلِ خانہ اور خدّام اُن کے اٹھنے سے پہلے اپنے

کام کاج میں لگے ہوں اور وہ سب سے آخر میں بادشاہوں کی طرح خواب گاہ سے باہر نکلیں۔

ایک دفعہ ابن مسعودؓ نے مجھے ایک واقعہ سنایا کہ ایک اجنبی اُن کے پاس حاضر ہؤا اور اُس نے جیسے ہی گفتگو شروع کی تو اُس پر کپکپی طاری ہو گئی۔ آپ نے اُسے حوصلہ دیتے ہوئے فرمایا:

"گھبراؤ مت، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو ایک ایسی ماں کا بیٹا ہوں جو خشک گوشت کھایا کرتی تھی"۔

حضورؐ ہجرت کر کے مدینے تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ لوگ نر اور مادہ کھجوروں کے خوشے ملا رہے ہیں۔ آپ نے پوچھا یہ تم کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا ہم اسی طرح کیا کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم ایسا نہ کرو تو شاید تمہارے لئے بہتر ہو۔ چنانچہ لوگوں نے اُس سال مادہ کھجوروں کے پُھولوں میں نر کھجور کے پھولوں کے ڈنٹھل رکھنے چھوڑ دیئے۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ فصل بہت کم ہوئی۔ جب لوگوں نے آپ سے اُس کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا:

"میں تو ایک انسان ہوں۔ جب تمہیں کوئی دین کی بات بتاؤں تو مان لیا کرو۔ جب اپنی رائے سے کچھ کہوں، تو یاد رکھو میں محض ایک انسان ہوں"۔

اُن کی قیادت محبت کی قیادت تھی۔ وہ شفقت اور پیار سے لوگوں کو تعلیم دیتے تھے۔ اُن کا طریقہ یہ تھا کہ وہ سب کی سنتے تھے اور پھر مشورے کے انداز میں اُنھیں نیک وبد سمجھا دیتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں کیا کہ محض حکم دے کر فارغ ہو گئے ہوں۔ اُن کے مزاج میں شرمیلا پن تھا۔ اس لئے گفتگو میں پہل بہت کم کرتے تھے۔ اگر ضروری بھی ہوا تو نہایت مہذّب اور شائستہ انداز میں، ہزار حسن و لطافت اور تکلفات کے ساتھ۔ محفل میں کبھی کوئی بات چھڑ جائے تو اُسے اس انہماک سے سنتے تھے جیسے کوئی نوجوان بڑوں کی باتیں سُن کر کچھ سیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ کسی سے اختلاف کرتے تھے تو کبھی سخت لہجہ اختیار نہیں کرتے

تھے۔اُن کے جوابات مختصر ہوتے تھے لیکن وہ اس لئے کہ اُن کے سوچنے کی رفتار بہت تیز تھی اور شاید اس لئے بھی کہ ان کے ارشادات میں افراط و تفریط کی گنجائش نہ پیدا ہونے پائے۔

اُن پر وحی ضرور آتی تھی لیکن وہ اپنی رائے کو دوسروں کی رائے سے نہ کم تر سمجھتے تھے نہ برتر لیکن ہم جو جانتے تھے وہ جانتے تھے۔ ہمیں ہمیشہ اُن کی فوقیت کا پورا پورا ادراک رہتا تھا۔اُن کی زباں سے جو لفظ نکلتا، اس قدر پاکیزہ، اس قدر معقول ہوتا تھا کہ وہ ہمارے لئے حکم اور قانون کا درجہ رکھتا تھا۔

بعض دفعہ جب وہ محسوس فرماتے کہ اُن کے احترام میں غلو سے کام لیا جا رہا ہے تو رنجیدہ ہو جاتے اور خاصی خاصی دیر تک گہری سوچ میں مستغرق رہتے۔ اُن کو اس کیفیت میں دیکھ کر ہم پر اُن کے جلال کی ہیبت طاری ہو جایا کرتی تھی جسے ہم مختلف سوالوں اور ہلکی پھلکی باتوں میں چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ ایسے موقوں پر وہ بہت پریشان ہو جایا کرتے اور فرمایا کرتے تھے :

"میں محض انسان ہوں، محض انسان ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ اللہ نے میری تقدیر میں کیا لکھا ہے"۔

وہ ہم میں ہر ایک سے بلند مرتبے پر فائز تھے لیکن ان کے گھر میں دنیوی مال و متاع عام لوگوں سے بھی کم تھا۔ انہیں اپنے اُوپر نہ سختی کرنے کا شوق تھا نہ فاقہ کشی کا۔ اگر کسی رات بُھوکے سو رہے تو محض اس لئے کہ انہوں نے اپنا کھانا کسی اور کو دے دیا جو اُن کے خیال میں اُن سے زیادہ بھوکا تھا۔

آج ہم جن باتوں کو اپنے قوانین کہتے ہیں، وہ اُن کا معمول تھیں۔ ہمارا قانون بنا ہی اُن کے حسنِ عمل کے نمونوں سے ہے۔ ہم اُن کی زبان سے نکلے ہوئے تقریباً ہر لفظ کو یاد کر

لیا کرتے تھے۔ بہت کم کلمات ہوں گے جو محفوظ نہ رہے ہوں۔ اکثر آپس کی گفتگو میں ہم اُن کی باتوں کا اعادہ کیا کرتے تھے۔ اسی اہتمام کی بدولت آج خدا کے فضل سے ہزاروں افراد ہیں جو اُن کی احادیث کے عالم ہیں۔

محمدؐ کبھی انسان کے عام فہم دائرے سے باہر بات نہیں کرتے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے آخری نبیؐ تھے اور رہتی دُنیا تک کُل عالمِ انسانیت کی ہدایت اور رہبری پر مامور تھے۔ اُن کی گفتگو میں، اُن کے عمل میں، اُن کے احکامات اور تعلیمات میں ابہام ممکن نہیں تھا کیونکہ اُن کے بعد منشائے الٰہی کی مزید توضیح کے لئے کوئی اور پیغام نہیں آنا تھا۔

ایک روز سرورِ کائناتؐ اپنے حجرے میں آرام فرما رہے تھے۔ میں حجرۂ مبارک کے باہر اپنے کُرتے کے دامن کو پیوند لگا رہا تھا کہ ایک انصاری خاتون زینبؓ آئیں اور مجھ سے کہا حضورؐ سے یہ دریافت کر دو کہ میں اپنا صدقہ اپنے دیور کے یتیم بچوں کو دے سکتی ہوں یا نہیں۔ میں اندر جانے کے لئے اُٹھنے ہی لگا تھا کہ ایک اور خاتون تشریف لے آئیں۔ اتفاق سے اُن کا نام بھی زینبؓ ہی تھا، عبداللہ ابنِ مسعودؓ کی بیوی۔ مزید اتفاق یہ کہ وہ بھی وہی مسئلہ دریافت کرنا چاہتی تھیں۔ وہ بھی اپنا صدقہ اپنے کسی غریب عزیز کو دینا چاہتی تھیں۔ میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہُوا اور خواتین کا مسئلہ پوچھا۔ آپ نے فرمایا وہ کون عورتیں ہیں۔ میں نے عرض کی عبداللہ ابن مسعودؓ کی بیوی زینبؓ اور دوسری زینبؓ الانصاریہ۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا بے شک یہ صدقہ دینا درست ہے۔ اُن خواتین کو بتا دو کہ اُنھیں دُہرا اجر ملے گا۔ ایک صدقے کا اور دوسرا صلۂ رحمی کا۔

روزمرّہ زندگی میں آپ نے اپنے لئے مساوات پسند کی۔ کسی اعزازی سلوک کی نہ تمنا کی، نہ اجازت دی۔ نہ مجالس میں نمایاں مقام پر نشست پسند کی۔ نہ یہ چاہا کہ لوگ اُن کے لئے تعظیماً کھڑے ہوں یا اُن کے لئے آقاؤں اور سرداروں جیسے القابِ احترام استعمال

کریں۔ کوئی غیر اگر ہماری مجلس میں آجاتا تو اُسے پوچھنا پڑتا کہ آپ میں محمدؐ کون ہے۔ ضمام بن ثعلبہؓ جب اُن سے ملنے کے لئے آئے تھے تو اُن کو یہی صورت درپیش تھی۔

کوئی مجھے پوچھے تو میں یہی کہوں گا کہ وحی کے علاوہ مَیں نے اُن میں کوئی ایسی بات نہیں دیکھی جسے حدودِ بشریت سے ماورا قرار دیا جا سکے یا جسے معجزہ کہہ سکیں لیکن اتنی ساری بشری خوبیوں کا جن میں سے ہر ایک خوبی بشری امکانات کی آخری حد تھی، ایک ذات میں یکجا ہو جانا بجائے خود ایک معجزہ تھا۔ اُن کی یہ کاملیت سمجھ میں آنے کے باوجود ایک ایسا کرشمہ تھی کہ انسان دیکھے اور دیکھتا ہی رہے۔ سوچے تو سوچتا ہی جائے مگر اُس کی رفعتوں کو نہ پا سکے۔ وہ معجزہ تو نہیں تھے لیکن ایک بیش بہا نعمت ضرور تھے کہ اُن کو دیکھتے ہی بے ساختہ مُنہ سے نکلتا۔ فَبِاَیِّ اٰلاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن۔

زندگی اور یادیں

زندگی اور اُس کی یادیں۔ ایک ضعیف آدمی کا سب کچھ یہی ہوتا ہے۔ میں اپنی ذات میں تو نہ پہلے کبھی کچھ تھا، نہ آج ہوں۔ میرا کوئی ذاتی اعزاز نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ مجھے صرف میرے دوستوں کے حوالے سے یاد کریں۔ کوئی میرے بارے میں پوچھے کہ بلال کون تھا تو اُسے صرف یہ بتا دیا جائے کہ وہ محمدؐ کا صحابی تھا۔

میں نے ایسے وقتوں میں زندگی گزاری ہے جو اس کائنات کا بہترین دور تھا کیونکہ اس دور میں اللہ کا آخری نبیؐ اس دنیا میں رونق افروز تھا۔ آئندہ کسی کو یہ سنہری دور نصیب نہیں ہوگا لیکن اُس دور کی عظمتوں کی شہادت ہر شخص کے پاس پہنچے گی۔

کوئی مجھے یہ اعزاز بھی نہ دے کہ میں بہت اچھا مؤذن تھا۔ ایک دفعہ تو میری غلطی سے حضورؐ سمیت سب کی نماز قضا ہو گئی۔ تبوک کا سفر تھا۔ ایک مقام پر رات زیادہ ہو گئی تو صحابہ نے عرض کیا کہ یہاں قیام کا حکم ہو جائے تو مناسب ہو۔ آنحضرتؐ نے فرمایا مجھے ڈر

ہے کہیں نیند ہمیں نمازِ فجر سے نہ غافل کر دے۔ مجھے اپنی شب بیداری پر بڑا اعتماد تھا۔ میں نے سب کو صبح وقت پر جگانے کا ذمہ لے لیا۔ پڑاؤ ڈال دیا گیا۔ مجھے راتوں کو جاگنے کی عادت تھی۔ اُس رات مزید احتیاط کے لئے میں کجاوے پر ہی ٹیک لگائے، آسمان پر پھیلے ستاروں کو تکتا رہا جو اُس رات معمول سے زیادہ روشن تھے۔ ستاروں کی گردش مجھے پل پل کی خبر دے رہی تھی کہ اب اذانِ سحر میں کتنا وقت رہ گیا ہے۔ میں اپنے فرض کی ادائیگی سے مطمئن تھا مگر اذان کے وقت سے کچھ دیر پہلے میری آنکھ لگ گئی اور طلوعِ آفتاب تک نہ کھلی۔ جب میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہؤا تو انہوں نے پوچھا:

"بلال! تمہاری ذمے داری کیا ہوئی"۔

میں نے عرض کی:

"یارسول اللہ! زندگی بھر کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔ آج پتا نہیں کیسی غفلت طاری ہو گئی"۔

مسکرا کر فرمایا:

"بے شک اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے، روحوں پر قبضہ کر لیتا ہے۔ اب فوراً اذان دو اور سب کو نماز کے لئے جمع کرو"۔

میری اذان کے تاثر کی بات بھی جانے دیجیے۔ ایک دفعہ سخت سردی کے موسم میں، میں نے فجر کی اذان دی تو ایک شخص بھی نماز کے لئے نہیں پہنچا۔ میں نے دوبارہ اذان دی، پھر بھی کوئی نہیں آیا۔ حضورؐ مسجد میں تشریف لا چکے تھے۔ فرمانے لگے:

"بلال! آج نمازیوں کو کیا ہو گیا ہے"

میں نے کہا:

"یارسول اللہ! شاید سردی کی شدت نے انہیں روک رکھا ہے"۔

اس پر رسالتمآبؐ نے دُعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ سردی کے اثرات کو اُن سے دور فرما دے۔ کچھ دیر کے بعد لوگ آ گئے تو جماعت ہوئی۔ نہ میری آواز کی بلندی کام آئی نہ اُس کی تاثیر۔ کام آئی تو حضورؐ کی دُعا۔

یوں بھی میری اذان کا معیار ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا تھا۔ کبھی تیز ہوائیں میرے الفاظ مجھے واپس لوٹا دیتیں۔ کبھی صبح کی خنکی کی وجہ سے میرے گلے میں خراش ہو جاتی۔ کبھی کبوتر مجھے پریشان کرتے۔ صرف یہ یاد رکھیے گا اور اہالیانِ عرش بھی یہ بات نہ بھولیں کہ رسولِ کریمؐ نے ایک بار فجر کی نماز کے وقت ارشاد فرمایا تھا:

"میں جنت میں سب سے پہلے داخل کیا جاؤں گا اور میرے ناقے کی مہار تھامے بلال مجھ سے آگے آگے پیدل چل رہا ہو گا"۔

یہ کہہ کر انہوں نے میری طرف دیکھا اور فرمایا:

"بلال! میں نے جنت میں تمہارے قدموں کی چاپ اپنے آگے سنی ہے۔ مجھے بتاؤ کہ تمہارا کون سا عمل ہے جس پر تمہیں ثواب کی سب سے زیادہ توقع ہے"۔

میں خاکسار بھلا کیا جواب دیتا۔ مؤدبانہ عرض کیا:

"یارسول اللہ، میرا ایسا عمل تو کوئی نہیں ہے۔ البتہ دن رات میں، میں نے کوئی وضو ایسا نہیں کیا، اور کوئی اذان ایسی نہیں دی جس کے بعد میں نے شکرانے کے دو نفل نہ ادا کئے ہوں"۔

حضورؐ نے تبسّم فرمایا اور مجھے دُعا دی۔

آج میں اپنے گرد نظر دوڑاتا ہوں، پُرانے ساتھیوں میں سے بہت کم لوگ رہ گئے ہیں اور جو باقی ہیں انہیں بھی، مجھ سمیت، یہاں سے رخصت ہونا ہے۔ موت کی آرزو کرنا

اچھی بات نہیں لیکن موت کے لئے تیار رہنا اچھی بات ہے۔

میں نے بڑی اچھی زندگی گزاری ہے۔ زندگی کے ایک دن کا، ایک پل کا بھی افسوس نہیں۔ اُس دن کا بھی نہیں جب میں گرم چٹانوں کے نیچے دم توڑ رہا تھا۔ میں اپنے لاغر بدن پر، اپنے طویل قد پر خوش ہوں، اپنے گھنے خمدار بالوں پر، اپنے جسم کی رنگت پر خوش ہوں، خوش ہوں کہ افریقی نژاد ہوں۔ یہ رنگت، یہ ہیئت میری پہچان ہیں۔ میں خوش ہوں کہ میں اُن دس ہزار مجاہدین میں شامل تھا جنہیں سینکڑوں سال پہلے کتابِ استثنا کی پیش گوئی میں قدّوسی کہہ کر پکارا گیا تھا۔

مختصر یہ کہ میں خوش ہوں کہ مَیں، مَیں ہوں۔ کیا سے کیا ہو گیا تھا اُمیہ کا زر خرید غلام اور ابنِ خلف کہتا تھا کہ مردہ انسانی جسم خود اپنی ہی اصل حالت پر واپس نہیں آسکتا۔

خاتم المرسلین

محمدؐ کو ہم خاتم المرسلین مانتے ہیں اُسی وحدہٗ لاشریک کے حکم پر جس نے نبی نوع انسان کی دنیاوی اور روحانی زندگی میں ایک ضبط اور توازن قائم رکھنے کے لئے وقتاً فوقتاً پیغمبر بھیجے اور ہمیں حکم دیا کہ اُن سب کی نبوت اور اُن کے لائے ہوئے صحیفوں پر ایمان لاؤ۔ اسلام' اللہ کی طرف سے آئی ہوئی تمام ہدایات کا لب لباب اور جوہر ہے اور جب قرآن نے اعلان کر دیا کہ

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِینَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (۵/۳)

تو حاملِ قرآن' محمد مصطفےٰؐ کا خاتم النبین ہونا محض فضیلت نہیں بلکہ ایک امرِ واقعہ ہے۔ جیسے خلیل اللہ' کلیم اللہ اور روح اللہ کے القاب۔ اس کے ساتھ ہی حق تعالیٰ شانہٗ' نے یہ اہتمام بھی کیا کہ جس نبی پر اللہ کے پیغام کا اختتام ہو وہ جزو ایمان ہونے کے علاوہ ایک مکمل نمونۂ عمل بھی ہو۔ وہ نہ فوق البشر ہو کہ جسم رکھتے ہوئے اس کا منکر ہو نہ تحت البشر کہ

جسم کے ہی تقاضوں کی تکمیل کو سب کچھ سمجھ بیٹھے۔ وہ ان دو انتہاؤں کے درمیان خیر البشر ہو جو جسمانی اور اخلاقی تقاضوں کی متوازن تکمیل سے وہ سیرت پیش کرے جس کی پیروی ہر انسان کے لئے ممکن ہو۔ حضورؐ کی سیرتِ مبارکہ نے بشر کے لئے خیر البشر بننے کے بعد بھی بشر رہنے کو ممکن بنادیا۔ نبیؐ آخر الزماں کے ظہور کے اولین مقاصد میں تھا کہ اُن کے کردار و عمل کو تمام دنیاوی اور روحانی تقاضوں کی تکمیل میں مصروف دیکھا جائے اور ان کی مثال کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنایا جائے۔ مثال کے طور پر گوتم بدھ کی ترکِ دنیا کی تعلیم پر چند بھکشو عمل کر سکتے ہیں۔ اگر اُن کے تمام پیروکار یا اُن کی اکثریت یہ وتیرہ اختیار کر لے تو بھیک دینے والا کون ہوگا۔ گوتم بدھ کی طرح ازدواجی زندگی کو تج دینے والے محض تجرد اور زہد کی رفعت کو تسلیم تو کر سکتے ہیں اُس کی پیروی نہیں کر سکتے اور اگر کریں گے تو نسلِ انسانی کا تسلسل کیسے برقرار رہے گا۔

ہر نبی اپنے اپنے دور کے حالات اور معاملات کے دائرۂ کار میں حیاتِ انسانی کے لئے ہادی و رہبر بن کر سامنے آیا لیکن جس نبی پر پیغامِ الٰہی کی تکمیل ہونا تھی اُسے زمان و مکان سے مختص نہیں فرمایا گیا اور یوں آپ کی سیرت کو ابد الآباد تک کے لئے انسانیت کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کا رہبر و رہنما اور مکمل نمونۂ عمل بنادیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ انسان کو شخصیت پرستی سے چھٹکارا دلادیا جو آئے دن چولے بدل بدل کر سامنے آتی رہتی ہے۔

انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ اپنے تخلیقی ذہن کے مطابق، اپنی خود اختیاری کے بل بوتے پر ہر اصول اور قانون میں تغیّر و تبدل کر کے اپنے لئے قابلِ قبول بناتا رہتا ہے۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ کیسے کیسے جلیل القدر پیغمبر کی تعلیمات کو انسان نے اپنی قطع و برید کے ذریعے کیسا کیسا مسخ کیا۔ اللہ کے ازلی پیغام کے مکمل تحفظ کے لئے محمدؐ کی پیغمبرانہ ذمے داریوں کے ساتھ یہ بات شامل کر دی گئی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انسانیت کے لئے نمونۂ عمل بن کر ہر شخص کے پیشِ نظر رہیں تاکہ اُن کے بعد آنے والے انسان کسی ضرورت کے تحت یا کسی مصلحت کیشی کا شکار ہو کر اپنی قوتِ تخلیق اور خود اختیاری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے دین میں کوئی ایسا عنصر نہ شامل کر بیٹھیں جس کی سند قرآن اور انسانِ کامل، محمد مصطفیٰؐ کی سیرت اور اُسوۂ حسنہ میں نہ مل سکے اور اگر خدانخواستہ ایسی صورت پیدا ہو جائے تو قرآن اور سنّت کی کسوٹی کا دائمی معیار موجود ہے جس سے وہ اپنے لئے رہنمائی حاصل کر سکیں گے۔

نبیؐ کی یہی رہنمائی نور السموات والارض ہے جو شیشے کے حباب میں ہے اور شیشہ روشنی کی گزرگاہ ہے، کسی اور ٹھوس شے کی طرح رکاوٹ نہیں بلکہ اس کی ترسیل میں ممدو معاون ہے۔ دور سے دیکھئے تو روشن حباب ہی نظر آئے گا، اُس کے اندر کا چراغ نظر نہیں آئے گا۔ جتنا شمع دان کے قریب ہوتے جائیں گے چراغ اور حباب کا فرق واضح ہوتا جائے گا۔

اکثر غیر مسلموں کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور گوتم بدھ کی تعلیمات سادہ اور قابلِ فہم ہیں لیکن آنحضرتؐ کی شخصیت انہیں پیچیدہ اور کچھ حد تک ناہموار محسوس ہوتی ہے۔ آنحضرت کی تعلیمات میں انہیں کئی ایسے پہلو نظر آتے ہیں جو اُن کے نزدیک خالصتاً مادی اور دنیاوی ہیں اور جنہیں وہ اپنی دانست میں رسالت کے دائرہ کار سے باہر گردانتے ہیں۔ ایسی باتوں کا جواب دینا نہ میرا مقصد ہے نہ منصب لیکن میرے خیال میں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہم اس کائنات سے الگ نہیں ہیں جو ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور جسے خالقِ ارض و سما نے صداقتِ ازلی کے مظہر کی حیثیت سے تخلیق کیا ہے۔ یہ دنیا اپنے تمام عوامل اور لوازم کے ساتھ ہمارے اپنے اندر بھی موجود ہے۔ ایک اور بنیادی نکتے کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ پیغمبر وہ بھی ہوتے ہیں جو صرف روحانیت کی

بات کرتے ہیں اور وہ بھی جو انسانوں کو روحانی اور الہامی تعلیمات کی جلا بخشنے کے علاوہ اُسے اس کرۂ ارض پر منشائے الٰہی کے مطابق زندگی گزارنے کا درس دیتے ہیں۔ یہ نکتہ ذہن سے اوجھل ہو جائے تو حضورؐ کی شخصیت واقعی پیچیدہ اور ناقابلِ فہم محسوس ہوگی۔ یہ واقعہ ہے کہ حضورؐ کی روحانی حقیقت، ایک حد تک بشری اور مادّی پردوں میں لپٹی ہوئی ہے مگر یہ اس لئے ہے کہ اُنہیں اس دنیا کے لئے ایک عالمگیر اور مستقل قانون ساز کا کردار ادا کرنا تھا۔ اپنی اِس ذمےداری کے پیشِ نظر وہ دنیا سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے تھے۔ اس حیثیت میں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ قریب ہیں بلکہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہ السلام بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ ان تمام اکابر کو خالصتاً روحانی پیمانے سے ناپ کر کوئی نتیجہ اخذ کرلینا شاید مناسب نہیں ہے۔

یہ درست ہے کہ حضورؐ میدانِ جنگ میں برسرِ پیکار دیکھے گئے مگر یہ بھی صحیح ہے کہ دنیاوی تگ و تاز کے دائرے سے باہر وہ عظیم ترین روحانی بلندیوں پر بھی بیٹھے نظر آئے۔ انہوں نے شادیاں بھی کیں مگر اُن کی شادیاں محض دنیاوی مقاصد کے لئے یا منفی معنوں میں مادّی نہیں تھیں۔ اُن کی ازدواجی زندگی، اُن کی طرف سے، عام سماجی حدود میں داخل ہونے کی ایک شعوری کوشش تھی۔ یہ اُن کے اُن افعال کا حصّہ تھی جن کے ذریعے اُن کی تعلیمات کی روحانی اقدار کو مجموعی انسانی زندگی کے ساتھ منضبط ہونا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ اُن کی روحانی یا عمودی صفات کو اُن کی دنیاوی یا افقی صفات کے ساتھ ہم آہنگ اور متوازن کرنے کی بات تھی۔ اُن کے مزاج اور معمولات کے پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو ازدواجی زندگی کے جھمیلوں میں پڑنا اُن کے لئے کوئی بہت خوش آئند بات نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ اس لئے کہ انہیں سادگی عزیز تھی، بوریا نشینی اچھی لگتی تھی، رات دیر گئے تک عبادت کرنا پسند تھا۔ روزوں کی سختیاں مرغوب تھیں اور ازدواجی زندگی اُن کے اِن محبوب مشاغل میں کوئی آسانی

نہیں فراہم کرسکتی تھی مگر اپنی پیغمبرانہ ذمےداریوں کے پیشِ نظر اُن کے لئے ایسے سماجی اور سیاسی اقدام ناگزیر تھے۔

کچھ لوگ اُن پر یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ اُن کے مزاج میں رحم کی کمی تھی، حالانکہ وہ تو تھے ہی رحمت اللعالمین۔ ایسی سوچ نہ صرف محمدؐ کی ذات کے ساتھ انتہائی ناانصافی ہے بلکہ بنو اسرائیل کے کئی پیغمبروں، یہاں تک کہ بائبل تک کی اہانت کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ اپنے دنیاوی مشن کی تکمیل کے آخری مراحل میں فتحِ مکہ کے موقع پر اپنے دس ہزار صحابیوں کی متفقہ رائے کے باوجود انہوں نے عام معافی اور درگزر کا اعلان کرکے جس جذبۂ ترحّم کا ثبوت دیا وہ لوحِ تاریخ پر عفو اور رحم دلی کی بہترین مثال کے طور پر ہمیشہ ثبت رہے گا۔

محمدؐ کی صفات کے ضمن میں ایک اور نکتہ توجہ طلب ہے کہ نبوت سے پہلے اُن کی زندگی ایک عام آدمی کی زندگی تھی۔ اُن میں بہت سی خوبیاں تھیں لیکن کوئی ایک خوبی بھی اُن کی رسالت کا جواز نہیں فراہم کرتی تھی۔ انہیں خود منصبِ رسالت کا گمان تک نہیں تھا۔ اُن کی یہی سیدھی سادی، غیر ڈرامائی، اہم واقعات سے خالی زندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ اُنہیں نبوت اُن کی اپنی کسی بشری صفت کی بنا پر نہیں ملی تھی بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے اپنے انتخاب کی بنیاد پر سونپی گئی تھی۔ وہ اُن لوگوں میں سے نہیں تھے جو اپنی صلاحیتوں پر نازاں رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اُن کی استعداد کے شایانِ شان اُن سے کوئی عظیم کام لے۔ ایسے لوگ یہ بنیادی بات بھول جاتے ہیں کہ اللہ جل شانہٗ کی ذات بے نیاز ہے۔ اُسے انسان کی کسی خوبی اور صفت کی احتیاج نہیں ہے۔ وہ مختارِ کل ہے، جس سے جو کام لینا چاہتا ہے اُس میں ویسی ہی صفات پیدا کر دیتا ہے۔ پیغمبرِ آخر الزماں کو اللہ تعالیٰ نے جس عظیم کام پر مامور کیا تھا، اُس کی تکمیل کے لئے انہیں اتنی ہی عظیم صفات سے

نوازا۔ نہ اس سے بڑا کام کسی کے سپرد ہوُا نہ اتنے اوصافِ جلیلہ کسی اور کے حصّے میں آئے۔

نبیادی طور پر سرورِ دو عالمؐ کی ذات توازن اور عجز کا امتزاج تھی۔ بشری دائرہ عمل میں انتہائی توازن اور اللہ تعالیٰ کے سامنے ذات کی مکمل نفی کی حد تک عجز۔ مزید غور کریں تو اُن کی شخصیت میں تین عناصر واضح طوّر پر سامنے آتے ہیں۔ جدوجہد، عالی ظرفی اور تقویٰ۔ یہ تینوں الفاظ میں خاص معنی میں استعمال کر رہا ہوں کیونکہ ایسی ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت کے کسی پہلو کو لفظوں کے بندھے ٹکے معانی میں نہیں سمویا جا سکتا اور خاص طور پر ایسی صورت میں کہ آپ جس خوبی کا بھی ذکر کریں وہ اُن کے یہاں مل جاتی ہے بلکہ وہ خوبی ہی نہیں جو اُن میں نہیں۔

اپنے عام فہم معنوں میں تو یہ تینوں خوبیاں کچھ حد تک بہت سے اچھے انسانوں میں بھی پائی جاتی ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک خوبی میں اللہ تعالیٰ نے ایک خاص انداز سے چند مزید صفات شامل کر کے انہیں جو توازن عطا کیا ہے وہ اور کہیں نظر نہیں آتا۔ اپنی اِن اضافی صفات کی بنا پر یہ تینوں الفاظ خاص معنوں کے حامل ہیں۔ ان تمام اضافی خوبیوں کا مقصد ہی یہ تھا کہ نبیادی صفات میں حد درجہ توازن اور اعتدال رہے، وہی توازن جو عین منشائے الٰہی ہے اور جس پر اس کی ساری کائنات کا نظام قائم ہے۔ ہم تو محمدؐ کی ذاتی زندگی میں عدم اعتدال کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے لیکن اُن کی شخصیت کے اعتدال کو بشری نہیں، الہامی میزان پر پورا اتارنا مقصود تھا کیونکہ انہیں سارے عالمِ انسانیت کے لئے ایک قابلِ تقلید مثال اور ایک دائمی معیار بنانا تھا۔

پہلی صفت جدّوجہد۔ ان الفاظ سے میری مراد وہ فعال قوت تھی جو کرۂ ارض پر بسنے والے انسانوں کے تمام روحانی اور مادّی مسائل حل کرنے کی استعداد رکھتی تھی۔ یہ عام جسمانی، دماغی یا عسکری قوت نہیں، ایمان کی قوت تھی۔ اس قوت نے ایمان کی کوکھ سے

جنم لیا تھا جو روحانی اور مادّی، دونوں سطحوں پر الہامی سچائیوں کی تصدیق کا نام ہے مگر اُس قوت کو متوازن رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس میں عصمت اور پاکدامنی کا عنصر بھی شامل کر دیا تھا۔ دراصل قوت اور پاک دامنی دونوں کا تعلق تقدس سے ہے۔ قوت اور جدوجہد عملی طور پر تقدس کا دفاع کرتی ہیں اور عصمت و پاک دامنی تقدس کو قائم اور برقرار رکھنے کا ایک خاموش اور انفعالی انداز ہے۔ جدّوجہد میں جہاد فی سبیل اللہ کے داخلی اور خارجی مظاہر ملتے ہیں اور عصمت اور پاک دامنی میں سادگی، حلم اور عظمتِ کردار کی ساکن و خاموش خوبیاں ہیں۔ گویا قوتِ محّرکہ، اللہ تعالیٰ کے مقاصدِ ارفع کے حصول کے لئے ایک شمشیرِ برہنہ ضرور تھی مگر ایسی جس کی تندی و تیزی کو پاک دامنی کی آب دے کر اُس میں اعتدال پیدا کر دیا گیا تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ مجرّد طاقت فی نفسہٖ، تکبرّ اور غرور کو جنم دیتی ہے جو اَن گنت فتنوں کی جڑ ہے۔ حلم، سادگی اور معصومیت، کبر و نخوت کا تریاق ہیں۔

اُن کی عالی ظرفی سے میری مراد سخاوت، فیاضی اور کشادہ دلی کے علاوہ بالغ نظری سے بھی ہے جو انہیں مسئلے کو ایک آفاقی اور کُل کائناتی تناظر میں دیکھنے کی صلاحیت بخشتی تھی۔ محمدؐ کی ذات میں عالی ظرفی کے ساتھ شرافت کا عنصر ایک اضافی صفت کی طرح جڑا ہوا تھا۔ شرافت، عالی ظرفی ہی کی ایک تجریدی صورت ہے۔ تصوراتی سطح پر عالی ظرفی ہی کا نام شرافت ہے۔ شرافت کی ذیلی خوبیوں میں نظافت و طہارت کے ساتھ ساتھ حسنِ جمالیات اور کائنات گیر سطح پر حُسن و حَسَن کی پہچان اور قدر دانی شامل ہیں۔ فیاضی اور سخاوت کے معنوں میں عالی ظرفی، طاقت کی نبرد جوئی کی ضد ہے جو اس کے اثرات کو ہمدردی اور عفو سے اعتدال مہیّا کرتی ہے۔

تقویٰ سے یہاں میری مراد یہ ہے کہ بندہ دل و جان سے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ سے، ماوراء اور اُس ازلی صداقت سے منسلک کرے جو ذاتِ مطلق کا لازمی جزو ہے اور

صداقت کا لازمی جزو ہے غیر جانب داری اور انصاف۔ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ سے منسلک کرنے کے معنی ہیں ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنا۔ اور اسے تعلق سے میرا مطلب ہے ارضی زندگی کی تمام تر تقاضوں کے باوجود، عذاب وثوابِ آخرت سے ایک پل کے لئے بھی غافل نہ رہنا اور اپنی بنیادی حیثیت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا کہ انسان خالق ومالکِ کائنات کی خلق ہے اور اُس کا عبد ہے۔

تو اب صورت یوں ہوئی کہ قوت اپنے لئے، عالی ظرفی دوسروں کے لئے اور تقویٰ اللہ تعالیٰ کے لئے۔ قوت کا پہلو ارضی زندگی میں روحانی مقاصد کی تکمیل کرنے کی ایک عملی اور مثبت صورت ہے۔ سخاوت اور عالی ظرفی میں روح کی محبت پنہاں ہے جو لافانی ہے اور ہر شخص میں موجود ہے۔ حضورؐ کی ان دونوں ارضی یا افقی صفات کے دھارے اپنی تمام تر ذیلی صفات کے ساتھ مل کر مثالی توازن اور اعتدال کے ساتھ اُن کی تیسری صفت یعنی تقویٰ میں شامل ہو جاتے ہیں تو تمام مادی اور روحانی پہلو اس درجہ متوازن ہو جاتے ہیں کہ اس توازن کی بنیاد پر بندہ بالآخر حقیقتِ مطلق کی تجلیات میں محو ہو جاتا ہے۔ تقویٰ اسی لئے تمام صفات کا نکتۂ کمال ہے کیونکہ یہی وہ حتمی توازن مہیا کرتا ہے جو منزلِ آخر تک پہنچاتا ہے۔ وہی منزل جو ابتدا بھی ہے، انتہا بھی اور منتہا بھی!

یہ بہت بڑی بڑی باتیں ہیں، مجھ ناچیز کے منصب سے بہت بلند، صفاتِ رسالتمآبؐ کا احاطہ یا اُن پر تبصرہ کرنے کی مجھے توفیق نہیں۔ اُن کا ایک سرسری جائزہ بھی میری بساط سے باہر ہے۔ ویسا سوچا جائے تو میری بساط ہے ہی کیا ایک سیاہ فام حبشی غلام جسے رحمتِ عالمؐ نے اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دے کر اپنے صحابہ میں شامل فرما لیا۔ حضورؐ کے معمولات پر غور کرنا، آپ کے ہر قول و فعل سے اپنے لئے سبق حاصل کرنے کی سعی، صحابۂ کرام کا معمول تھا۔ آپ کی سیرت کے ہر پہلو پر سیر حاصل گفتگو ہوتی۔ ابوبکرؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، علیؓ، ابوذر غفاریؓ،

معاذ بن جبلؓ، عبداللہ بن سلام، سعد بن معاذؓ، سلمان فارسیؓ جیسے صاحبانِ علم کے نعمت کدوں سے جو کچھ اس فقیر کی جھولی میں گرا اور جتنا اس کوزۂ سفالیں میں سما سکا میں نے حسبِ توفیق، جہاں تک میرے عجزِ بیان نے ساتھ دیا، عرض کر دیا۔ مجھ فروتن کے لئے یہ احساس ہی کچھ کم پریشان کن نہیں کہ ذکر ہو رہا ہے افصح العرب کا اور بات کرنے والا ایک غیر عرب، عجمی بھی نہیں، ایک بے نوا، تہی دامن، افریقی نژاد حبشی جس کا سین شین بھی درست نہیں جس کی عمر کا نصف سے زیادہ ابتدائی حصہ صرف یہ چار پانچ الفاظ کہتے گزرا:

"جی آقا"

"جی حضور"

"لبیک یا آقا"

"جو حکم حضور"

جس پر ایسے بھی دور گزرے ہیں کہ ہفتہ ہفتہ بھر اس نے اپنی آواز نہیں سنی اور پھر جب اُس کے لئے سورج طلوع ہوا تو روشنی اس قدر خیرہ کن تھی کہ ایک مدّت تک عالمِ حیرت میں رہا۔ شمائلِ نبیؐ کے بیان میں مجھ سے یقیناً بہت سی فروگزاشتیں ہوئی ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے۔

سیرتِ محمدؐ کی تعریف و توصیف کا سلسلہ ابدالآباد تک جاری رہے گا اور اس سراجِ منیر کے فیوض و احسانات پر تبصرے ہوتے رہیں گے۔ انسان رہتی دنیا تک، جس دور میں بھی اس منبعِ نور سے رجوع کرے گا اُسے محسنِ عالمؐ کی سیرت پاک کے ایک ایک گوشے سے روشنی کے سیل اُمڈتے نظر آئیں گے اور پھر یہ توفیقِ کوزہ پر ہے کہ وہ اس فیضِ جاریہ سے کتنا فیضیاب ہوتا ہے۔

جنّت کی محفل

اب میں چھڑی کے سہارے چلتا ہوں۔ ہر روز گزشتہ روز سے کم اور جلدی گھر لوٹ آتا ہوں۔ میری نقل و حرکت روز بہ روز محدود ہوتی جا رہی ہے۔ کچھ دنوں سے تو صرف مسجد تک جانا آنا رہ گیا ہے۔ لیکن میرا ذہن آفاق کی سی وسعت رکھنے والی سیر گاہ ہے۔ کیونکہ اس میں دورِ رسالت کی حسین یادوں کے باغ کھِلے ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کرم کرے تو شاید جنّت کے خوش نصیبوں میں مجھے پھر ابو ذرؓ کے ساتھ سیر کرنے کا اور اُن کی باتیں سننے کا موقع مل جائے۔ وہی باتیں کہ اسلام کی سادگی اور فقر اُس نبیادی عقیدے کا اعتراف اور اعلان ہے کہ مالکِ ملک صرف اللہ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ خود قرآنِ کریم میں فرماتا ہے کہ ذاتِ الٰہی کے سامنے انسان غریب ہے۔ امارت صرف اللہ کی ہے۔ غریب وہ ہے جو یہ جانتا ہے کہ اس کا جو کچھ ہے وہ اس کا اپنا نہیں ہے اور وہ ہر شے کے لئے کسی کا محتاج ہے۔ امیر وہ ہے جو خود کفیل ہے، جسے کسی کی حاجت نہیں۔ راضی برضائے الٰہی کے

تصوّر کی حد تک اسلام فقر اور غربت کا نام ہے لیکن یہ فقر بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں رکھتا۔ اس کا مطلب ترک اور رہبانیت نہیں ہے۔ یہ وہ فقر ہے جس کے دروازے اس روحانی استغنا پر کھلتے ہیں جو ہماری الہامی تعلیم کا درس ہے اور یہی مثبت سوچ جو فقرِ اسلامی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے، اُس کے وجود کا جواز ہے۔

اس وقت جب میں یہ باتیں کر رہا ہوں تو دورِ رسالت کی ان گنت محفلوں کے نقوش میرے ذہن میں گردش کر رہے ہیں۔ یہ یادیں، یہ نقوش میرے تصوّر کی محفلیں سجائے رہتے ہیں۔ رب العالمین مجھے پھر موقع عطا کرے کہ میں اپنے تصوّرات کی تعبیر دیکھوں۔ مکتبِ رسالت کے فارغ التحصیل، رسول اللہؐ کے ساتھ حلقہ جمائے بیٹھے ہیں۔ علم و معرفت کی قندیلیں روشن ہیں۔ بات سے بات نکل رہی ہے۔ خوش گفتاری اور عالی خیالی کی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہیں۔

ایک آواز اُبھرتی ہے۔ عجمی لہجہ مگر فکرِ اسلامی میں ڈوبی ہوئی:

"مادّی دُنیا کی کوئی چیز قابلِ اعتنا نہیں۔ میرے خیال میں اس سے کنارہ کشی ہی بہتر ہے۔"

چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد ایک نہایت جانی پہچانی آواز سنائی دیتی ہے جسے میں نے اپنی اسلامی زندگی میں شاید ہر روز سنا۔

"مادّی دُنیا میں واقعی کوئی چیز قابلِ التفات نہیں اور اگر کچھ ہے بھی تو محض روحانی حوالوں سے جو مادّیت سے ماورا ہیں۔"

جواباً ایک ایسی دلکش آواز شریکِ گفتگو ہوتی ہے جیسے کوئی نغمہ چھڑ جائے۔ لہجے میں اتنا رس جیسے شہد گھلا ہو:

"مادّیت بھی ایک حقیقت ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مادّی تخلیقات کا وجود ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ بے مقصد نہیں ہو سکتیں۔"

اب ایک نیا لہجہ سننے میں آتا ہے۔ مکّے کے نواحی صحرا میں بسنے والے قبائلیوں کا لہجہ۔ آواز میں جوش و جذبے کے ساتھ عزم و اعتماد کی کھنک:

"حقیقت تو صرف ایک ہے اور وہ ہے ذاتِ الٰہی۔ اُس کے سوا اور کوئی حقیقت ہے ہی نہیں۔"

ایک نہایت شائستہ آواز، مدنی لہجہ، ٹھہرے ٹھہرے الفاظ جن سے علمیت جھلکتی ہے:

"مادّی تخلیقات بھی حقیقت ضرور ہیں مگر ایک محدود معنی میں۔ اُنھیں ثانوی حقیقت کہا جا سکتا ہے، اصل حقیقت نہیں۔"

ایک اور صاحبِ علم اپنی نکتہ رسی سے بات آگے بڑھاتے ہیں:

"مادّی حقیقت دراصل، اصل حقیقت کا مظہر ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ مادّی حقیقت جسے ابھی ابھی ثانوی حقیقت کہا گیا ہے، اصل حقیقت ہی کی نشاندہی کرتی ہے۔ اصلِ حقیقت ایک ہے جو نظروں سے اوجھل رہتی ہے مگر اُس کے مظاہر کے ہزاروں رُوپ ہیں۔ ویسے ہی جیسے اصل روشنی پاکیزہ اور ہر رنگ سے بے نیاز ہوتی ہے مگر جب منعطف ہو جاتی ہے تو قوسِ قزح کے بے شمار رنگوں میں ڈھل جاتی ہے۔"

اب اس گفتگو میں ایک نئی آواز شامل ہوتی ہے۔ الفاظ شاعرانہ مگر انداز خالصتاً منطقی، لہجے میں بہت نرمی مگر بیان پر پوری قدرت:

"قدرت کا عملِ تخلیق ایک کائنات گیر قالین کی طرح ہے جس پر بنے ہوئے مختلف نقش و نگار ایک الہامی آہنگ کے ساتھ بنتے بگڑتے رہتے ہیں مگر ہر شکست و ریخت کے بعد اُن کا باہمی توازن اور کائنات کا مجموعی حُسن برقرار رہتا ہے۔ اسی توازن، اسی میزان کے ذریعے وہ ہر لحظہ کسی آفاقی ضابطے، کسی الہامی قاعدے کی شہادت مہیا کرتے رہتے ہیں۔"

ایک اور نئی آواز جیسے علم و معرفت کا باب کھل گیا ہو:

'درست، لیکن انسان اپنی محدود سوچ اور محدود تر نکتۂ نظر کی وجہ سے مادّی تخلیقات کی ہیئت سے بھی پوری طرح آشنا نہیں ہو سکتا، اُن کی ماہیت کا مکمل ادراک تو شاید اُس کی بساط سے ہی باہر ہے'۔

گفتگو میں ایک نیا نکتہ پیدا ہوتے ہی وہی خوبصورت آواز پھر سنائی دیتی ہے جس نے کہا تھا کہ مادّی تخلیقات کا وجود ہی اُن کے بامقصد ہونے کا ثبوت ہے۔ انداز بیان بھی اتنا دل میں گھر کرنے والا کہ جی چاہے یہی آواز کانوں میں گونجتی رہے:

'نکتۂ نظر سے چیزوں کی ہیئت ضرور بدل جاتی ہے مگر اُن کی ماہیت نہیں بدلتی۔ اگر ہم ایک مستطیل کھڑکی سے باہر آسمان کو دیکھ رہے ہوں تو آسمان ہمیں مستطیل نظر آئے گا۔ زاویۂ نگاہ بدل جائے تو آسمان کبھی مربع نظر آئے گا، کبھی بیضوی، کبھی گول، لیکن رہے گا وہی آسمان جس کا سورج دن کو ہمارے گھروں میں اُجالا کرتا ہے، جس کے ستارے راتوں کو ہمیں راہ دکھاتے ہیں'۔

اب وہی محترم آواز دوبارہ گفتگو میں شریک ہوتی ہے جس نے موضوع کے تعیّن کے بعد سب سے پہلے اپنی رائے دی تھی:

'مسئلہ دراصل یہ ہے کہ دین ایک دائرہ ہے جس کی حدود مقرّر ہیں۔ لیکن اسی محدود دائرے میں لامحدود کا تصوّر بھی شامل ہے۔ محدود میں لامحدود، انہونی بات ہے، مگر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ہر ہیئت، ہر صورت کو صرف جزوی طور پر دیکھ سکتے ہیں، مکمل صورت میں نہیں'۔

'مکمل صورت میں نہ دیکھ سکنے کے باوجود اتنا تو کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ اصلِ حقیقت صرف ایک ہے اور اُس میں کسی غیرہ کی گنجائش نہیں اس لئے یہ ثانوی حقیقت اگر کائنات میں موجود ہے اور یقیناً موجود ہے تو یہ لازماً اصلِ حقیقت کا حصہ ہو گی یا اُس کا کرشمہ ہو

گی۔ کیونکہ جیسا کہ آپ نے سُنا اصلِ حقیقت کے سوا تو کچھ ہے ہی نہیں۔ اب یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ چونکہ اصلِ حقیقت ناقابلِ تقسیم ہے، اس لئے مادّی یا ثانوی حقیقت، اصلِ حقیقت کا مظہر ہونے کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی'۔

مدنی علم و فضیلت اسی خیال کو ذرا اور آگے لے جاتی ہے:

'یہ مادّی تخلیقات جنھیں ہم ثانوی حقیقت کہہ رہے ہیں، خالق ارض و سماوات ہی کی ذات کا کرشمہ ہیں۔ یہ وہی ثانوی حقیقت ہے جو اللہ جل شانہٗ کا مظہر ہے اور جو ذاتِ الٰہی کے نام "الظاہر" کی تفسیر ہے۔ یہ ثانوی حقیقت اپنے اندر کوئی الوہیت نہیں رکھتی، لیکن یہ مظہر الوہیت ضرور ہے'۔

علم و بصیرت کا ایک اور سوتا پھوٹتا ہے:

'بے شک اللہ تعالیٰ جس طرح 'الاوّل والآخر' ہے اسی طرح 'الباطن والظاہر' بھی ہے اور اس کی تخلیقات اس کے "الظاہر" ہونے کی دلیل ہیں'۔

پھر وہی آواز سنائی دیتی ہے جیسے علم کا بحرِ زخار مخاطب ہو:

'رسولِ کریمؐ نے بھی ایک دفعہ فرمایا تھا۔ میں نے آج تک کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی جس دیکھنے سے پہلے میں نے اس میں اللہ کو نہ دیکھا ہو'۔

وہی آواز پھر ابھرتی ہے جس میں شعر کی چاشنی کے ساتھ فلسفیانہ گیرائی بھی شامل تھی مگر اس بار لہجہ بہت دھیما جیسے کوئی اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو:

'ایک آفاقی آبِ حیات ہے جو ہر تخلیق کے رگ و ریشے میں دوڑ رہا ہے۔ ایک جوہر ہے'۔

پھر وہی شہد گھلی آواز، لہجے میں وہی شائستگی اور شیرینی کہ جو سُنے اُسی کا ہو جائے:

"ایک ضروری نکتہ قابلِ التفات یہ ہے کہ اصلِ حقیقت اور ثانوی حقیقت کے

درمیان جو ربط ہے، وہ یکطرفہ ہے۔ اصل حقیقت کو ثانوی حقیقت پر کُلی اختیار ہے۔ ہر چند کہ یہ ربط بہت واضح نہیں ہے مگر یقینی طور پر موجود ہے اور براہِ رست موجود ہے۔ اس کے برعکس خلق اور خالق کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے کیونکہ خلق بے اختیار ہے۔ خالق ہی سارے اختیارات کا مالک ہے‘۔

بات ختم ہوتے ہی وہی محترم آواز پھر سنائی دیتی ہے:

’یہ بہت اچھا نکتہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اصلِ حقیقت اور ثانوی حقیقت، حقیقت کے دو درجات ہیں جن کے درمیان رسولؐ کی ذات ایک حدِ فاصل اور ایک نکتہ اتصال کی حیثیت رکھتی ہے۔ اللہ کا رسولؐ ثانوی حقیقت کی معراج ہے۔ اُس کی مکمل ترین صورت۔ رسولؐ ہی ثانوی حقیقت کے تعلق کی وضاحت کرتا ہے اور ان دونوں کو مالک و خالقِ کائنات کی منشاء کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ مرتبط اور منضبط کرتا ہے جس سے ایک میزان قائم رہتا ہے‘۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ حبشی کس طرح ماضی، حال اور مستقبل کو آپس میں گڈمڈ کئے جا رہا ہے۔ یہ شاید اس لئے کہ میرا دین قیدِ زمان سے ماوراء ایک تسلسلِ مکانی یا تسلسلِ وجود کا نام ہے۔ اسلام میں وقت تو محض ایک غارت گر ہے جو اس تسلسلِ مکانی کی صورت بگاڑتا رہتا ہے۔ میں نے ایک دفعہ رسول پاکؐ کو یہ کہتے سنا تھا کہ کوئی وقت ایسا نہیں آئے گا جو سابقہ دور سے بدتر نہ ہو۔ یہ تسلسلِ وجود ایک علامت کی طرح مسلمان کی زندگی کا احاطہ کئے رہتا ہے، جیسے ہمارے اطراف پھیلی ہوئی مادّی علامتیں، جو غیر محسوس انداز میں لیکن یقینی طور پر روزِ اوّل ہی سے ہمیں ایک خلاقِ اعظم اور ایک حقیقتِ مطلق کی راہ سُجھا رہی ہیں۔ معلوم سے غیر معلوم کی طرف اشارے کر رہی ہیں۔

وہی مکّے کے نواحی قبائل کا لہجہ پھر سننے میں آتا ہے۔ آواز میں کُھلی فضاؤں کی گھن

گرج، دلیل میں وزن، بیان میں خود اعتمادی:

’دُنیا ہیئت و اشکال پر مشتمل ہے۔ جدھر دیکھو مادّی ہیئتیں بکھری ہوئی ہیں۔ انہی کا مجموعہ ہے ہماری دنیا۔ مگر درحقیقت یہ ساری کی ساری ساکت و متحرک اشکال، اپنی ظاہری صورت میں محض کھنڈر ہیں کسی آفاقی نغمے کا، جو کبھی سارے ارض و سما میں جاری تھا مگر کسی وقت منجمد ہو کر ان مادّی ہیئتوں میں قید ہو گیا۔ علم اور روحانیت کی نظر ان جامد شکلوں کو پگھلا دیتی ہے تو ہر مادّی ہیئت کے اندر سوئی ہوئی ازلی موسیقی پھر سنائی دینے لگتی ہے‘۔

رسالت مآبؐ، معلّمِ عقلِ انسانی ہونے کے باوجود بالکل طالب علمانہ انداز میں، نہایت انہماک سے سب کی باتیں سُن رہے ہیں اور لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ کبھی براہِ راست اُن کا ذکر آ جاتا تو ہونٹوں پر ہلکا سا تبسّم کھیل جاتا۔ میں کہ خود کھنڈر ہوں ایسی بے شمار یادوں کا، ایک بار پھر اُن محفلوں کے انتظار میں ہوں، فردوسِ بریں کے کسی گوشے میں، نئے مشاہدات کے پس منظر میں، نئے موضوعات کے ساتھ۔

لیکن ابھی شاید چند روز اور مجھے دمشق کے سورج کا طلوع و غروب دیکھنا ہے۔

اب اس خادمِ رسولؐ، بلالِ حبشی کو اجازت دیجئے۔ اس مجلس کو یہیں ختم کرتے ہیں اور اپنے نبیؐ پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی نَبِیِّنَا وَ رَسُوْلِنَا وَمَوْلٰینَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَذُرِّیَاتِہٖ اَجْمَعِیْنَ o اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ o اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی جَمِیْعِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ

وَعَلٰی عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْن وَاَنْ تَغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِاُسْتَاذِیَّ وَ
لِجَمِیْعِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ o اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ
اَسْئَلُكَ اِیْمَانًا کَامِلاً وَّیَقِیْنًا صَادِقًا وَّرِزْقًا وَّاسِعًا وَّقَلْبًا خَاشِعًا وَّ لِسَانًا
ذَاکِرً وَّرِزْقًا حَلَالاً طَیِّبًا وَّتَوْبَةً قَبْلَ الْمَوْتِ وَرَاحَةً عِنْدَالْمَوْتِ
وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً بَعْدَالْمَوْتِ وَالْعَفْوَ عِنْدَالْحِسَابِ وَالْفَوْزَ بِالْجَنَّةِ
وَالنَّجَاةَ مِنَ النَّارِ o رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصَّالِحِیْنَ
وَالْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ o بِرَحْمَتِكَ یَااَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ o

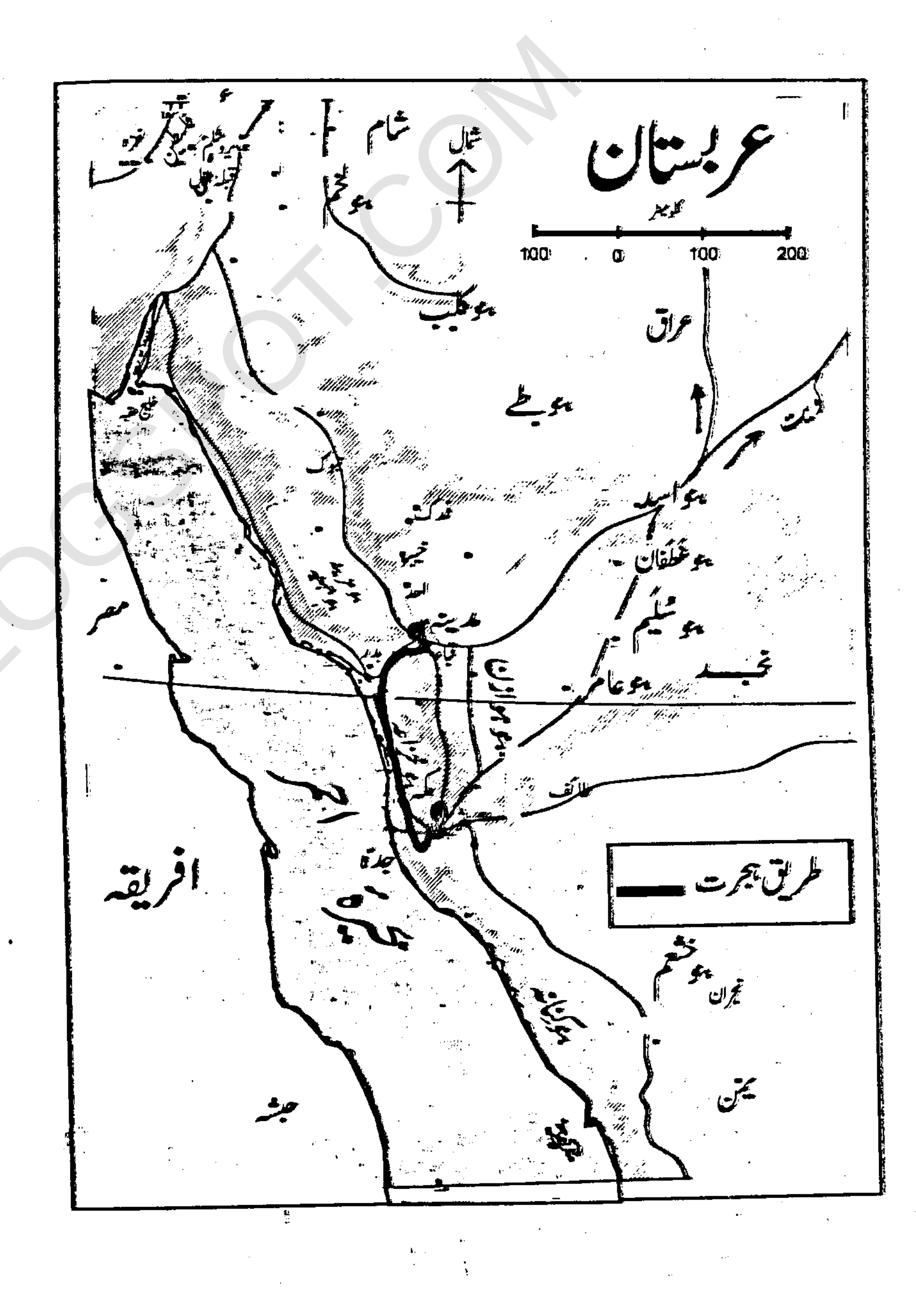
قریشِ مکہ

(فہر براہِ راست حضرت اسماعیلؑ کی اولادِ نرینہ کی لڑی سے ہیں۔ ان کی اولاد جو مکے سے باہر آباد ہوئی درج ذیل شجرہ میں شامل نہیں ہے)

- فہر (قریش)
  - الحارث (ابو عبیدہ کا قبیلہ)
  - غالب
    - لوئی
      - عامر (سہیل کا قبیلہ)
      - کعب
        - حصیص
          - عمرو
        - عدی (حضرت عمر کا قبیلہ)
        - مُرّہ
          - یقظہ
            - مخزوم (ابو سلمہ اور خالد بن ولید کا قبیلہ)
          - تیم (حضرت ابو بکر اور طلحہ کا قبیلہ)
          - کلاب
            - زہرہ (حضورؐ کی والدہ آمنہ، سعد بن ابی وقاص اور عبد الرحمٰن بن عوف کا قبیلہ)
            - قصیٰ
              - عبد العزیٰ
                - اسد (حضرت خدیجہؓ، ورقہ اور زبیر بن العوام کا قبیلہ)
              - عبد
              - عبدِ مناف
                - نوفل (مطعم کا قبیلہ)
                - المطلب
                - ہاشم
                  - عبد المطلب
                    - چھ بیٹیاں
                    - چھ دیگر بیٹے
                    - حمزہ
                    - العباس
                    - عبد اللہ
                      - محمد صلی اللہ علیہ وسلم
                    - ابو لہب
                    - ابو طالب
                      - علی
                      - جعفر
                    - الزبیر
                    - الحارث
                - عبدِ شمس (حضرت عثمان اور سفیان بن حرب کا قبیلہ)
              - عبد الدار (مصعب بن عمیر کا قبیلہ)

اشاریہ

الف



عربستان
شمال
کلومیٹر
100 0 100 200
شام
عراق
بنو کلب
بنو طے
بنو اسد
بنو غطفان
بنو سُلیم
نجد
بنو عامر
مدینہ
خیبر
فدک
بدر
طائف
جدہ
مصر
افریقہ
طریق ہجرت
بنو خثعم
نجران
یمن
حبشہ

ب

ث

ج

ح

خ

د

ر

ز

س

ش

ص

ض

